آگ
رضیہ بٹ
www.pklibrary.com

پچھتاووں کا جہنم میرے چاروں طرف پھیلا ہے۔ آگ ہی آگ ہے۔ میں اس آگ میں جل رہا ہوں ----- جھلس رہا ہوں ----- جدھر منہ اٹھاتا ہوں ----- آگ کے لپکے آتے ہیں۔ شعلے اپنی آتشیں زبانیں سانپ کی پتلی اور لمبی زبان کی طرح اندر باہر نکالتے میری طرف آتے ہیں ----- میرا وجود ان شعلوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ میں اپنے آپ میں چھپ جانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرے اندر بھی آگ ہی آگ ہے ----- یادوں کی آگ۔

پچھتاووں کی آگ۔

میرے باہر ہی نہیں اندر بھی پھیلی ہے۔ بہہ رہی ہے۔ سرک رہی ہے۔

ہر لمحہ۔

اس کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے۔

اس کی تندی و تیزی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اس آگ سے بچنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ میں سمجھ نہیں پاتا۔ کہ اس سیال آگ سے کیونکر نجات پاؤں۔

کس طرح چھٹکارا حاصل کروں۔

میرے لیے راہ فرار نہیں ہے۔

نجات کی راہ نہیں ملتی۔

میرے تلوے جل رہے ہیں۔ یادوں کے انگارے ان میں چبھتے ہیں ----- یہ انگارے مجھے چاٹ رہے ہیں ----- آگ میرے روئیں روئیں میں سرایت کر چکی ہے۔

آگ میرے اندر ہے۔

آگ میرے باہر ہے۔

آگ میرے چاروں طرف ہے۔

کوئی روزن کوئی سوراخ کوئی دروازہ کوئی کھڑکی ایسی نظر نہیں آتی جس سے چھلانگ لگا کر کود جاؤں۔ اس جہنم زار سے نکل جاؤں۔ ہر روزن ہر سوراخ ہر دروازہ کھڑکی بند ہے ----- میں اپنے

جلتے وجود سے نجات پانے کے لیے ان بند روزنوں سوراخوں دروازوں اور کھڑکیوں سے مسلسل ٹکریں مار رہا ہوں۔

لیکن

کچھ نہیں بنتا۔

اس لیے

کہ

میرے چاروں طرف آگ ہے۔ میرے اندر آگ ہے باہر آگ ہے ----- میں آگ میں سانس لے رہا ہوں۔ آگ میں آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں۔

میں حیران ہوں۔

کہ

آگ مجھے راکھ کا ڈھیر کیوں نہیں بنا دیتی۔ آگ میں تو لوہا بھی پگھل کر سیال آگ بن جاتا ہے۔ آگ ہی کا حصہ ہو جاتا ہے۔ میرا جسم میرا وجود میری شخصیت میرا ذہن میرا دل و دماغ اب بھی صحیح و سالم ہے ----- میں جو جل رہا ہوں۔ اب بھی قائم ہوں۔

میری سوچیں مجھ سے الگ نہیں ہوتیں۔

میرے تاثرات مجھ سے نہیں بچھڑتے۔

شاید

شاید

یہی سوچیں اور تاثرات ہی جہنم زار ہیں۔ اور انہی کی لپٹوں سے میرا وجود۔

وجود۔

جو گوشت پوست کا نہیں لگتا۔ پتھر کا لگتا ہے۔ تپ جاتا ہے آگ پتھر کو لپیٹ میں لے تو پتھر تپ جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی سرخ انگارہ ہو کر آگ کا حصہ ہی لگتا ہے۔

لیکن جل کر راکھ کا ڈھیر نہیں ہوتا۔ میری زندگی میں میرا وجود بھی اسی میں پتھر کی طرح لٹک رہا ہے۔ آگ جل رہی ہے اور مسلسل جل رہی ہے۔ میں اپنے وجودی پتھر سے اس کو سرد کرنا چاہوں تب بھی نہیں کر سکتا۔ کہ یہ عمل مسلسل ہے۔ اور میں فرار کی راہیں مسدود پاتا ہوں۔

کئی سال بیت چکے ہیں۔

یہ الاؤ اک مخصوص انداز میں جل رہا ہے ----- میں جلن کی اذیت سہہ رہا ہوں۔ کبھی گھبرا کر تڑپنے لگتا ہوں۔ کبھی صبر و ضبط کے سانچوں میں ڈھل جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایسے میں میں اپنے خشک ویران اور بے رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ کا ملمع چڑھانے کی بھی کوشش کرتا ہوں

اور زندگی کے جلو میں زندہ لوگوں کی طرح چلنا چاہتا ہوں۔

لیکن

میری اس کوشش کو

جہد مسلسل کو

کوئی نہ کوئی واقعہ سانحہ حادثہ یا معمولی سی تحریک بھی غارت کر دیتی ہے اور میں نئے سرے سے آگ میں جلنے اور اس سے بچنے کی سر توڑ کوشش کر دیتا ہوں' اذیت کا نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ کرب کی محرابیں تن جاتی ہیں اور میں بے بس ہو جاتا ہوں۔

آج بھی میرے سامنے میرے دوست شکیل کا یو کے سے آیا خط رکھا ہے۔ یہ خط چار سال پرانا ہے۔ جانے کس فائل میں پڑا تھا۔ کہ نکل کر میز پر آگیا ہے۔ ان دنوں شکیل کے خط آتے رہتے تھے۔ میں بھی جواب لکھ دیا کرتا تھا ----- لیکن اب نہ وہ لکھتا ہے نہ میں ----- میرے پاس مہلت ہے نہ فرصت کہ میں ایک بہت بڑے کاروبار کا بوجھ گھسیٹ رہا ہوں۔ اپنی آگ میں جلتے ہوئے یہ گراں بوجھ بھی اٹھانا پڑ رہا ہے۔ لاشعوری طور پر یہ مداوے کی اک صورت ہے شاید میں اس کمائی میں سے اتنا ہی لیتا ہوں۔ جتنا رحمان ڈوگر نے مقرر کیا تھا۔ کاروبار کی بیشتر کمائی ہوسپٹل پر خرچ کر رہا ہوں ----- جو میرے دل نے تعمیر کرنے پر اکسایا تھا۔ دکھی انسانیت کی خدمت کر کے میں اپنے دکھوں کو بھول جانا چاہتا ہوں' میں اسی لیے دن رات محنت کیے جا رہا ہوں۔

خط دیکھ کر میں پھر اس جہنم زار میں پہنچ گیا ہوں۔ جس سے فرار کی شعوری اور لاشعوری کوشش ہر لمحے کرتا رہتا ہوں۔ شکیل نے خط کے آخر میں لکھا ہے۔

"شاہ راج اس ڈرامے کا کیا بنا ----- ڈراپ سین ہو گیا یا جاری ہے۔ کچھ بھی ہو راج خوش قسمت ہو۔ اپنے وطن میں بیٹھے۔ اس ٹھاٹھ کی نوکری کر رہے ہو۔"

خط میرے سامنے میز کی چکنی سطح پر پھڑپھڑا رہا ہے میں اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے ٹیک کی شاندار اور صاف شفاف آفس ٹیبل ہے' میں نرم و گداز ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوں۔

آفس کی دیوار پر خوبصورت اور قیمتی کلاک ہے جس کی ٹک ٹک وقت گزرنے کا احساس دلاتی ہے۔

وقت

جو میرے لیے کبھی کبھی تھم جاتا ہے۔

اور

اس تھمے ہوئے

منجمد وقت میں۔

میں نقطہ آغاز کو پکڑنے کی کوشش پاگلوں کی طرح ---- سرپھروں کی طرح کرنے لگتا ہوں۔

لمحہ آغاز

جو میری دسترس سے دور ہے۔ میری پہنچ سے دور ہے۔ جسے صرف محسوس کر سکتا ہوں لیکن پکڑ نہیں پاتا۔ اس لیے کہ یہ ماضی کے پھیلاؤ میں گم ہو چکا ہے ---- اس کی کوئی جگہ متعین نہیں' اسی لیے اسے پالینے کی خواہش اک احمقانہ اور مجنونانہ حرکت کے سوا کچھ نہیں۔

اس دفتر کی دائیں دیوار پر کیلنڈر ہے جس میں ماہ و سال قید ہیں میں اس کیلنڈر کی طرف دیکھتا ہوں تو ذہنی اذیت ہوتی ہے کاغذی پیراہن میں جکڑے ہندسے کسی گزری ہوئی تاریخ کا احساس تو دلاتے ہیں۔ لیکن اس تک پہنچنے نہیں دیتے۔

میرے آفس میں ٹیک ہی کا مضبوط اور پالش شدہ خوبصورت فرنیچر ہے۔ دو تین فون ہیں۔ فائلوں کے انبار ہیں۔ آہنی سیف اور اماری ہے۔ اور زمین کا سینہ موٹے قالین سے ڈھانپا ہوا ہے۔

میں اپنے دفتر میں کام میں جتا رہتا ہوں۔ اپنی ذات کا کرب فائلوں میں گم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ---- روپیہ بہتے ہوئے پانی کی طرح آرہا ہے۔ سریے کی رولنگ مل اب اتنی بڑی ہو گئی ہے اتنی پھیل گئی ہے اور اتنی وسعت اختیار کر چکی ہے کہ مجھے لگتا ہے اب میں اکیلے یہ بار نہ اٹھا سکوں گا ---- پائپ کی دوسری فیکٹری جیسے لوہے کو سونے میں منتقل کر رہی ہے۔

مجھے دن رات کام کرتے دیکھ کر میرے دوست کہتے ہیں۔ "خدا نے چھپڑ پھاڑ کر دولت دی ہے۔ وہ کیا کم ہے۔ کہ اپنے آپ کو اتنا تھکا رہے ہو۔ نڈھال کر رہے ہو' اتنے خوبصورت اور جوان مرد کو صرف دولت کمانا ہی نہیں دولت لٹانا بھی چاہیے۔"

میں کوئی جواب نہیں دیتا۔

میرے منیجر بھی یہی کہتے ہیں۔ "سر آپ اتنا تردد نہ کیا کریں۔ آپ کی صرف سپرویژن کافی ہے ---- کام کے بار نے آپ کی صحت کو بہت متاثر کیا ہے۔ چند سالوں میں آپ کی کنپٹیوں پر بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہے۔ یہ عمر کے تقاضے تو نہیں۔ انتھک محنت کی نشاندہی ہے۔"

میں کبھی مسکرا کر اور کبھی الجھ کر انہیں تکتا ہوں۔ وہ نہیں جانتے کہ میرے بالوں میں سفیدی کیوں اتر رہی ہے۔ میرے چہرے سے جوانی کی دلکشی کیوں غائب ہو رہی ہے اور میری آنکھیں جن کی خوبصورتی گہرائی اور گیرائی پر کبھی مجھے ناز تھا ---- کیوں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔

یہ بات تو میری بیوی بھی نہیں سمجھ پاتی ----

میری بیوی ----

زیبی۔

جو میری زندگی کا پہلا پیار ہے۔ جو میری محبوبہ ہے۔ جسے میں نے اس وقت چاہا تھا جب چاہنے کا مفہوم بھی نہ جانتا تھا۔

وہ کبھی کبھی مجھے دیکھتی ہے تو بے حد فکر مند ہو کر کہتی ہے "کام کام ہر وقت کام بخدا کچھ تو اپنی صحت کا خیال رکھا کریں۔ راج تم تو قبل از وقت بوڑھے ہو رہے ہیں۔ مجھے نہیں چاہیے اتنی دولت تمہاری صحت چاہیے اور ابھی تو ہمارے بچے بھی اتنے چھوٹے ہیں۔ چار اور دو سال کے بچوں کے باپ کو اتنی جلدی بوڑھا ہونا چاہیے؟

میں اک آہ سرد کھینچ کر رہ جاتا ہوں۔ اس لیے ---- اس لیے کہ میں زندگی کے جلو میں زندہ لوگوں کی طرح چلنا بھی چاہتا ہوں۔

کبھی کبھی مسکراہٹ کا ملمع اتر جاتا ہے۔ میری بیوی کی نگاہیں میرے اندر اتر جاتی ہیں تو وہ بے حد پریشان ہو جاتی ہے۔

لیکن

لیکن

وہ کچھ نہیں سمجھ پاتی میں اپنی ذات کا کوئی سرا اس کے ہاتھ بھی تو نہیں آنے دیتا۔

ذات

جو آگ کی لپیٹ میں ہے جس کے اندر آگ بہہ رہی ہے۔ باہر بہہ رہی ہے۔ لیکن جو مجھے جلا کر راکھ کا ڈھیر بھی نہیں بناتی۔

میں دوہرے کرب کی اذیت سہتا ہوں۔ دکھ پیتا ہوں ---- اور مرجانے کی تڑپ میں جئے جاتا ہوں ----

○ ☆ ○

"سر۔"

"ہوں۔"

"سر گاڑی نکال لی ہے"

"اوہ ----- اچھا"

باوردی ڈرائیور نے مجھے احساس دلایا۔ کہ وقت کافی گذر چکا ہے۔ مجھے گھر چلنا چاہئے۔ میں نے کرسی کی پشت پر ڈالی ہوئی گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ میری آنکھوں میں سوچ کی اتنی گہری اور واضح دھند تھی کہ ڈرائیور کے چہرے پر ہمدردی کے سایے پڑ گئے۔

"سر آپ بہت زیادہ کام کرتے ہیں آپ کی صحت۔" وہ تعظیم سے بولا۔

"کچھ نہیں ہو گا میرے دوست۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے فائلیں سمیٹ کر ایک طرف کر دیں گھڑی پر نگاہ ڈالی مجھے بھی احساس ہوا کہ دفتر کا وقت ختم ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے

"سب لوگ جا چکے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یس سر" ڈرائیور نے کہا۔

میں نے ایک گہری سانس لی فائلوں کے نیچے سے شکیل کا خط جھانک رہا تھا۔ میں نے خط جھپٹ کر اٹھا لیا ----- میں نارمل رہنا چاہتا تھا آگ کی محرابوں تلے سے گزرتے کئی سال ہو گئے تھے لیکن آج پھر مجھ پر ڈپریشن طاری تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس سے پیچھا نہ چھڑا رہا تھا۔

"چلو میں آ رہا ہوں۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔

اور

میں جو اپنے ہی وجود کے اندر نہیں سمٹ رہا تھا۔ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر میں نے شکیل کا خط اٹھایا ----- اس کم بخت نے کیوں ایسی بات لکھ دی تھی ----- کہ میں جو سکون نا آشنا پہلے ہی تھا اور بھی درہم برہم ہو گیا تھا ----- کئی لمحے میں کھڑا سوچتا رہا ----- ضمیر کی خلش بڑی بڑھ گئی تھی' اپنا آپ سنبھالا نہیں جا رہا تھا ----- اسی حالت میں گھر جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا زیبی گھبرا جائے گی ----- بار بار پوچھے گی۔

اور اسی بار بار پوچھنے سے تو میں گھبراتا تھا۔

میں اپنی نظروں میں ننگا تھا۔ لیکن کسی اور کی نظروں میں ننگا ہونے کی ہمت بھی تو نہ تھی۔ جو کچھ میں کر چکا تھا۔ یا جو کچھ مجھ سے سرزد ہو چکا تھا۔ وہ میری ذات تک ہی محدود تھا ----- اور ذات کی پیٹھ پر تازیانے میں ہی کھاتا رہتا تھا خط جیب میں رکھ کر میں آفس سے باہر آ گیا۔ سردیوں کی شام ٹھٹھری ہوئی تھی۔ دھندلکے پھیل رہے تھے۔ کہیں کہیں بتیاں روشن ہو گئی تھیں ----- آفس کی عمارت کے باہر بھی روشنیاں جل اٹھی تھیں ----- ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے روشنیوں میں بھی وہ روشنی نہ تھی۔ جو اندھیرے میں ہوتی ہے۔ روشنی اندھیرے ہی کے دم سے تو ہوتی ہے۔

میں گاڑی کی طرف بڑھا۔ چوکیدار میرا بریف کیس اٹھائے آیا۔ اس نے سیٹ پر بریف کیس رکھ دیا۔

ڈرائیور نے پچھلی نشست کے لیے دروازہ کھولا ----- میں گاڑی میں بیٹھ گیا ----- چوکیدار نے باقاعدہ سلوٹ کے انداز میں مجھے سلام کیا اور میں نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

وہ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اور میں اندر ہی اندر گھر سے دور نکل گیا تھا۔ مجھے آج یہ آرام دہ گاڑی پھر تکلیف دے رہی تھی۔ میں اپنے ہی زخموں سے چور تھا۔ جی چاہتا تھا گاڑی سے نکل کر بھاگ جاؤں اتنی دور۔

اتنی دور

کہ مجھے اپنا بھی سراغ نہ مل سکے۔

لیکن

ہم کس قدر بے بس ہوتے ہیں۔ اپنے وجودی خول کے قیدی اپنے ہی اسیر بھاگنا چاہیں تو بھی بھاگ نہیں پاتے۔

گاڑی کوٹھی کے آہنی گیٹ کے اندر داخل ہو کر پورچ میں رک گئی اس کوٹھی میں میں پانچ سالوں سے رہ رہا ہوں۔ زیبی سے شادی سے پہلے ہی اس کوٹھی میں رہ رہا تھا ----- یہ کوٹھی رحمان ڈوگر صاحب نے خاص طور پر میرے لیے خریدی تھی۔ تین بیڈ روم کی جدید طرز کی یہ کوٹھی بالکل نئی تھی۔ اس میں سارا سامان بھی نیا ڈلوایا گیا تھا۔ اف۔ ان دنوں ان کی نوازشات مجھ پر بارش کی طرح برستی تھیں۔

اور

میں

میں

جس کی آنکھوں میں بھوک تھی۔ پیٹ میں بھوک تھی' دماغ میں دل میں ذہن میں ہر بلکہ بھوک ہی بھوک تھی۔ اس نوازش پر پھولا نہیں سمایا تھا۔ یہ میری کامرانی کے راستے تھے۔

اور

میں

ان پر سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔

پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنتے ہی میرا بڑا بچہ گگو دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آگیا کہ صبح اس نے مجھ سے چاکلیٹ لانے کی بڑی زور دار فرمائش کی تھی بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ ان کی یادداشت بھی بڑی تیز ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا وہ پہلا سوال ہی چاکلیٹ کے متعلق کرے گا۔

"بابا۔" وہ دوڑا ہوا آیا اور میری گاڑی سے نکلتے نکلتے میری ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

"بابا۔ چاکلیٹ" وہ بولا -----

میں نے جھک کر اسے پیار کر لیا ----- "گگو کتنا پیارا بچہ ہے۔" میں نے اسے بہلانے کے لیے کہا۔ واقعی بہت پیارا ہے۔ اس نے حسن ماں اور باپ کے ورثے میں پایا ہے۔ ذہانت بھی اسے مجھ سے ملی ہے۔ وہ کبھی الٹی سیدھی باتوں سے بہل نہیں پاتا -----

وہ چاکلیٹ کے لیے ضد کرنے لگا -----

"بیٹے آج بھول گیا۔ کل لا دیں گے۔"

"نہیں بابا ----- آج ----- ابھی آج۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے -----"

"نہیں بابا' چاکلیٹ -----"

میں جھنجلا گیا ----- "ہٹو ----- اندر جانے دو -----"

اس نے مٹھیاں آنکھوں میں گھسیڑ کر رونے کا موڈ بنایا۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا ----- "چلو گگو میاں ہم لا دیتے ہیں۔ چاکلیٹ -----"

"ہاں عبدالرحیم ----- مارکیٹ میں لے جاؤ انہیں اور پسند کی چاکلیٹ دلا دو۔" میں دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

میری دو سالہ بچی لابی میں قالین پر بیٹھی اپنے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میری طرف دوڑی۔

میں نے اسے بھی پیار کر لیا ----- وہ توتلی زبان میں باتیں کرتی بہت پیاری لگتی تھی۔ لیکن

آج ----- آج میرا جی اس مترنم آواز کو سننے سے گریزاں تھا ----- میں نے اسے گود سے اتار دیا ----- اور اس کی آیا کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولا "بیگم کہاں ہیں؟"

"وہ اپنی سہیلی کے ہاں گئی ہیں -----"

"کس کے ہاں -----"

"مسز جمشیدی کے ہاں -----"

"ہوں۔"

"آج ان کے ہاں کھانا ہے' آپ بھی جائیں گے۔ بیگم صاحبہ فون کریں گی آپ کو۔"

"میں نے سکون کا سانس لیا۔ زیبی گھر پہ نہیں تھی ----- کھانے پر نہ جانے کا بہانہ بھی بنایا جا سکتا تھا۔

میں اپنا بریف کیس جو ملازم لڑکا گاڑی سے نکال کر لے آیا تھا۔ اٹھا کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

لباس تبدیل کر کے میں بیڈ پر لیٹ گیا ----- میں یکسوئی اور اطمینان سے اپنے آپ سے الجھنا چاہتا تھا ----- کئی سوال کئی وسوسے کئی خدشے میرے اندر رینگ رہے تھے ----- ان سے نپٹنا چاہتا تھا ----- شکر ہے کہ زیبی گھر پہ نہیں تھی ----- وہ میرے لیے ڈنر سوٹ نکال گئی تھی۔ اس کی کسی دوست کے ہاں کھانا تھا ----- زیبی ماڈرن ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو نئے ماحول کے نئے سانچوں میں ڈھال لیا تھا۔ وہ بہت خوش رہتی تھی ----- اس کی آنکھوں میں گھلنے والے خوابوں کی تعبیر اسے مل گئی تھی ----- بلکہ اس سے بھی سوا ملا تھا۔ جس مقام پر وہ پہنچ گئی تھی۔ شاید اس کا اس نے چھ مرلے کے پرانی وضع کے گھر میں رہتے ہوئے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا۔

اس کی خوشیوں کو میں بھی تو چھیڑنا نہیں چاہتا ----- اسی لیے تو اپنی آگ میں آپ ہی جل رہا ہوں ----- اپنے آپ کو اپنے تک ہی سمیٹ رکھا ہے ----- میں دوہری شخصیت کا آدمی بن گیا ہوں ----- اپنے آپ کو ایسے خول میں بند کر لیا ہے ----- جس کی ظاہری چمک دمک پر کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ کہ اس کے اندر آگ ہی آگ ہے جلن ہی جلن۔ گھٹن ہی گھٹن۔

کبھی کبھار

جب یہ خول اندر ہی حدت سے کچھ زیادہ ہی تپ جاتا ہے۔ تو زیبی بے چین ہو جاتی ہے ----- وہ مجھ سے پوچھتی ہے جاننا چاہتی ہے۔

میں

اسے کام کی زیادتی کاروبار کا بار اور دفتری مصروفیات کا بہلاوہ دے دیتا ہوں۔

وہ یقین کر لیتی ہے۔

یقین نہ کرنے کی گنجائش بھی تو نہیں ہوتی۔
کیونکہ

وہ میری محبت ہے' پیار ہے' چاہت ہے' ہم تو بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے چلے آرہے تھے۔ ایک دوسرے سے اس وقت سے پیار کرتے تھے' جب ہمیں پیار کے مفہوم سے بھی آشنائی نہ تھی۔ محبت کی تعریف میں کچھ کہنے کے اہل نہ تھے۔

اور یہ

اس کا پیار ہی تھا---- جس نے مجھے زیبی سے شادی پر مجبور کر دیا تھا---- میں نے اس کی محبت کی خاطر شادی کر لی تھی۔

ورنہ

میں تو----

جذبات کے جس سینچے پر چڑھ چکا تھا---- یہ قدم اٹھانے سے گریزاں ہی تھا۔

○ ☆ ○

زیبی نے اپنی کچھ سہیلیوں کو چائے پر بلایا تھا۔ وہ صبح ہی سے تیاریوں میں مصروف تھی ایسے چھوٹے موٹے فنکشن اب وہ اکثر کیا کرتی تھی اب اس کا دائرہ احباب وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے حلقے کی سوشل عورت تھی۔ ویسے بھی اس نے اپنا مقام منوا لیا تھا۔ تین بیڈ روم کی جدید طرز کی کوٹھی اور خوبصورت قسم کے فرنیچر سے آراستہ رہتی تھی۔ دو سالہ چنکی کے لیے آیا تھی۔ کچن کے کام کے لیے خانساماں تھا۔ چھوٹے موٹے کام جمو کرتا تھا۔ مہترانی سارے گھر کی صفائی کے لیے موجود تھی۔ لان کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لیے مالی موجود تھا۔ باوردی شوفر گاڑی کے لیے ہمہ وقت دستہ بستہ کھڑا رہتا تھا۔ اس کا چار سالہ بیٹا گگو مہنگی نرسری میں کھیلنے اور پڑھنے کے لیے جاتا تھا۔ وہ سارے لوازمات اسے میسر تھے۔ جو ایک بیگم صاحبہ بننے کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ہی پروگراموں میں لگی رہتی۔ مجھے اس نے کاروباری مصروفیات کی وجہ سے خاصا مارجن دے رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ ضرور مجھے ایسی دعوتوں میں گھسیٹ لے جاتی جہاں کپل آتے تھے۔ ظاہر ہے میرے بغیر وہ ایسی پارٹیوں میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن

یہ نئی زندگی اس کے نئے روپ اپنانے کے باوجود وہ مغرور تھی۔ نہ دوسروں کو بھولی تھی۔ وہ اب بھی مجھے اور بچوں کو لے کر اپنے اس پرانے محلے کے مکانوں میں ضرور جاتی جہاں خون کے رشتے موجود تھے میری ماں میرے دو بھائیوں کے ساتھ ابھی تک اسی مکان میں رہ رہی تھی۔ جو ان کا اپنا تھا۔

میں نے اور زیبی نے بارہا چاہا تھا کہ وہ ہمارے ہاں آجائیں' لیکن امی ہمیشہ پیار سے دعا دے کر بات ٹال جایا کرتی تھیں۔

"ہم یہیں ٹھیک ہیں بیٹے---- اپنا گھر اپنا محلہ اپنے لوگ---- انہیں چھوڑ کر کہاں جائیں ---- کیسے جائیں۔"

"کیا یہ لوگ یہ گھر یہ جگہ آپ کو ہم سے زیادہ پیاری ہے۔"

"نہیں---- پیارے تم شاید ان سب سے زیادہ ہی ہو۔ لیکن ہمیں یہیں رہنے دو۔ خدا

نے تمہیں جو کچھ دیا ہے۔ خدا نصیب کرے، پھولو پھلو۔ ہمیں اسی سے خوشی ہے-----"

زیبی کے اصرار اور میرے کہنے پر امی کبھی کبھی چند دنوں کے لیے ہمارے پاس بھی آجاتی تھیں۔ زیبی ایک اچھی بہو کی طرح ان کی خدمت خاطر میں پیش پیش رہتی تھی۔

میری بہنیں جو اب اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں جب بھی میکے آتیں ایک آدھ دن کے لیے ہمارے ہاں بھی آجاتیں زیبی ان کی آؤ بھگت میں بھی کسر نہ اٹھا رکھتی تھی۔

آج بھی چائے پر اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ میری امی اور میری دو بہنوں کو جو اسی شہر میں تھیں مدعو کیا ہوا تھا----- اپنی بھابی اور امی کو بھی بلایا ہوا تھا۔

وہ ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزار رہی تھی دو پیارے پیارے بچوں کی ماں بن کر بھی وہ بڑی سمارٹ اور طرح دار تھی۔

میں اس کو اس کی صفات کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی ٹوٹ کر چاہنے لگا تھا۔

لیکن

میری بدقسمتی تھی۔ ٹوٹ کر چاہتے ہوئے اندر سے خود بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا تھا۔ میرا ضمیر مجھے کبھی چین نہ لینے دیتا تھا----- اس کے کچوکے مجھے اندر ہی اندر مار ڈالتے تھے----- میں محبت اور پیار کا لطف و سکون کبھی نہ پا سکا تھا۔

بعض اوقات تو مجھے یوں لگتا جیسے میں بالکل مصنوعی زندگی گزار رہا ہوں۔ مشینی انداز میں جی رہا ہوں----- میری بیوی اور بچے مجھ سے جذباتی طور پر وابستہ نہیں----- مکینکی طریق سے جڑے ہوئے ہیں۔ میں ایک کل ہوں اور یہ کل کے پرزے۔

دفتر آج جمعہ کی تعطیل کی وجہ سے بند تھا۔ صبح میں نے فیکٹری کا چکر لگایا تھا۔ وسیع و عریض فیکٹریاں سونا اگلنے کی مشین تھیں جیسے----- میں حیران تھا کہ کام اتنے منافع میں کیسے جا رہا ہے۔ کیا یہ میری محنت اور لگن ہے۔ جو میں مداوے کے طور پر کر رہا ہوں----- یا رحمان ڈوگر کے بعد قدرت ہی مجھ پر عنایات کی بارش کر رہی ہے----- لوہا سونا بن رہا ہے۔

لیکن

میں نے اس میں سے اپنے حصے کی ایک حد مقرر کر رکھی تھی میں اب اس وسیع و عریض کاروبار کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ رحمان ڈوگر کی شاندار کوٹھی----- جس میں بہت سے لوگوں نے مجھے اٹھ آنے کے لیے کہا تھا----- میری ملکیت تھی----- میں قانوناً اس کا مالک تھا۔ رحمان ڈوگر کے وکیل نے ساری قانونی کارروائیاں مکمل کر کے مجھے ان سب چیزوں کا وصیت کے مطابق مالک بنا دیا تھا۔

لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ میں اس جائیداد اور کاروبار پر اپنا حق نہیں سمجھتا تھا۔ میں اتنا ہی

لیتا تھا جتنا میرے لیے رحمان ڈوگر نے مقرر کیا تھا۔

زیبی اکثر کہتی۔ "راجو----- تم بالکل سیدھے ہو----- بھلا جس چیز کے تم قانونی وارث ہو----- اسے حاصل بھی کر چکے ہو----- پھر بھی اس پر حق نہیں جتاتے۔"

"اس لیے کہ میرا حق نہیں ہے۔"

"تو پھر کس کا ہے----- رحمان ڈوگر مر چکے ہیں۔ اور انہوں نے تمہیں قانونی طور پر بیٹا بنایا ہوا تھا-----"

"زیبی----- پلیز اس موضوع پر کچھ نہ کہا کرو۔"

"کیوں۔"

"مجھے ذہنی اذیت ہوتی ہے"

"بہتر۔"

"تمہیں ڈھنگ سے زندگی گزارنے کے لیے بہت کچھ مل جاتا ہے۔"

"ہاں میں نے شکوہ تو نہیں کیا۔"

"اپنی اڑان محدود ہی رکھو تو بہتر ہے۔"

"میں جانتی ہوں راجو----- میں نے تو کبھی اتنا سوچا بھی نہ تھا جتنا پا لیا ہے۔ میں شاکر ہوں----- مطمئن ہوں----- خوش ہوں۔ ہاں کبھی کبھی-----"

"یہ خیال آتا ہے----- کہ لاکھوں سے کروڑوں میں کیوں نہ پہنچ جاؤں"

وہ شوخی سے ہنس پڑتی----- جیسے میں اس کے دل کا راز اگل دیتا ہوں۔

وہ کتنی سادہ اور کیسی معصوم ہے۔ مجھے کبھی کبھی اس پر ترس بھی آتا ہے----- وہ یہی سمجھتی ہے کہ رحمان ڈوگر بے اولاد تھے۔ اور میرے کام سے خوش ہو کر انہوں نے مجھے بیٹا بنایا ہوا ہے۔

ہاں

یہ کہانی میں نے ہی تو گھڑی تھی۔ اسے کیا امی کو بہنوں کو بھائیوں کو یہی کہانی سنائی تھی-----

اور کیا کرتا----- کیا کہتا-----

میں نے سارے راز تو اپنے اندر ہی اتار لئے تھے۔ دل کے خانے میں بند کر لئے تھے۔ دل جو کال کوٹھڑی بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کال کوٹھڑی کے بند دروازوں تک کبھی کسی کو پہنچنے تھوڑا ہی دیا تھا۔ اس کے بند دروازے پر تو کوشش کے باوجود زیبی بھی دستک نہ دے سکتی تھی۔

میں نے اپنے دل کی کال کوٹھڑی کے بند کواڑوں اور زیبی کے دستک دینے والے ہاتھوں کے درمیان مخصوص فاصلہ رکھا ہوا تھا۔

کبھی میں بے چین ہو جاتا ----- مضطرب و پریشان ہو جاتا۔ تو یہ بھی سوچتا۔ کہ بند کواڑ زیبی کی دستک کی دسترس میں کر دوں۔ زیبی کو یہ کواڑ کھولنے دوں۔ اس پر عیاں ہو جاؤں ----- ظاہر ہو جاؤں۔

لیکن

ایسا نہیں کر سکتا تھا ----- پچھتاووں کی آگ پہلے ہی کون سی کم تھی جو اک نیا روگ پال لیتا۔

ہو سکتا ہے زیبی میرے کردار کا یہ رخ دیکھ کر مجھ سے نفرت ہی کرنے لگتی اس کی ہمدردی کی بجائے مجھے سدا کا تنفر مل جاتا ----- مجھ میں اب حوصلہ ہی کہاں تھا۔ برداشت کی قوت ہی کہاں تھی۔

میں اپنے فوم کے نرم بیڈ پر پڑا تھا۔ نرم و گداز تکیئے میرے سر کے تلے دوہرے ہوئے ہوتے تھے ----- سگریٹ میرے ہونٹوں اور انگلیوں میں گردش کر رہا تھا۔ میں نے بہت سے سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی چائے کی خالی پیالی میں راکھ اور ادھ جلے سگریٹوں کے ٹکڑے ڈالے جا رہا تھا۔ حالانکہ نفیس سی کٹ گلاس کی ایش ٹرے بھی قریب ہی پڑی تھی ----- لیکن میں بے دھیانی میں اس کی بجائے خالی پیالی کو استعمال کر رہا تھا۔

زیبی کی سہیلیاں شاید آچکی تھیں۔ لابی کے پرلی طرف ڈرائنگ روم سے بات بات پر قہقہے اڑ رہے تھے۔ شاید میری دونوں بہنیں ابھی نہیں آئی تھیں۔ زیبی انہی کے انتظار میں تھی ----- چائے کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں ----- قہقہے اڑ رہے تھے

اور

میں دل ہی دل میں ان قہقہوں سے جلن محسوس کر رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا۔ میں بھی اسی طرح بے فکری سے آزادی سے قہقہے لگا سکوں۔

لیکن

یہ قہقہے اب میرے نصیب سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے تھے زندگی سے بھرپور ایسے قہقہوں کے لیے میں ترس گیا تھا۔

میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکے چلا جا رہا تھا۔ کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا زیبی اندر آئی۔ اس نے گلابی فرنچ شیفون کی ساڑھی پہن رکھی تھی اس کا خوبصورت سراپا اس ساڑھی میں اور حسین ہو گیا تھا۔ ہلکے سے میک اپ کے ساتھ اس نے گلابی نگوں والا وہ طلائی سیٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ جو اس سالگرہ پر وہ میرے ساتھ جا کر خود اپنی پسند سے خرید کر لائی تھی۔

"دیکھئے صاحب کون آیا ہے۔" زیبی نے اپنے ساتھ اندر آنے والی میری بہن زوبی کی

طرف اشارہ کیا۔

"اوہ زوبی۔ تم کب آئیں -----" میں بیڈ سے اچھل کر نکلا اور زوبی کو پدرانہ شفقت سے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کے بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ رکھا۔

زوبی میری سب سے چھوٹی بہن تھی۔ اس کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ پنڈی رہتی تھی۔

"کل شام آئی تھی بھائی جان۔" زوبی نے میرے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

"بہت دنوں بعد آئیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ----- ارشد بھی آیا ہے۔"

"نہیں ----- میں ریل کار سے اکیلی ہی آگئی۔ امی کو دیکھے بہت دن ہو گئے تھے۔"

"ہمیں دیکھے نہیں ہوئے تھے زیادہ دن" زیبی نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ سب سے اداس ہو رہی تھی" زوبی اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے بولی۔ اس کے بچہ ہونے والا تھا ----- میرے سامنے وہ شرما رہی تھی۔

"امی آئی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں -----"

"کیوں۔"

"وہ عائشہ چچی کی احوال پرسی کو گئی ہوئی تھیں۔"

"رانی اور قمو۔" میں نے اپنی دوسری دونوں بہنوں کا پوچھا

"ابھی تک تو نہیں آئیں" زیبی بولی۔

"اچھا بھئی جاؤ اپنی دوستوں کو بہلاؤ ----- انتظار کر رہی ہوں گی تمہارا" میں نے کہا۔

زیبی اور زوبی دونوں کمرے سے نکل گئیں۔

ان کی محفل جم گئی تھی۔ باتوں کا شور اور قہقہوں کی آبشاریں گر رہی تھیں۔

میں نے اک گہری آہ بھری ----- اور پھر بیڈ پر آکر لیٹ گیا زیبی کی خوشیوں کے لیے میں نے دل سے دعا مانگی۔

اور میز پر پڑی فائل اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس فائل میں اس ہوسپٹل کا نقشہ اور دوسرے کاغذات تھے۔ جو ان دنوں میری زیر نگرانی بن رہا تھا۔

○ ☆ ○

بڑے دنوں بعد آج سنہری دھوپ نکلی تھی۔ آسمان دھل کر نکھر گیا تھا۔ بارشیں کھل کر تو نہ ہو رہی تھیں۔ سرمائی بارانی موسم تھا۔

کبھی بوندا باندی ہونے لگتی کبھی دھواں دھار بارش بس مطلع ہر وقت ابر آلود رہتا جس سے ٹھنڈک کا احساس اور بڑھ جاتا۔

ان دنوں پورا گھر ہیٹروں کی مدد سے گرم رہتا تھا۔ پھر بھی بچوں کو زکام کھانسی گھیر لیتی۔ میری بچی پنکی کا بخار آج ہی اترا تھا۔ کھانسی اب بھی تھی۔ اور گگو بھی نزلے زکام کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

میں لاؤنج میں قالین پر صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگیں لمبی کئے نیم دراز تھا۔ سنہری دھوپ لابی کے شیشے کی دیوار سے اندر آ رہی تھی۔ اور ہرے بھرے رنگا رنگ پھولوں والا چمن بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ میں ناشتہ کرنے کے بعد یہیں آ بیٹھا تھا۔ تساہل سے پڑا اخبار دیکھ رہا تھا ---- گگو اپنی ٹرین لئے بیٹھا تھا۔ اور پنکی میری گود میں آنے کے شوق میں میرے پیٹ پر چڑھی بیٹھی تھی۔

اس نے اخبار مجھ سے چھین لیا۔

"بابا۔"

"ہوں۔"

"بابا----" وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ شاید اس کا جی پیار پانے کو چاہ رہا تھا۔ مجھ پر تو دورے سے پڑتے رہتے تھے۔ کبھی بچوں سے اتنا ٹوٹ کر پیار کرتا کہ وہ حیران ہونے لگتے۔ اور کبھی دنوں ان سے لاتعلق سا رہتا۔ اظہار کے طور پر ذرا سا پیار کر لیتا اور بس۔ کہتے ہیں بچے اور جانور پیار کے معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں ---- انسان کے رویے کو پہچان لیتے ہیں ---- تاثرات کو محسوس کر لیتے ہیں شاید یہ بات صحیح ہی تھی ---- زہی کا پالتو ٹیمی بھی جب میرا موڈ ٹھیک نہ ہوتا میرے قریب نہ آتا ---- ورنہ دفتر آتے جاتے وہ میرے قدموں میں لوٹا کرتا تھا۔

میں پنکی کو پیار کرنے لگا ---- مجھے احساس تھا کہ میں اکثر بیوی بچوں کی حق تلفی کر جاتا ہوں----

پنکی اپنی توتلی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ بے شمار فرمائشیں تھیں بے انتہا پیار تھا۔ میں اس معصوم اور ننھی سی ہستی میں ڈوب گیا۔ اس کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنسا۔ اس کی فرمائشوں پر اس کا ماتھا چوم لیا۔ اس کے سرخ سیب ایسے گالوں پر جی بھر کر پیار کیا۔

میں نے دیکھا کہ پیار کے اس اظہار سے وہ پھول کی طرح کھل رہی ہے۔ اور تین چار دنوں بخار کی وجہ سے نڈھال ہونے کے باوجود ہشاش بشاش تھی۔

پنکی سے مجھے یوں پیار کرتے دیکھ کر گگو بھی میرے پاس آگیا۔ وہ پنکی کو ہولے ہولے دھکے دے کر میرے سینے سے اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے گگو کو بھی اپنے بازو میں لپیٹ لیا۔

دونوں بچے میرے سینے سے لپٹے ہوئے تھے۔ اور میں بڑے والہانہ انداز میں انہیں پیار کر رہا تھا۔

میں ان سے اتنا مصروف تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا زہی کب آ کر صوفہ پر بیٹھ گئی ---- میں پنکی کی توتلی سی بات کا توتلی ہی زبان میں جواب دے رہا تھا۔ کہ وہ ہنس پڑی۔

میں نے ویسے ہی پڑے پڑے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ نہا دھو کر آئی تھی ---- گہرے جامنی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا بالوں میں رولر لگائے ہوئے تھے ---- اور چہرے پر میک اپ کے بغیر ہی بڑی تازگی تھی۔

"کیا بات ہے۔" وہ خوبصورتی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔

"کیوں۔" میں نے بچوں کی گرفت ڈھیلی پاتے ہوئے اس کی طرف کروٹ بدلی۔

"بڑے چہک رہے ہو۔" اس نے کہا۔ میرے دل میں جیسے اس نے چٹکی کاٹی۔ پھر بھی میں سنبھل کر بولا "حسد آنے لگا ہے۔"

"ہاں" وہ ہنس کر بولی۔

"آجاؤ" میں نے بازو پھیلا دیئے۔

اس شوخی پر وہ بدک گئی۔ آنکھیں نکالتے ہوئے بولی "ہوش میں ہیں جناب۔"

"بالکل۔"

"لگتا تو نہیں۔"

"کیوں۔"

"بڑا پیار آ رہا ہے بچوں پر بھی اور ----"

"اور بچوں کی ماں پر بھی----"

"ہوں۔"

"بھلی لوگ ----- بہتے دھارے سے فائدہ اٹھالیا کرو -----"

"جی نہیں مجھے ایسے بہتے دھارے کی ضرورت نہیں جو غیر متوقع طور پر بھی منجمد ہو جاتا ہے۔"

وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن اس کی بات میرے دل میں سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔

بچے پھر کھیل میں مصروف ہو گئے تھے۔ زیبی اپنے ناخنوں سے نیل پالش اتارنے کے لیے نیل پالش ریمور اور روئی لے آئی تھی۔ وہ اپنے ناخنوں پر ریمور میں روئی بھگو بھگو کر رگڑ رہی تھی۔

میں اس کی طرف تکے جا رہا تھا۔ میرے خیالات پھر سے الجھ رہے تھے میں شائد جاننا چاہتا تھا کہ زیبی اپنی اس زندگی میں خود کو ڈبو کر میرے رویوں کو درگزر کیے جا رہی ہے۔ یا وہ اتنی مطمئن ہے کہ رویوں کی تبدیلی اس پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی۔

اسی رات مجھے میرے تجسس کا جواب مل گیا۔

میں بیڈ میں پڑا تھا۔ سگریٹ پھونک پھونک کر کڑوا ہو چکا تھا۔ اور سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے کے اندر باہر سگریٹوں کے بچے کھچے ٹکڑے پڑے تھے۔ راکھ کی ہلکی سی تہہ ٹیبل کی چمکیلی سطح پر جم گئی تھی۔ زیبی آج اپنی اماں کی احوال پرسی کو گئی تھی۔ واپسی پر بچے گاڑی ہی میں سو گئے تھے اب انہیں گاڑی سے نکال کر بستر میں ڈالا تو دونوں ادھ کچی نیند میں تھے۔ سو رہے تھے نہ جاگ رہے تھے۔ اسی لیے دونوں ہی رو رہے تھے۔

زیبی انہیں باری باری تھپک رہی تھی۔ بچوں کا کمرہ ہمارے برابر ہی تھا۔ درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ بچوں کے سروں میں رونے اور زیبی کے بہلانے پھسلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پنکی روئے جا رہی تھی۔

"آپ کے پاس سوؤں گی -----" وہ تتلاتے ہوئے کہہ رہی تھی -----

"سو جا ----- نہیں تو ایک تھپڑ لگاؤں گی -----" زیبی نے جھلا کر کہا۔

"بیگم صاحبہ آپ جائیں میں انہیں سلا لوں گی" پنکی کی آیا کی آواز تھی۔

"بیگم صاحبہ -" میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ میں نے ایک لمبا اور گہرا سانس لے کر سگریٹ کا ڈھیر سارا دھواں اپنے اندر اتار لیا۔

زیبی

زیبی کو بیگم صاحبہ بنانے کے لیے میں کن کن مرحلوں سے گزرا تھا اذیت کی کس بھٹی میں جل رہا تھا ----- میں سوچنے لگا۔

لیکن

اس میں زیبی کا تو کوئی دوش نہ تھا۔ اس نے کب کبھی مجھ سے بیگم صاحبہ بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کب کوٹھیوں اور کاروں کے لیے کہا تھا۔ کب روپے پیسے کی ریل پیل کے لیے مچلی تھی۔

وہ تو اپنی ذات میں خوش و مطمئن تھی۔ اسے یہی احساس فرحت بخشا کرتا تھا کہ وہ میری بن رہی ہے۔ شاید ہر لڑکی کی طرح اس کے احساسات و خیالات بھی دلہن بننے تک ہی محدود تھے۔ یہ تصور ہر لڑکی کے ذہن پر قوس قزح کے رنگوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔ کہ وہ ایک جواں مرد کی بانہوں میں قید ہو رہی ہے۔ سج بن کر روپہلی جوڑا اور جھلمل کرتے زیور پہن کر وہ مرد کی آغوش میں آجانے کے بعد کی باتیں کہاں سوچتی ہے۔ کسی اور سوچ کی گنجائش بھی تو نہیں رہتی کہ بذات خود یہ جذبہ بڑا بھرپور اور تومند ہوتا ہے۔

اس رات زیبی پنکی کو سلا کر ہی کمرے میں آئی ----- ڈریسنگ روم میں جا کر اس نے خوبصورت سی نائٹی پہنی بالوں کو کھولا برش کیا۔ میک اپ صاف کیا اور ہلکی سی پرفیوم سپرے کر کے میرے پہلو میں لیٹ گئی۔

میں نے اس پر اک نگاہ ڈالی ----- اور اپنا بازو اس کی گردن تلے سے گزارتے ہوئے اپنے قریب کر لیا۔

"کیا حال ہے پھپھو کا" میں نے زیبی کی امی کے بارے میں پوچھا۔ رشتے کی یہ پھپھو ابھی تک اپنے محلے میں ہی رہتی تھی اور میری امی کی طرح اسے اپنا چھوٹا سا گھر بے حد عزیز تھا ----- حالانکہ زیبی کے تینوں بھائی ان دنوں بہت کما رہے تھے۔ اور کرائے کی کوٹھیوں میں اٹھ گئے تھے زیبی کی امی کا گھر اور میری امی کا گھر صرف ایک گھر کے فاصلے پر تھا۔

"زکام کھانسی نے برا حال کیا ہوا ہے۔" زیبی بولی۔ "امجد آج انہیں لینے آیا تھا۔"

"پھر۔"

"حسب عادت -----"

"یعنی نہیں گئیں -----"

"نہ جائیں۔ اکیلے رہنے میں انہیں مزہ ملتا ہے۔ ابا جی ہوتے تو اور بات تھی۔"

"تم ہی لے آتیں ساتھ -----"

"توبہ کرو جی۔ بیٹوں کے گھر نہیں جاتیں۔ بیٹی کے گھر کہاں آسکتی ہیں۔ پرانے لوگوں کے پرانے ہی خیالات ہیں۔"

"تم نئے خیالات کی ہو گئی ہو نا۔" میں نے زیبی کو اپنی طرف گھسیٹا۔ زیبی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں جانے کیا تھا۔

شکوہ

دکھ

یا

خوشی

میں جان نہ پایا ---- ہاں بے اختیارانہ اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا ---- اور اتنی سختی سے دبوچا کہ وہ احتجاجاً چیخ اٹھی۔

میں دیوانہ وار اسے پیار کرنے لگا۔

لیکن

اس دیوانگی میں بھی مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اپنے آپ سے بھی سچا نہیں ہوں۔ میرے اندر برف کے تودے جمے ہوئے ہیں۔ اور میں بڑے مصنوعی پن سے ان تودوں کو حدت پہنچا کر پگھلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

"اب بس ---- بہت ہو گیا۔" زیبی نے میرے بازوؤں سے نکل کر اپنا تکیہ سر تلے رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے یہ بات شوخی سے نہ کہی تھی، شرارت بھی نہ تھی اس میں وہ تو بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی ---- میرے والہانہ پیار کا اس پر جیسے اثر ہی نہ ہوا تھا۔

تب میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔ "کیوں زیبی"

"کچھ نہیں۔"

"اداس کیوں ہو۔"

"نہیں تو۔"

"چھپاؤ نہیں۔"

"میں کیا چھپاؤں گی۔ تمہارے لیے آئینے کی طرح صاف و شفاف ہوں ----"

"میں بھی تو آئینے کی طرح ہوں ----" میں نے یوں کہا جیسے کوئی جرم کیا ہو۔ اس نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی "ہوں آئینے کی طرح۔"

"ہاں آئینے کی طرح۔"

"لیکن دھندلایا ہوا ---- جس میں کبھی تو صورت صاف نظر آ جائے کبھی کچھ بھی نظر نہ آئے۔"

"زیبی ----"

میرے اندر اک چیخ گونج اٹھی۔ تو کیا زیبی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ مجھے شناخت کر چکی تھی

---- جان لیا تھا ---- کہ میں کیا ہوں۔

زیبی شاید خود ہی گھبرا گئی۔

میں نڈھال سا ہو کر چت لیٹ گیا۔

زیبی نے جلدی سے قدرے اونچا ہوتے ہوئے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ بازو میری گردن تلے لے جاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے میرے گال کو چھوا۔

"راج ----" وہ جذباتی انداز میں بولی۔

"ہوں"

"جانے کیا بات ہے راجو ---- میں آج تک سمجھ نہیں پائی ----"

میں چپ رہا۔

وہ خود ہی بولی "مجھے لگتا ہے میرے اور تمہارے درمیان کچھ ہے ---- کچھ ---- جس کی میں تشریح نہیں کر سکتی ----"

میں ڈر گیا اور اپنے خوفوں سے بھاگتے ہوئے بولا "پگلی تمہارا وہم ہے۔ ورنہ دیکھو تو ---- تمہارے اور میرے درمیان سوائے تمہاری نائٹی اور میری قمیض کے اور کیا ہے ---- تو ----"

میں نے شوخ ہونا چاہا ---- لیکن وہ میری چھاتی سے سر اٹھا کر کہنی کے سہارے اٹھتے ہوئے بولی ---- "راجو ---- ہو سکتا ہے میرا وہم ہی ہو ---- لیکن کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ---- کہ تم

تم مجھ سے اتنی دور ہو ---- اتنی دور ہو ---- کہ تمہیں چھونا تو کجا میں تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتی ----"

میں نے ٹوٹا ہوا سانس لیا ---- اسے پھر چھاتی پر گرا لیا ---- وہ مطمئن نہ ہوئی۔

"تم مجھے پیار کرتے ہو ---- میں جانتی ہوں راجو۔ لیکن کبھی کبھی جب میں تمہاری چھاتی سے لگ کر سرور حاصل کرنا چاہتی ہوں تو مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے تمہاری چھاتی کوئی اندھیری قبر ہے جس کے سناٹوں میں میں اتر رہی ہوں ----"

"ز ---- بی ----"

"راجو ---- پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ تمہارے پیار میں بعض اوقات حدت کی بجائے برفانی سلوں کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔"

"سو جاؤ۔ تم تھک گئی ہو ---- بچوں کی وجہ سے اپنی امی کی وجہ سے۔" میں نے اسے لپٹا لیا۔

"ناراض تو نہیں ہو گئے" اس نے میرے بازو پر سر رکھ کر اپنا بازو میری چھاتی پر رکھ دیا۔

میں ہنس پڑا ----- اسے مطمئن کرنے کے لیے ہنسنا ہی تھا۔

پھر میں نے پیار سے کہا۔ "زیبی لگتا ہے۔ آج کل تم کوئی رومانی کتابیں پڑھ رہی ہو۔ یا تمہاری سہیلیوں میں کسی ادیبہ یا شاعرہ سہیلی کا اضافہ ہوا ہے-----"

اس نے سر نفی میں ہلایا۔ "چلو چھوڑو ----- شاید میں وہمی ہوں اور تم اپنی مصروفیات کے بار تلے دبے ہوئے-----"

"اب سوچی ہے نا صحیح بات۔" میں نے اس کے ہونٹوں پر گرمجوشی سے اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

شاید وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ یا اپنے دل کو ڈھارس دے لی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بے خبری کے عالم میں سو رہی تھی۔

میں نے سوئی ہوئی زیبی کو دکھ بھری ہمدردی سے دیکھا ----- کتنی پیاری کتنی مخلص تھی وہ۔

میں نے وقتی دھارے میں بہہ کر چاہا اسے اسی وقت نیند سے جگا دوں اور اسے کہہ دوں کہ زیبی تو نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کہا ہے ----- میں دھندلایا ہوا آئینہ ہوں ----- میں تم سے چھپ رہا ہوں۔ تم مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتے کرتے تھک نہ جانا۔

جی چاہا کہ اس کے سامنے اپنی شخصیت کے پرت الٹ دوں۔ اسے بتا دوں۔

سب کچھ بتا دوں۔

لیکن

نہیں

اگر میں نے ایسا کر دیا ----- اور زیبی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی۔

تو

میں کیا کروں گا۔ میں تو ابھی تک اپنی ذات کے ٹکڑے سمیٹ نہیں پایا تھا۔ کرچی کرچی ... کو گھسیٹے چلا جا رہا تھا----- زیبی بکھر گئی تو کیا کروں گا۔

○ ☆ ○

زیبی کی اس رات کی باتیں خطرے کا الارم تھیں۔ میں نے تربیت شدہ کتے کی طرح دور ہی سے بو سونگھ لی تھی۔ اس لیے زیادہ ہی محتاط رہنے لگا تھا----- اب میری کوشش یہی ہوتی کہ زیبی کو جب پیار کروں تو تن من کی گہرائی سے کروں ----- اس کے ذہن میں رینگنے والے وسوسے نکال دوں اسے قبر کی سی سنسانی کا احساس مطلق نہ ہونے دوں۔ اسے سینے سے لگاؤں۔ تو پیار میں شعلوں کی سی تپش ہو۔

میں اس میں کامیاب ہوا۔ یا نہیں ----- میں نہیں جانتا تھا اس موضوع پر تو زیبی سے بات کرنے کے خیال ہی سے خوف آتا تھا زیبی میرے لیے پر اسرار شے نہ تھی۔ وہ تو روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ بچپن سے مجھے چاہتی چلی آ رہی تھی اب بھی اسی طرح چاہے جا رہی تھی۔ مجھے اس ضمن میں کوئی دھڑکا تھا نہ ڈر ----- دھڑکا اور ڈر تو صرف یہ تھا کہ وہ میرے دل کی کال کوٹھڑی کے بند دروازوں سے کسی وقت اس طرح نہ ٹکرا جائے ----- کہ بند دروازے ٹکراؤ کے زور سے ہی کھل جائیں۔

کال کوٹھڑی

جس میں

زیبی کے لیے عشق بھی تھا ----- اور اس عشق کو بن موت مارنے والے خوفناک سائے بھی ----- اسی لیے تو میں نے اس کال کوٹھڑی کو مضبوطی سے بند کر رکھا تھا ----- اور زیبی سے پیار کا اظہار تو مندی سے کرنا چاہتا تھا۔

ہماری شادی کی پانچویں سالگرہ قریب آ رہی تھی۔ زیبی گھر پہ اور کبھی کبھی ہوٹلوں میں تقریبات کرنے کی عادی سی ہو چکی تھی ----- میں نے کبھی بھی اسے روکا ٹوکا نہ تھا۔

لیکن

زیبی شادی کی سالگرہ منانے میں تساہل برت جاتی تھی۔ اس نے کبھی بھی یہ سالگرہ دھوم دھام سے نہ منائی تھی۔ حالانکہ جس طبقے میں وہ اب شامل ہو چکی تھی۔ اس میں عیدین کی طرح شادی کی سالگرہ کا فنکشن بھی باقاعدگی سے منایا جاتا تھا۔

یہ رسم بڑا زور دار فیشن بن چکی تھی۔
اس دفعہ میں نے اس تقریب کو منانے کا تہیہ کر لیا۔
اس دن میں نے دفتر سے گھر پہ فون کیا۔
جمو بولا ا "صاحب جی بیگم صاحبہ کو بلاؤں"
"ہاں۔"
"اچھا جی"
تھوڑی دیر بعد زیبی کی آواز آئی "ہیلو۔"
"جانی۔"
"اوہو ----- کیا ہو گیا ہے جناب کو۔"
"کیوں۔"
"میں پنکی کو کپڑے بدلا رہی تھی۔"
"آیا کہاں ہے۔"
"وہ کپڑے دھو رہی ہے -----"
"ہوں۔"
"کیا بات ہے -----"
"کیوں۔"
"فون جو کیا ہے۔"
"تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔
"لگتا ہے آفس میں بیکار بیٹھے ہیں۔"
"نہیں تو۔"
"پھر -----"
"میں کہنے والا تھا -----"
کیا۔"
"کہ پرسوں ہماری ویڈنگ اینور سری ہے۔"
"اوہ ----- ہاں ----- پانچویں نا۔"
"بالکل۔"
"دفتر میں بیٹھے بیٹھے یاد آ گئی۔"
"ہاں۔"

"پرسوں میں ابھی کل کا دن ہے۔ گھر نہیں آنا تھا کیا؟"
"سنو زیبی۔"
"ہوں۔"
"میں ٹھیک ساڑھے پانچ آؤں گا ----- تم تیار رہنا -----"
"کہیں جانا ہے۔"
"ہاں۔"
"کہاں۔"
"جب جائیں گی تمہیں پتہ چل جائے گا"
"یہ کیا بات ہوئی"
"بس جان من ----- تیار رہنا -----"
"اللہ۔" زیبی شاید میرے اس تخاطب پر شرما گئی تھی۔ وہ بے شک ماڈرن ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ باتوں میں ابھی تک قدامت پسند تھی۔ اس قسم کے خطاب اور الفاظ اس کے خیال میں بیڈ روم تک ہی محدود ہونا چاہئیں تھے۔ گھر پر نوکروں کے سامنے بھی وہ اس قسم کی باتوں سے گریزاں رہتی تھی۔

میں شاید اور بھی باتیں کرتا۔ کہ کچھ کسٹمر آ گئے۔ مجھے فون بند کرنا پڑا میں نے زیبی سے کہا تیار رہنا ----- میں ساڑھے پانچ آجاؤں گا۔ "خدا حافظ"

میں نے فون رکھ دیا ----- اور مال کی لین دین کی باتیں کسٹمروں سے کرنے گیا۔ یہ ایک بہت بڑی پارٹی تھی۔ ان سے آرڈر وصول کرنے کے لیے مجھے گھنٹوں مغز پچی کرنا پڑی۔ معاملہ بالآخر طے ہو گیا اور مجھے ان سے ایک بہت بڑا آرڈر ملا۔ کام کا مسئلہ تو پہلے نہ تھا ----- ہاں یہ سودا بڑا منافع بخش تھا۔

اور

جب بھی کوئی ایسا سودا میرے ہاتھوں ہوتا۔ مجھے خوشی کی بجائے غیر محسوس سا دکھ اندر ہی اندر کاٹنے لگتا۔ اس منافع بخش سودے نے نو بند زخموں میں پھر سے کسک پیدا کر دی۔

میں نے سر ہاتھوں میں گرا لیا ----- اور ڈپریشن مجھ پر طاری ہو گئی۔

چھ بج چکے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر کلاک پر نظر نگاہ ڈالی پھر گھڑی دیکھی مجھے زیبی کو ساڑھے پانچ شاپنگ کے لیے لے جانا تھا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھنے کو تھا۔ کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ----- زیبی بول رہی تھی۔
"بس آ ہی رہا ہوں"

"خیر جلدی تو مجھے کوئی نہیں۔ صرف یہ احساس دلانا تھا تمہیں کہ ساڑھے پانچ"

"اوہ زیبی ----- خدا قسم بیوپاری گھیرے بیٹھے تھے ----- بہت بڑا بزنس کیا ہے"

"مبارک ہو"

"دیکھو طنز نہ کرو-----"

"کیوں نہ کروں جناب ----- سودا چھوٹا ہو یا بڑا۔ ہمیں کیا ہمیں تو وہی ملے گا ----- جو ملتا ہے-----"

زیبی شاید حق بجانب تھی-----

میں نے فون رکھ دیا-----

اس شام میں زیبی کو شاپنگ کے لیے لے گیا۔ شادی کی سالگرہ کے لیے تحفہ خریدنا تھا ----- میں نے ایک بڑی رقم اس کے حوالے کر دی۔ "اپنی پسند کی چیزیں لے لو-----"

"کیا خریدوں؟" وہ پیسے دیکھ کر قدرے حیران بھی ہوئی۔

"جو چاہو-----"

اس نے میرے اصرار پر ایک خوبصورت پوت کی ساڑھی خریدی۔ انگوٹھی اس کے پاس تھی۔ اس نے ننھے ننھے ڈائمنڈ کے ٹاپس خرید لئے۔

اس دن وہ بے حد خوش تھی۔ واپسی پر میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ چیزیں گود میں رکھی تھیں۔ مسکرا کر بولی "اس دفعہ اتنی نوازش کیوں جناب"

"پانچویں سالگرہ ہے۔ اس کے بعد دسویں سالگرہ منائی جائے گی" میں نے جو دل ہی دل میں افسردہ ہو رہا تھا ہنس کر بولا۔

"اچھا ----- یہ بات تھی" وہ بولی۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اس دفعہ تقریب بھی منائیں گے۔

"بہت اچھا"

"خوش ہو نا"

"بہت"

میں نے چور سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی وہ واقعی بہت خوش تھی۔

○ ☆ ○

میں چاہتا تھا ----- سالگرہ کی تقریب ہوٹل میں ہو۔ لیکن زیبی نے کہا "یہ ہماری شادی کی سالگرہ ہے ہم گھر پہ ہی منائیں گے۔"

اس نے اپنی سہیلیوں میرے ملنے والوں یا کسی اور کو مدعو نہیں کیا صرف میرے اور اپنے بھائی بہنوں اور ماؤں کو بلایا۔

"اس خوشی کے موقع پر صرف گھر کے لوگ ہونے چاہئیں۔ گپ شپ لگانے کا مزہ آئے گا ----- بے تکلفی تو ہو گی -----"

واقعی

زیبی نے بات ٹھیک کی تھی۔ میری امی تینوں بہنیں اور دونوں بھائی آئے تھے۔ زیبی کے تینوں بھائی بھابیاں اور امی آئی تھیں۔

زیبی نے آتشی گلابی رنگ کی بھاری پوت کی ساڑھی پہنی۔ سفید تلے والی ساڑھی کے ساتھ اس نے ڈائمنڈ کے ٹاپس پہنے ----- وہ خوشی سے اتراتی پھر رہی تھی۔

میری اور اس کی امی اسے دیکھ دیکھ کر پھولی نہ سما رہی تھی۔ دونوں کے دل سے ہمارے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

میری بہنیں زیبی کو چھیڑ رہی تھیں "زیبی بالکل دلہن لگ رہی ہو-----"

"ماشاء اللہ پانچ سال گزرنے پر بھی ویسا ہی نکھار ہے چہرے پر-----"

"بلکہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہو گئی ہو-----"

"جسم ذرا بھر گیا ہے نا۔ پہلے تو بہت دبلی پتلی تھیں"

"رنگت میں بھی سرخی چھلکنے لگی ہے۔ سنہرے رنگ میں سرخی مل کر کیا قیامت کا رنگ بکھیر رہی ہے۔"

بہنوں کی چھیڑ چھاڑ سے زیبی محظوظ ہو رہی تھی۔

یہ سب لوگ زیبی کے لیے تحفے لائے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی نے جو میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ زیبی کو ناک کی طلائی کیل دیتے ہوئے کہا "بھابھی ابھی میں پڑھ رہا ہوں۔

ڈاکٹر بن گیا تو ادھار چکاؤں گا۔ یہ کیل ننھی سی ہے۔ لیکن آپ کے ناک کا حسن اس سے بہت بڑھ جائے گا۔"

سب نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا تھا۔

زیبی شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی "ویسے مجو تجھے کیل کا خیال کیونکر آیا؟"

"کسی سہیلی نے رائے دی ہو گی" زوبی نے مذاق کیا۔ مجو بے چارہ سرخ ہو گیا۔ اس سے چھوٹا بھائی نواز جو انجینئرنگ کے دوسرے سال میں تھا زیبی کے لیے ایک ڈیکوریشن پیس لایا تھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ ادھار تعلیم ختم کرنے کے بعد جب ملازم ہو گا تو چکائے گا۔

میں بھی قہقہوں اور ہنسیوں سے مزین اس محفل میں بیٹھا تھا۔ ہنس بول بھی رہا تھا ---- اپنی بہنوں اور بھائیوں کو اس مقام پر دیکھ کر خوشی بھی ہو رہی تھی۔

لیکن

انہیں اس مقام تک لانے کے لیے میں نے کیا کیا تھا۔ وہی تو سلگاؤ تھے۔ وہی تو آگ تھی۔ وہی تو انگارے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد بھی سب گپ شپ میں مصروف رہے زیبی کے بھائی اور بھابیاں تو کچھ دیر بعد چلے گئے ---- میرے گھر والوں کو زیبی نے بڑے اصرار سے روک لیا۔

"آج نہیں جانے دوں گی" وہ رانی اور قمو کی کمروں میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ پھر اس نے قمو اور رانی کے خاوندوں سے بھی یہی کہا "آج سب یہیں رہیں گے" فاضل اور عمیر تو نہ رکے ہاں رانی قمو اور بچوں کو رات رہنے دیا ---- زوبی اکیلی ہی تھی ---- اس کا میاں پنڈی سے ابھی نہیں آیا تھا۔

زیبی ان سب کے لیے سونے کا اہتمام کرنے لگی۔ نوکر سے بستر نکلوائے' امی کے لیے گیسٹ روم میں بستر لگایا۔ قمو اور رانی کے لیے دوسرے کمرے میں زوبی امی ہی کے کمرے میں سونے کے لیے اصرار کرنے لگی۔ مجو اور نواز کے لیے اس نے لابی میں بستر لگوا دیئے۔

میں کچھ دیر امی کے پاس بیٹھا رہا۔ امی کے چہرے پر خوشیوں کے پر تو تھے جانے کیا خیال آگیا آہ بھر کر بولیں "کاش تیرے ابا آج زندہ ہوتے بیٹے کی آن بان دیکھتے ---- تیری کوئی خوشی بھی انہوں نے نہ دیکھی آہ ---- ہا ----"

میں بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا "امی آپ بھی جا کر آرام کریں" میں بولا "رات کافی ہو گئی ہے ---- خدا کو جو منظور ہو وہی ہوتا ہے۔"

میں اپنے بیڈ روم میں آگیا۔

میں نے امی کی تسلی کے لیے جو الفاظ کہے تھے۔ وہ میرے رویے کی نفی کر رہے تھے۔ ہم

اپنے عیب اپنے جرم اور اپنی کوتاہیاں چھپانے کو اکثر یہی کہہ دیتے ہیں ----

میں نے امی کو دلاسا دیا تھا۔ لیکن میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔

ضمیر!

جس سے کبھی کبھی میں سخت تنگ آجاتا تھا ---- اور جس سے الاعلان بغاوت پر اتر آنے کو مچل مچل اٹھتا تھا۔ لیکن میرا ضمیر جانے کس مٹی سے اٹھا تھا کہ میں ایسا کبھی نہ کر سکا۔

دونوں بازو سر تلے رکھے میں بیڈ پر چت لیٹ گیا۔ میری نگاہیں چھت پر تھیں۔ لیکن میں چھت کو دیکھ نہیں رہا تھا۔ چھت تو جیسے تھی ہی نہیں۔ میں تو گزرنے والے ماہ و سال کے پرانے عکس دیکھ رہا تھا۔ ان عکسوں میں میری شبیہہ کہیں واضح تھی اور کہیں بالکل ہی پہچانی نہ جاتی تھی۔

پانچ سال پہلے میری شادی زیبی سے ہوئی تھی۔ میری ماں میرے متعلق ہر وقت فکر مند رہتی تھیں۔

میں ---- جو ایک طویل ذہنی بیماری سے بمشکل چھٹکارا پا سکا تھا۔ نفسیاتی بیماری۔

ہاں

وہ نفسیاتی بیماری ہی تھی۔ کوئی جسمانی روگ نہیں تھا۔

یہ بیماری اس سانحے کے رد عمل کے طور پر ہوئی تھی جس میں میں بلا واسطہ یا بالواسطہ ملوث تھا۔

تین چار ماہ تو میری ذہنی حالت مخدوش رہی تھی۔ بالکل پاگلوں کی طرح حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ کبھی چیخنے لگتا۔ کبھی بالکل چپ ہو جاتا پتھر کی طرح وزنی سرد اور چپ۔

بمشکل میں اپنے آپ پر قابو پا سکا۔

انہی دنوں میری بہنوں اور امی نے میری شادی رچا دی۔

اماں کہتیں "شادی کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گا"

قمو کہتی "ہاں اماں زیبی کو کب تک وہ لوگ ہماری خاطر بٹھائے رکھیں گے ---- بیس سال کی تو ہو رہی ہے۔ اس کی اماں بڑی متفکر ہیں"

یہی بات رانی کہتی تھی "امی زیبی کو اب دلہن بنا ہی چاہیئے"

میری امی کو بھی یہی خدشہ تھا "زیبی راجہ کی منگیتر ہے۔ اب زیادہ دیر نہیں کی جا سکتی"

قمو اور رانی میری اور زیبی کی محبت کی رازدار تھیں۔ اماں جب بھی کوئی خدشہ ظاہر کرتیں۔ وہ دونوں بڑے اعتماد سے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے کہتیں "منگنی نہ بھی ہوئی ہوتی جب بھی زیبی راجہ کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

اتنے وسوسے اور اندیشے ظاہر ہو رہے تھے۔ شادی کا اہتمام ہونے لگا۔ میں نے چپ چاپ شادی کر لی۔ میرے سینے میں بچپن سے جو ارمان پل رہے تھے زیبی کی قربت کے لیے جو خواہش تڑپ بنی ہوئی تھی۔ اسے دلہن بنا کر اپنے پہلو میں لینے کے جتنے ولولہ انگیز خواب دیکھے تھے شادی کے دن ان سب کا کہیں نشان بھی نہ ملتا تھا۔

میں چھت پر نظریں جمائے اسی رات کا تصور کر رہا تھا۔ جب زیبی خوشبوؤں میں بسی سرخ جوڑا پہنے زیوروں سے سجی میرے پہلو میں آئی تھی۔

خوف میرے سینے میں اتر رہا تھا۔ شوق و تجسس بھی تھا لیکن میں اس رات

ہاں اس رات۔

ایک ارمانوں بھری خوابوں بھری آرزوؤں اور خوشیوں بھری جوانی سے انصاف نہ کر پایا تھا۔

میں اس رات سخت مضطرب تھا۔ سخت بے چین تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس رات کا حق نہیں رکھتا۔ یہ میرے حصے میں آنے کے لیے نہیں ہے ---- اس کے لمحوں اور گھڑیوں پر میرا کوئی حق نہیں۔

میں نے واقعی اسی رات ویلیم کی گولی کھالی تھی۔ میرے حواس پر غنودگی چھانے لگی تھی ---- زیبی کے جگمگاتے زیور لباس اور خوبصورت چہرہ دھندلانے لگا تھا۔

پھر

میں اس کے پہلو میں بے ترتیب سا پڑے پڑے سو گیا تھا۔

دوسرے دن

میں زیبی سے شرمندہ تھا۔ لیکن جانے کتنی فراخ دل کی لڑکی تھی۔ میری شرمندگی کو اپنی مسکراہٹوں کے لبادے میں چھپا لیا تھا۔

شاید وہ مجھے میری بیماری کی وجہ سے معاف کر رہی تھی۔

میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ بازو کے حلقے میں چہرہ چھپا کر میں تکیے میں دھنس لیا۔

دوسرے کمرے میں زیبی رانی اور قمو کی ہنسی اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سب بہت خوش تھیں ---- میں ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

رانی کہہ رہی تھی "زیبی آج تمہاری شادی ہے۔"

قمو ہنس رہی تھی "کل ولیمہ کھا کر ہی جائیں گے۔"

"بالکل بالکل" زیبی کا لہجہ مسرور تھا۔

"لیکن سنو" رانی بولی۔

"کیا" زیبی نے پوچھا۔

"پانچ سال پہلے والا ولیمہ نہ ہو" رانی نے کہا اور تینوں کھلکھلا اٹھیں۔

"جائز ولیمہ ہو ---- کل ---- سمجھیں" قمو ہنس رہی تھی۔

شاید زیبی شرما گئی تھی۔ اس کی آواز نہیں آئی۔

پھر تینوں باتیں کرتے شاید کمرے سے نکل گئیں۔

میں نے ایک ٹھنڈی گہری سانس کھینچی۔ سگریٹ سلگایا

اور

زیبی کا انتظار کرنے لگا۔

○ ☆ ○

گھر میں نوکر تھے۔ لیکن زیبی میرے کام خود کیا کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ میرے کام کر کے وہ چھوٹی موٹی خوشیوں سے اپنا دامن بھرتی رہتی ہے۔ میرے کپڑے وہ خود استری کر کے ہینگروں میں ڈالتی۔ میری بنیانیں جرابیں اور رومال ہمیشہ ترتیب سے الماری میں خود رکھتی ----- اور تو اور میرے جوتوں کو پالش تک خود لگاتی -----

میں اس سے بار ہا کہہ چکا تھا "جوتے پالش کرنے کا کام تو نوکر سے کروا لیا کرو۔ آخر وہ لوگ کس مرض کی دوا ہیں"

وہ مسکرا دیتی "تمہیں اس سے کیا۔ تمہیں ہر چیز تیار ملنی چاہیے۔ وہ مل جاتی ہے" لباس کے معاملہ میں مجھے کبھی تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔ زیبی خود ہی میرے کپڑے نکال دیتی تھی۔ دفتر تو خیر دفتر تھا۔ وہ تو ڈنر یا پارٹیز میں جانے کے لیے بھی میرے کپڑوں کا انتخاب خود کرتی تھی۔ اور مجھے اعتراف تھا بلکہ فخر تھا کہ اس کی پسند بہترین تھی۔

اس شام میں نے تاجروں کی ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے ایک میٹنگ میں جانا تھا۔

زیبی نے میرے فاختائی گرم سوٹ کے ساتھ ٹائی قمیض بنیان جرابیں رومال اور جوتے ڈریسنگ روم میں رکھ دئے تھے۔

میں نے پسندیدہ نظروں سے اس لباس کو دیکھا۔ ایسی سوبر میٹنگ میں مجھے یقیناً یہی سوٹ پہن کر جانا چاہیے تھا۔

زیبی ادھر آئی تو میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا-----

"خوش رہو زیبی۔"

"خیریت۔" وہ اپنی پشت پر سے میرے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے اسے ایک جھٹکے سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اللہ۔" وہ گھبرا گئی۔

"کیوں۔"

"چھوڑو نا"

"نہیں چھوڑتا"

"تم نے میٹنگ پر جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"ہو جائے"

میں نے سر جھکا کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

وہ شرماتی گھبراتی مجھ سے الگ ہو گئی۔

"بہت خراب ہو" اس نے شرمیلی ادا سے کہا

"کیوں" میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں شوخی سے دیکھا

"کیا ہو رہا ہے آج-----" وہ پرے ہٹتے ہوئے بولی۔ میں جو پھر اس کی جانب لپک رہا تھا۔

"آجاؤ" میں نے بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ اپنے بازو پھیلا دیئے-----

وہ چند لمحے تکتی رہی۔

ہچکچائی۔

لیکن پھر میرے بازوؤں میں آ گئی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور بے تحاشا پیار کرنے لگا----- وہ مزاحم نہ ہوئی شاید میرے مزاج کی انتہاؤں سے وہ واقف تھی۔

میں تیار ہو کر میٹنگ میں گیا۔ شہر کے چوٹی کے تاجر اور پریس کے نمائندے موجود تھے۔ فوٹو گرافر بھی آئے ہوئے تھے۔ میں بڑی معتبر اور محترم شخصیت تھا۔ ملکی صنعت کی ترقی و فروغ کے لیے سب ہی کوشاں تھے۔ صنعت ملک کے استحکام کے لیے بنیادی ستون تھی۔

ہمیں صنعت کو فروغ دینا تھا۔ لیکن ہمارے چند مسائل بھی تھے۔ کچھ ایسی رکاوٹیں اور دشواریاں بھی تھیں۔ جو ترقی کی راہ میں حائل تھیں اور جنہیں اجتماعی کاوش سے بھی دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں حکومت سے تعاون کی اپیل کرنا تھی۔ کیونکہ حکومت کے وسائل ہی ایسے تھے۔ جو صنعتکاروں کی مشکلات دور کر سکتے تھے۔ کچھ امپورٹ پالیسی پر بھی اعتراضات تھے۔ ملکی صنعت کو فروغ دینے اور اسے مقبول بنانے کے لیے حکومت کو چاہیے تھا۔ کہ وہ اشیاء جو ہم لوگ بناتے تھے۔ ان کی درآمد بند کر دی جائے----- اگر بند کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم محدود تو کی جائے یا ان پر اتنا بھاری درآمدی ٹیکس لگایا جائے کہ اس کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ اور لوگ اپنے ملک کی بنی ہوئی اشیاء کو خریدنے اور پسند کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

میٹنگ میں میں نے دوسرے تاجروں سے ان کی مشکلات سنیں۔ ان مشکلات کے حل کے متعلق سوچا گیا۔ چھوٹی چھوٹی تقریروں کے بعد کافی دیر ایک ایک نقطے پر بحث ہوئی پھر اپنی اپنی ڈیمانڈز سامنے رکھی گئیں۔ جنہیں اکٹھا کر کے ریزولوشن کی صورت میں پاس کیا گیا۔

یہ مطالبات حکومت کو پیش کرنا تھے۔ کاغذی صورت میں مطالبات انجمن سیکرٹری کو دے دیئے گئے۔

میٹنگ تین گھنٹے ہوتی رہی، ہر موضوع پر کھل کر بات ہوئی اور شہر کی بڑی بڑی صنعتوں کو حکومت کا تحفظ ملنے کا مطالبہ کیا گیا۔

میٹنگ ختم ہونے کے بعد بھی لوگ بیٹھے رہے۔ گپ شپ لگنے لگی احوال پرسی ہوئی ..... اپنی اپنی مصروفیات کا بتایا جانے لگا۔

مجھ سے ہارون مجید نے پوچھا "آج کل کہاں رہتے ہیں آپ کبھی نظر نہیں آتے۔"

میں مسکرا دیا "جب نظر آنا ہوتا ہے آجاتا ہوں"

"فیکٹری کیسی جا رہی ہے"

"ایک دم فسٹ کلاس"

"تم نے کام کافی بڑھا لیا ہے" معمر صادق حسن جو حسن ٹیکسٹائل ملز کے مالک تھے بولے۔

"جی خدا کا شکر ہے" میں نے انکساری سے جواب دیا۔

"رحمان ڈوگر نے جو پودا لگایا تھا۔ اس کا پھل اب مل رہا ہے۔ وہ زندہ ہوتے تو ....." رفیع احمد جو فارمیکا کی فیکٹری لگا رہے تھے بولے۔

رحمان ڈوگر ..... رحمان ڈوگر ..... رحمان ڈوگر .....

میرے اندر شور مچ گیا ..... میں سخت مضطرب نظر آنے لگا۔ رحمان ڈوگر کے حوالے سے مجھے بہت کچھ یاد آگیا۔

بہت کچھ یاد آگیا۔

بہت کچھ

جسے میں ہر لمحہ بھولنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

میں ذہنی طور پر کچھ اپ سٹ سا ہو گیا۔ پرانے اور معمر صنعت کار رحمان ڈوگر کی باتیں کرنے لگے تھے۔ شاید یہ لوگ مجھے ایسوسی ایشن کا صدر ہونے کے باوجود صنعتکار تسلیم نہ کر سکے تھے۔

بات بھی تو ٹھیک تھی۔ میں کہاں کا صنعت کار تھا۔ یہ تو رحمان ڈوگر ہی کی صنعت تھی۔ انہی کا کاروبار تھا۔ میں تو اس میں زبردستی الجھا دیا گیا تھا۔

زبردستی

شاید نہیں

میں ادھیڑ بن میں مبتلا ہو گیا۔ اپنا بریف کیس اٹھایا اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس" تمین جنجوعہ نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے گھر ضروری کام ہے....."

"ہوں"

میں کسی سے مصافحہ ..... کسی کو سلام اور کسی کو سر کے اشارے سے سلام کرتا باہر نکل آیا۔

باہر رات اتر آئی تھی۔ آسمان ٹھٹھرا ہوا تھا۔ اور ستاروں کے دل دھڑک رہے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹیں سیاہ ہو رہی تھیں اور سیاہی کے حوالے سے ستارے زیادہ ہی چمک رہے تھے۔

میری گاڑی گیٹ کے قریب ہی تھی۔ میں عبدالرحیم کو ساتھ نہیں لایا تھا۔ لیکن اس وقت جو اضطراب مجھ پر حاوی تھا ..... گاڑی چلانے میں کچھ مشکل بھی پیش آسکتی تھی۔

"عبدالرحیم کو ساتھ لانا چاہئے تھا" میں نے دل میں کہا اور گاڑی کھول کر سیٹ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ بریف کیس میں نے پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔

آج میں نے پکی نیت کی ہوئی تھی۔ کہ ڈوگر ہوسپٹل جو میں بنوا رہا ہوں اس کے متعلق تاجروں کو بتاؤں گا۔ اور اس کے لیے ان سے تعاون اور مدد کی اپیل کروں گا۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کی مالی مدد سے میں یہ ہوسپٹل جلدی مکمل کر لوں گا۔

"اسے مکمل کر کے شاید مجھے سکون نصیب ہو جائے" میں یہی سوچا کرتا تھا۔"

اور

اسی لیے ان لوگوں سے آج مدد و تعاون کی اپیل کرنے والا تھا۔

لیکن

رحمان ڈوگر کا تذکرہ جس انداز سے ہونے لگا تھا ..... میں بے چین ہو گیا تھا۔ یوں لگنے لگا تھا جیسے میں رحمان ڈوگر کی وصیت کے مطابق اس کاروبار کا مالک نہیں بنا ..... بلکہ میں نے یہ سب کچھ غصب کیا ہے اڑایا ہے۔ ناجائز طور پر مالک بن بیٹھا ہوں۔

میں جیسے جلتے انگاروں پر قدم رکھے ہوئے تھا۔ گاڑی کی آرام دہ سیٹ مجھے کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ اور مجھے پھریوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرے چاروں طرف آگ پھیلی ہے۔ آگ میرے اندر بہہ رہی ہے باہر بہہ رہی ہے۔

اور

میں اس آگ سے فرار کی کوئی راہ نہیں پا رہا۔

میں نے گاڑی سٹارٹ کی .....

میرا جی گھر جانے سے گریزاں تھا۔ گھر ..... جہاں میں زیبی کو پیار کے ہلارے دے کر آیا

تھا۔

"زیبی میری منتظر ہو گی ---- وہ میرے پیار کا ادھار چکانے کا سوچتے ہوئے کسی مسرور نغمے کی طرح لہرا رہی ہو گی ---- آج وہ بہت خوش ہو گی۔ آج اس نے میرے سینے سے لگ کر برفانی سلوں کی بجائے شعلوں کی تپش اور حدت کا احساس پایا تھا۔ آج اسے میرے سینے میں اپنا وجود سمو کر خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ قبر کے ویران سناٹوں میں اتر رہی ہے ---- وہ خوش ہو گی ---- بہت خوش ----"

میں سوچتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔ لیکن میں اپنے آپ سے الگ ہو رہا تھا۔ بچھڑ رہا تھا ---- زیبی کو ٹوٹ کر پیار کرنے والا راجو کہیں ڈوبتا جا رہا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ گھر جاؤں۔

لیکن

میں گھر آ گیا۔ کھانے کی میز پر برتن رکھے ہوئے تھے۔ گگو لابی میں بیٹھا اپنے تعلیمی کھلونوں سے کھیل رہا تھا ---- باورچی خانے سے اشتہا کو تیز کرنے والی کھانوں کی مہک آ رہی تھی۔

پنکی آیا کی گود میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

"بابا آ گئے" گگو کھلونے چھوڑ کر میری طرف لپکا۔ پنکی اس آواز سے اٹھ گئی ---- آنکھیں جھپکاتی وہ آیا کی گود سے نکلی اور میری ٹانگوں سے چمٹ گئی۔

میں صوفے پر نڈھال ہو کر گر گیا۔ گگو میرے کندھے سے جھولنے لگا اور پنکی گود میں آ گئی۔

عبدالرحیم گاڑی سے بریف کیس نکال لایا ---- وہ پورچ ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ماما کہاں ہیں" میں نے بچوں کو سرد مہری سے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

زیبی بیڈ روم سے نکل آئی میں نے دیکھا ---- وہ کسی افسردہ نغمے کی ٹھہری ہوئی لے کی طرح تھی۔ اس کے چہرے پر چاندنی کے وہ عکس نہیں تھے۔ جو میں چھوڑ گیا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا ---- میں نے اس کی طرف

میں نظروں کا مفہوم سمجھ نہ پایا۔ لیکن ان نظروں سے کچھ محسوس ضرور کیا۔

میں اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا ---- زیبی شاید کھانا کھانے لگی۔

میں نے کپڑے بدل کر شلوار قمیض پہن لی۔ پاؤں پر چپل ڈالے اور گلے کے بٹن بند کرتے لابی میں آ گیا۔ ہیٹروں سے گھر خوب گرم تھا جرسی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

سردی ویسے بھی مجھے کم ہی لگتی تھی۔ افکار کی تپش سردی کا احساس ہونے ہی نہ دیتی۔

کھانا ہم دونوں نے ہی کھایا۔

"گگو بیٹے آپ نے نہیں کھانا" میں نے بچے سے پوچھا۔

"کھا لیا" وہ کھلونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں میز پر آ گیا زیبی بھی بیٹھ گئی۔

ہم دونوں نے بہت کم باتیں کیں ---- زیبی کچھ سوچوں میں ڈوبی تھی۔

رات وہ میرے پہلو میں لیٹی تو پہلی بار مجھے برف کی سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

میں نے اس کی طرف کروٹ بدل کر پوچھا "کیا بات ہے زیبی۔ بڑی چپ چپ ہو"

اس نے میری طرف دیکھا ---- بھرپور نظروں سے۔

"ہوں" میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

وہ کچھ نہ بولی ---- میں اپنی پریشانی کو بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ بے حد اداس تھی۔

میں نے بار بار پوچھا ---- تو وہ بستر سے اٹھی ---- اور الماری کی طرف گئی۔ میرے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال لائی۔

لفافہ دیکھتے ہی میرا سر چکرا گیا۔

یہ شکیل کا خط تھا۔ وہی کئی برس پرانا خط ---- جو فائل سے نکلا تھا۔ اور اب میرے کسی کوٹ کی جیب میں تھا۔

وہ لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "آپ کے کوٹ کی جیب سے یہ خط نکلا ہے۔ شکیل نے کس ڈرامے اور اس کے ڈراپ سین کا لکھا ہے۔ آپ کی نوکری سے اس کا کیا تعلق ہے۔" اس نے مجھ سے براہ راست سوال کیا تھا۔

میرے من میں چور تھا ---- میں یکدم کوئی جواب نہ دے سکا۔

"جب سے میں نے یہ پڑھا ہے۔ سخت پریشان ہوں۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہ کچھ چھپا رکھا ہے۔"

وہ چپ ہو گئی۔

میں نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا ---- زیبی کچھ اور مشکوک ہو گئی۔

وہ مجھ سے بار بار پوچھنے لگی ---- جب تک میں اسے کچھ بتاؤں گا نہیں گی ---- میں جانتا تھا۔

لیکن

اسے کیسے بتاتا ----

کیا لمحہ آغاز کو گرفت میں لینے کا وقت آگیا تھا؟
پر اس سے کیا ہو گا۔
زیبی اس خط کی رہنمائی میں میرے دل کی کال کوٹھڑی کے بند دروازوں کو پیٹ رہی ہے
----- میں چاہوں بھی تو اب یہ راز نہیں چھپا سکوں گا۔
ہاں

یہ

راز

جو میری زندگی کا کھلا ورق ہے۔
میں اب مستور نہیں رکھ سکوں گا۔
لیکن
لیکن
لے ----- کن -----؟

○ ☆ ○

سات آٹھ برس پہلے میں کھلنڈرا اور شوخ نوجوان تھا۔ بی اے فائنل میں تھا۔ ذہین بہت تھا۔ پڑھائی کی طرف توجہ کم ہی دیتا تھا۔ پھر بھی ہر سال اچھے نمبروں پہ پاس ہونے کی ضمانت امتحان سے پہلے ہی دے دیتا تھا۔ ان دنوں مجھے صرف دو شوق تھے۔
ایک کرکٹ کھیلنا

اور

دوسرا زیبی کے گھر جانا
شہر کے ایک گنجان آباد بازار کے عین درمیان سے چوڑی پختہ اینٹوں والی گلی نکلتی ہے۔ اس گلی کے اندر چھوٹی چھوٹی گلیاں آکر کھلتی ہیں۔ اس بڑی گلی کی حیثیت سربراہ کی سی ہے۔ جو چھوٹوں کو سمیٹے ہوتا ہے۔ نمبر تین گلی ہماری ہے۔ اس میں دائیں ہاتھ کا مکان ہمارا ہے۔ ہماری گلی بڑی گلی سے قدرے تنگ ہے۔ لیکن یہ بھی پختہ اینٹوں کی بنی ہے۔ اس گلی کے دونوں سروں پر نالیاں ہیں جو مکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بہتی ہیں' اور جن میں اکثر مکانوں کو صاف کرنے کے بعد کوڑا کرکٹ پھینک دیا جاتا ہے۔ اور جن میں ہمیشہ ہی سلیٹی رنگ کا ملغوبہ سا بہتا رہتا ہے۔

گلی کے دونوں طرف ڈیڑھ منزلے اور دو منزلے اور کہیں تین منزلے مکان ہیں۔ کچھ بے حد پرانے ----- کچھ سال ہا سال پرانے اور کچھ چند سال پرانے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگوں کی یہ آبادگاہ صدیوں پرانی ہے۔ کیونکہ کئی مکانوں کی بنیادی دیواروں میں چھوٹی پتلی اور زمانوں پرانی اینٹیں اب بھی نظر آتی ہیں۔

ہمارا مکان بھی خاصہ پرانا تھا۔ شاید میرے دادا نے بنوایا تھا۔ یا اس سے پہلے ان کے دادا یہاں کچی پکی کوٹھڑیاں بنا کر آباد ہوئے تھے تو اسی محلّہ میں آباد ہوئے تھے۔
گلیوں میں مکان ساتھ ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ اخوت اور بھائی چارے کی منہ بولتی مثال ہوتے ہیں۔ آج کل کی کوٹھیوں کی طرح الگ تھلگ نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے سے مربوط ---- ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔ انسان نے تعمیر کا یہ طریقہ جب وضع کیا ہو گا۔ تو

ذہنوں میں رفاقت اور محبت کے جذبات ضرور ہوں گے۔

لیکن

انسان ارتقاء کی طرف مائل پرواز ہے۔ اپنے اصول اپنے طریق خود ہی توڑتا اور وضع کرتا آیا ہے۔ ان گلیوں سے نئی نسل نکل رہی تھی الگ تھلگ بنی کوٹھیوں میں منتقل ہو رہی تھی ---- اس ہے۔ ان کے ذہنوں میں رفاقت اور بھائی چارے کے جذبات کی شکل مسخ ہو کر نئی بن رہی تھی۔ لیکن کچھ لوگ اپنی پرانی قدروں سے چمٹے تھے۔ اور نقل مکانی گوارہ نہ تھی۔ انہی مکانوں کو مرمت کیے جا رہے تھے۔ ان میں اضافے کر رہے تھے۔ چونے گارے کی جگہ سیمنٹ کے پلستر اور ننگی اینٹوں کی جگہ ماربل اور چپس کے فرش ڈال رہے تھے۔

لیکن

ان دیواروں ان چھتوں اور ان دروں کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے جن میں ان کی زندگیوں کے بھرپور دور گزرے تھے۔

زیبی کی امی بھی میری ماں کی طرح ہی اپنی دنیا بسائے تھیں۔ اس طرح کے کئی لوگ تھے۔ ہمارے گھر کے عین سامنے چچا خیر الدین تھے۔ بغلی گھر میں محمد رفیع تھے ---- ساتھ والا گھر چند سال ہوئے نئی نسل کے کسی نئے ذہن نے بیچ دیا تھا ---- اب وہ گلبرگ کے ایک پاش علاقے میں رہ رہے تھے۔ گلی کافی لمبی تھی۔ آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ اس گلی سے مجھے بھی پیار تھا ---- کہ میں نے اپنے بچپن اور جوانی کے دن یہاں گزارے تھے۔

زیبی کا گھر ہمارے گھر کے قریب تھا۔ درمیان میں وہ گھر تھا جو بک گیا تھا۔ اور جس میں جالندھر سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ آگئے تھے۔ کئی برس یہ لوگ ایک کوٹھڑی میں رہتے رہے تھے۔ اب چھابڑیوں سے دکان تک پہنچے تھے۔ اور کوٹھڑی سے نکل کر اس مکان میں آگئے تھے۔ ہمارے اور زیبی کے گھر میں صرف یہی گھر حائل تھا۔

بچپن میں ہم لوگ چھتوں پر سے ہی ایک دوسرے کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔ گرمیوں کی کڑکتی دھوپ میں درمیانی دیواریں پھلانگنا تو ہم سب بچوں کا محبوب مشغلہ تھا ---- ان دنوں ہمارے برسوں پرانے ہمسائے اس گھر میں رہتے تھے۔ اس لیے چھتوں پر چھلانگیں لگانے اور رگڑ رگڑ دوڑے پھرنے پر ڈانٹا تو کرتے تھے۔ لیکن منع نہیں کیا کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے غم چھوٹی چھوٹی خوشیاں سانجھی ہوتی تھیں۔ کبھی کسی پر کوئی افتاد آن پڑتی۔ تو ہر کوئی یہی محسوس کرتا کہ افتاد اسی پر آئی ہے۔ خوشی کا موقعہ ہوتا تو سب خوش ہو کر شریک ہوتے۔ محلے کی کسی بیٹی کی شادی تو سب سے اہم معاملہ ہوتی۔ ایک دوسرے سے ناراضگی ہو یا خفگی ---- بیٹی کی شادی میں سب یوں شامل ہوتے تھے۔ جیسے اپنی ہی بیٹی کی شادی ہو ---- ہر کوئی بڑھ بڑھ کر حصہ لیتا۔ صبح

دیکھا نہ شام ---- کام کے لیے پیش پیش رہتا۔

محلے میں دشمنیاں بھی چلتی تھیں ---- کھاتے پیتے گھرانوں سے رشک بھی کیا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے والے مہمانوں پر نظر بھی رکھی جاتی تھی۔ کہ کون آیا کون گیا۔ سامنے والی لائن کے چوتھے گھر میں رہنے والی سکی پھپھی رحمتے کا گھر جب سے اس کی بیٹیاں جوان ہوئی تھیں مشکوک بھی ہو گیا تھا۔

بچوں پر سے اکثر لڑائیاں بھی ہوتی تھیں۔ دوسری منزل کی کھڑکیوں سے عورتیں آدھے دھڑ نکال نکال کر ایک دوسری سے لڑا کرتی تھیں آنکھیں مٹکا مٹکا کر ایک دوسرے کو تکتی تھیں ---- اور پر اسرار سی ہنسیوں کو اپنے دوپٹوں کی لپیٹ میں لے لیا کرتی تھیں۔

خیر یہ تو انسانی فطرت ہے جس کے چھوٹے چھوٹے مظاہرے۔ گلی محلے میں ہوا ہی کرتے تھے۔ پھر بھی مجموعی طور پر سب ایک دوسرے کے خیر خواہ تھے ---- اور خوشی کے موقعوں پر چوک جائیں تو جائیں۔ غمی کے موقعہ پر سب اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

ہمارا ڈیڑھ احاطے کا مکان ڈیڑھ منزلہ ہے نچلی منزلہ پر تین کمرے کوٹھڑی باورچی خانہ' اور غسلخانہ ہے۔ گلی کے سرے پر بارہ فٹ چوڑی اور اٹھارہ فٹ لمبی بیٹھک ہے۔ جسے اب میرے بھائی ڈرائنگ روم کہتے ہیں۔ کہ اس میں ڈرائنگ روم کے لوازمات بھر دیئے گئے ہیں۔ قالین پردے فوم کے صوفے ڈیکوریشن پیس شیشے کی میزیں اور کونوں میں چینی کے بڑے بڑے گلدان رکھ دیئے گئے ہیں پچھلے تینوں کمرے بیڈ روم ہیں۔ اوپر بھی دو کمرے ہیں اور سامنے کھلا صحن ہے جس کی چھ فٹ اونچی دیوار گلی کی طرف ہے۔ اس دیوار میں گلی میں جھانکنے کے لیے چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں لگی ہیں۔

پچھلا صحن کافی بڑا اور کھلا ہے۔ اس میں سرخ سرخ اینٹوں کا فرش ہوا کرتا تھا۔ اینٹوں کے کنارے سبز سبز سیمنٹ کی ٹیپ ہوا کرتی تھی۔

میری بہنیں فرش کو برشوں سے رگڑ کر دھویا کرتی تھیں۔ اینٹیں سرخ سرخ نکل آتیں۔ تو یہ فرش بہت بھلا لگتا تھا۔ دو کمرے سائیڈوں پر تھے ایک سامنے تھا۔ دائیں ہاتھ باورچی خانہ تھا اس سے ملحق غسلخانہ ساتھ ہی اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں ---- اور ادھر ہی ڈیوڑھی تھی۔

اس گھر میں ہم چھ بھائی بہن رہتے تھے۔ رانی مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی ہے۔ قمو ڈیڑھ سال چھوٹی' زوبی اور قمو میں اللہ جانے پانچ سال کا وقفہ کیسے آگیا تھا۔ زوبی سے چھوٹے دونوں بھائی جو اور ناجا تھے۔ ان کے نام منظور اور نواز تھے۔ لیکن پیار سے یہی پکارے جاتے تھے۔ جیسے میں راج تھا لیکن کسی نے کبھی یہ نام نہ پکارا تھا۔ ہمیشہ راج' راجو اور راجہ ہی رہا۔

میرے اباڈی سی کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ بی اے اس زمانے میں کیا تھا جب گلی کے

لڑکے میٹرک تک بھی نہ پہنچ پاتے تھے۔ لیکن بی اے کر کے بھی کلرک ہی بھرتی ہوئے ----- شاید ان دنوں لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ ہی قناعت پسند تھے۔ جو روزگار کے بہتر ذرائع تلاش کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

میرے ابا اونچے لمبے قد کے گرانڈیل آدمی تھے۔ چہرہ گلابی چائے کی طرح ہمیشہ گلابی رہتا تھا ----- بہت خوبصورت اور بڑے رعب داب والے تھے میری امی بھی سرخ و سپید ہیں۔ کشمیری خون ان کی رگوں میں ہے کشمیر ہم لوگوں نے دیکھا تو نہیں۔ لیکن اس کا حسن ضرور چرایا ہے۔ ہم سب بہن بھائی بھی گورے چٹے اور اچھے خاصے خوبصورت ہیں۔

میں تو شاید سب بہن بھائیوں سے زیادہ ہی صحت مند اور خوبصورت تھا۔ میرا قد ابا کی طرح تھا۔ رنگت ان کی طرح گلابی نہیں سنہری سی ہے۔ شاید امی پر گئی ہے ----- میری آنکھیں لوگ کہتے ہیں کہ بے حد خوبصورت ہیں۔

شاید اس خوبصورتی کا احساس مجھے بھی تھا ----- اور لوگوں کو بھی اسی لیے سکول اور کالج میں جب بھی کوئی ڈرامہ ہوتا مجھے فوراً ہیرو چن لیا جاتا ----- میں کئی ڈراموں میں کامیاب اداکاری کر چکا تھا۔ یوں مجھ میں اپنی صفات کے جوہر کھلے تھے۔ میں اپنے مردانہ حسن وجاہت' و اداکاری کے وصف سے واقف تھا ----- اس لیے کبھی کبھی بننے اور اترانے بھی لگتا تھا۔

رانی مجھ سے چڑ جاتی۔ "بڑے ہیرو بنے پھرتے ہو ----- ابا کو پتہ چلا تو ساری اکڑ نکل جائے گی۔"

میں اس سے ڈرتا کب تھا۔ ڈیڑھ سال ہی تو بڑی تھی۔ بچپن میں تو اس کی دھونس اور مار کٹائی سہہ جاتا تھا ----- اب تو میں اس سے بالشت بھر اونچا تھا ----- جسم میں بھی مضبوط و توانا تھا۔ سینہ اکڑا کر کہتا

"باز آجا رے ----- میرے منہ نہ لگ ----- نہیں تو -----"

میں سچ مچ ہیرو بن جاتا۔

"نہیں تو کیا کرو گے۔" وہ اور چڑ جاتی۔

"وقت آنے پر بتاؤں گا" میں کھلکھلا کر ہنس دیتا ----- رانی بھی ہنس دیتی ----- میں اور رانی بہت لڑتے تھے۔ لیکن ہم میں پیار بھی بہت تھا ----- ابا کی ڈانٹ سے وہ ہمیشہ ہی مجھے بچا لیا کرتی تھی۔

قمو مجھ سے چھوٹی تھی اس لئے میں اس پر رعب ڈالا کرتا تھا۔

"قمو اٹھ میرے کپڑے استری کر۔"

"میرے جوتے پالش کر۔"

"میرا بیٹ لا دے۔"

"میری شلوار کا پائنچہ سی دے۔"

وہ میرے سارے کام خوشی سے کر دیتی تھی۔ ہاں زوبی چونکہ چھوٹی تھی اس لیے امی کی لاڈلی تھی۔ اس پر میں رعب نہیں جما سکتا تھا۔ کہ اماں گرج کر مجھے لعن طعن کرنے لگتیں۔

مجو اور ناجا تو کافی چھوٹے تھے۔

کتنا پیارا گھر تھا ----- کتنے پیار سے ہم سب بھائی بہن ماں باپ کی شفقتوں تلے رہتے تھے ----- ابا کے رعب اور دبدبے کے باوجود گھر کی فضا پرسکون تھی۔

لیکن

وقت کے ساتھ ساتھ اتار چڑھاؤ بھی آتے رہتے ہیں۔ رانی ایف اے کے بعد گھر بیٹھ گئی تھی۔ قمو بھی جوان تھی ----- قمو کے رشتے اور رانی کی شادی کے لیے امی پریشان رہنے لگی تھیں۔ ابا کی آمدنی شاید اس بار کی متحمل نہ تھی۔ سفید پوشی کا بھرم تو رکھے تھے۔ شادی کا بار اٹھانا مشکل تھا۔ اس لیے اکثر امی اور ابا میں تکرار ہونے لگی تھی ----- رانی کا رشتہ تایا جی کے بیٹے سے تقریباً طے ہی تھا۔ ہاں شادی کا مسئلہ تھا۔

جب ایسی بحث و تکرار ہوتی تو میری بہنیں ڈر کر کونوں میں دبک جاتیں۔ اور میں بیٹ لے کر گھر سے نکل جاتا۔

○ ☆ ○

اباگھر پہ نہیں تھے۔ اور اماں چھوٹی پھپھو کے تیسرے بیٹے کی مبارک دینے گئی ہوئی تھیں ---- ایسا موقعہ کبھی کبھی ملتا تھا ---- کہ بائی کمان گھر پر نہ ہو۔

"راجو۔" رانی صحن میں آگئی۔

"ہاں۔"

"ہو جائے۔"

"کرکٹ۔"

بالکل۔"

"قمو کہاں ہے۔"

"اوپر کپڑے سکھانے کے لئے ڈالنے گئی ہے۔"

"قمو ---- اے قمو" میں نے قمو کو آواز دی۔

"کیا ہے" وہ تار پر کپڑے ڈالتے ہوئے بولی۔

"کرکٹ" میں نے کہا وہ کپڑے چھوڑ کر جنگلے پر جھک کر بولی۔

"میں بھی کھیلوں گی۔"

"آجاؤ۔"

"دو منٹ راجے تین چار کپڑے تار پر ڈال لوں ----"

"جلدی کر ابا نہ آجائیں۔"

رانی بولی "ابا چار بجے آئیں گے۔"

"آج تو چھٹی ہے۔"

"اسی لئے گئے ہیں۔"

"کہاں۔"

"تایا جی سے ملنے۔"

"گجرات۔"

"ہاں۔"

"پھر تو اپنے مزے ہو گئے۔ بلاؤ سب کو ----"

"سب کو ----" رانی نے آنکھیں نچائیں۔

"بھئی فیلڈنگ بھی تو کوئی کرے گا نا ----" میں اس کی آنکھوں کے اشارے پر مسکرایا۔

"زوبی جو ہے۔"

"میں بھی ہوں بھائی جان" تاجا امی کے کمرے سے نکل آیا۔

"اور میں بھی ----" مجو کتابیں پھینک کر صحن میں آگیا۔

"ابھی کم ہیں ----" میں نے مسکرا کر رانی کو دیکھا۔

"ہاں جی ---- جب تک زیبی نہیں آئے گی ---- فیلڈنگ ہو ہی نہیں سکتی۔"

"کیا شک ہے" میں نے بال ہوا میں اچھالا ---- رانی چند لمحے چپ ہو کر رہ گئی۔

"قمو سے کہو اسے آواز دے چھت پر سے۔"

"تم کہو۔"

"میں بلا لاتا ہوں" مجو ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔

"کہنا جلدی سے آجائے" رانی نے آواز دی ---- "اور سن ----"

"ہاں ----" وہ بھاگ کر جانا چاہتا تھا۔

"پھپھو کے سامنے کرکٹ کا نام نہ لینا۔"

"میں کوئی پاگل ہوں۔"

"تھوڑے سے تو ہو ---- پر خیر جاؤ ---- کہنا زیبی آپا کو رانی باجی بلا رہی ہیں"

"اچھا۔"

مجو دوڑ گیا۔

رانی نے میری طرف دیکھا ---- پھر شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے صحن کے کونے میں پڑے لکڑی کے تخت پر بیٹھ کر بولی "راج ----"

"ہوں۔"

"ایک بات پوچھوں۔"

"ہوں" میں تخت کے قریب آکر بال کو ہاتھوں میں اچھال اچھال کر پکڑنے لگا۔

"سچ سچ بتائے گا۔"

"ہاں۔"

"زیبی تجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"میں کانوں تک سرخ ہو گیا-----"

رانی نے میری طرف پھر شوخ نظریں اچھال دیں۔

"ہوں؟"

"ہوں۔" میں نے رانی کی نقل اتار دی۔

ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

پھر رانی نے ذرا پرے ہٹتے ہوئے میرے لئے جگہ بنائی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا-----

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بال کو اب بھی میں اچھالے جا رہا تھا-----

وہ رازداری کے انداز میں بولی "تجھے پتہ ہے"

"کیا۔"

امی کو بھی زیبی بہت اچھی لگتی ہے"

"امی نے کہا"

"نہیں کل امی اور ابا جی بڑی رازداری کی باتیں کر رہے تھے۔"

"تو نے سن لیں"

"ہاں ----- میں برابر والے کمرے میں جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"امی کہہ رہی تھیں -----"

"کیا؟"

"جا نہیں بتاتی۔"

"رانی پلیز-----"

"نہیں بتاتی -----" وہ ہنس رہی تھی ----- میں جان گیا تھا پھر بھی نہ جاننے کا بہانہ کرتے ہوئے مصر تھا-----

وہ ہنس چکی تو بولی "تیرے اور زیبی کے رشتے کی باتیں کر رہے تھے۔

"چل ہٹ جھوٹی کہیں کی"

"اللہ قسم-----"

تیرے رشتے کی باتیں کر رہے ہوں گے"

"وہ بھی کر رہے تھے"

"اچھا اب سمجھا----- ابا جی تایا جی کی خیریت اسی لیے پوچھنے گئے ہیں۔" میں زیبی سے ہٹ کر رانی کو چھیڑنے لگا----- فاضل بھائی بڑے تایا کے بیٹے تھے۔ اور رانی کے ساتھ ان کا رشتہ

شاید دادی اماں نے بچپن ہی میں طے کر دیا تھا۔ ابھی تک رشتہ باقاعدہ طور پر تو نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن
دونوں طرف سے پسندیدگی کے جذبات موجود تھے۔ شاید تایا جی فاضل بھائی کے نوکر ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بی کام تو کر لیا تھا۔ لیکن ابھی نوکر نہ ہوئے تھے۔

رانی میری چھیڑ چھاڑ پر سرخ ہو گئی۔ چھیڑ چھاڑی میں لڑائی بھی ہو گئی وہ چمک کر بولی "شرم نہیں آتی ----- پٹر پٹر باتیں کئے جا رہا ہے آلینے دے امی کو-----"

"کیا کرے گی۔"

"زیبی کے خلاف بھڑکاؤں گی انہیں-----"

یہ اس کا اوچھا حربہ تھا۔ جو وہ مجھ پر آزماتی تھی۔ یہ حربہ ہمیشہ ہی کارگر ہوتا تھا۔

میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور اس کی گردن میں اپنا مضبوط بازو ڈال کر جھولنے لگا۔

"اللہ گردن توڑ دے گا----- بازو ہیں کہ شہتریاں۔ پرے ہٹ-----"

"ناراض تو نہیں ہے نا۔"

"نہیں۔"

"ہنس۔"

"کھی کھی کھی-----" اس نے ہنسنے کی جیسے نقل اتاری۔ میں ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔

قمو کپڑے تار پر ڈال کر نیچے آ گئی۔ دھم دھم سیڑھیاں اتری تو میں نے اسے دیکھا۔

کتنی صحت مند کیسی ترو تازہ اور کتنی جوان تھی وہ ----- رانی کا نمبر بھی کاٹ گئی تھی۔ ایک لحہ کے لیے مجھے امی کی پریشانی کا احساس ہوا وہ حق بجانب ہی تھیں۔ ابھی تو رانی ہی کے سلسلہ میں بہت کچھ کرنا تھا۔ دوسری نے بھی اس طمطراق سے میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔

مجو واپس آ گیا۔

"زیبی آئی" رانی نے پوچھا۔

"نہیں" وہ منہ بنائے بولا۔

"کیوں" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہتی ہے۔ میں نہیں آتی" وہ بولا۔

"میں بھی نہیں کھیلوں گا-----" میں نے گیند پھینک دیا۔ تو مجو کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"آتی ہے بھائی جان آتی ہے" مجو مجھ سے لپٹ گیا۔ اور ڈیوڑھی سے زیبی ہنستی ہوئی اندر آ گئی۔

میں نے مجو کے گال پر پیار سے چٹکی کاٹی ----- ننھا شریر مجھے بھی بنانے لگا تھا-----

"اس نے کہا تھا بھائی جان" مجو نے زیبی کی طرف اشارہ کیا۔
"کیا؟" رانی نے پوچھا---- میں تو زیبی کو بس تکے جا رہا تھا----
"کہتی تھی۔ میں ڈیوڑھی میں چھپوں گی۔ تم کہنا نہیں آتی زیبی----"
مجو بولا----

رانی نے بڑھ کر زیبی کو بازو کی لپیٹ میں لے کر ساتھ لگا لیا۔
"ہمارا صبر آزمانا تھا"

رانی نے یہ بات کہتے ہوئے شوخی سے میری طرف دیکھا۔ زیبی کچھ شرما گئی---- اس کے سنہری گال سرخ ہو گئے---- اس نے حیا بار نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

زیبی میں ان دنوں میں بڑی تبدیلی پا رہا تھا۔ اب وہ مجھ سے کچھ کترانے لگی تھی۔ بات کرتے ہوئے لجا جاتی۔ آنکھوں میں اتنی چمک بھر گئی تھی کہ جب وہ میری طرف دیکھتی یوں لگتا ساری چاندنی اس کی سیاہ آنکھوں میں گھس آئی ہے۔

زیبی اور میں بچپن سے ساتھ کھیلے تھے۔ وہ بہت شوخ و شریر تھی۔ شرمانا تو اسے آتا ہی نہ تھا۔ مجھ سے لڑتی بھی بہت تھی۔ میری امی سے شکائتیں بھی لگانا اس کی ہابی تھی۔

میں ان کے گھر بے دھڑک جاتا تھا۔ وہ ہمارے گھر بے تکلفی سے آتی تھی۔ دنوں کی قید تھی نہ وقت کی---- وہ حساب میں کمزور تھی۔ میں اکثر اسے سوال سمجھایا کرتا تھا---- ہم گولیاں بھی کھیلا کرتے تھے۔ کرکٹ بھی---- لڑکیوں اور لڑکوں کی کھیلوں کا امتیاز نہ تھا۔ میں اکثر اس کے ساتھ گڑیاں کھیلتا تھا۔ اور وہ میرے ساتھ ہاکی' فٹ بال اور کرکٹ کھیلتی تھی۔
لیکن

اب وہ کچھ کچھ سمٹنے لگی تھی۔ پندرہ برس کی ہو رہی تھی---- شاید اسے کچھ شعور آ گیا تھا۔ احساس جاگ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے میری نظروں میرے جذبوں نے ہی اس کا شعور جھنجھوڑا ہو اور اس کے احساس کو جگایا ہو۔

زوبی مجو اور ناجا کھیلنے کے لیے مچلنے لگے۔ رانی زیبی سے باتیں کرنے لگی' قمو اس کے جوڑے کے متعلق پوچھنے لگی "کب بنوایا۔ بڑا پیارا ہے۔ رنگ تو بہت پیارا ہے"
میں نے بھی دیکھا ہلکے پستی رنگ کا پھولدار جوڑا۔ جو زیبی نے پہن رکھا تھا۔ نیا تھا۔ جوڑا خوبصورت تھا یا نہیں۔ ہاں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ زیبی ان کپڑوں میں بہت اچھی لگ رہی ہے۔
بچوں کے اصرار پر کرکٹ شروع ہو گیا۔
میں بیٹس مین تھا۔ قمو باؤلر تھی۔ رانی میرے سامنے کھڑی تھی۔ بیٹ ایک ہی تھا۔ اس لئے رانی نے کپڑے کا دھونے والا ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔ فیلڈر زوبی مجو ناجا اور زیبی تھے۔

پھر جو ہم سب نے اودھم مچایا۔ تو شور شرابے سے ہمسائے بھی بیزار ہو گئے۔ امی گھر پہ ہوتیں تو کون اتنا کھل کر کھیل سکتا تھا---- کرکٹ کے نام ہی سے وہ تو بیزار رہتی تھیں۔ انہیں تو میرا دوستوں کے ساتھ گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنا بھی ناگوار گزرتا تھا۔

ہمارا صحن اتنا بڑا تو نہ تھا۔ کہ کرکٹ کا میدان بن جاتا۔ پھر بھی رن بنانے اور ہٹ لگانے کے لیے کافی تھا---- کھڑکیوں کے شیشے اور امی کے کئی برتن ہم توڑ چکے تھے۔ امی جب گھر پہ نہ ہوتیں تو کھیل جما کرتا تھا۔

آج بھی ہم اتنا کھیلے کہ اور کسی کام کا ہوش نہ رہا۔ رانی کو کھانا پکانا بھی بھول گیا---- اور مجو کو سکول کا کام بھی---- قمو نے کپڑے تار سے نہ اتارے۔ ظاہر تھا امی نے آ کر سب پر برسنا ہی تھا۔

لیکن پرواہ کسے تھی----

○ ☆ ○

میں زیبی کو حساب کے سوال سمجھا رہا تھا۔ حساب کے معاملہ میں عقی کچھ غبی سی -----
اسلذر اور کلذر کے سوال تھے۔ میں کلیہ سمجھا رہا تھا۔

زیبی کو میں شروع ہی سے حساب میں مدد دیا کرتا تھا۔ اس سے بڑا بھائی امجد بھی مجھ سے انگریزی پڑھتا تھا۔ وہ اب فسٹ ایئر میں تھا اس کا ذہن بھی واجبی سا تھا۔ لیکن محنت کرتا تھا ----- دونوں بہن بھائی میرے پرانے شاگرد تھے۔ مجھے یاد نہیں میں نے کب سے انہیں پڑھانا شروع کیا تھا۔ گرمی کی چھٹیاں تو ان سے مغزماری کرتے گزرتی تھیں -----

اب زیبی کا میٹرک کا امتحان تھا۔ میں اسے باقاعدگی سے حساب کا مضمون پڑھا رہا تھا۔ امجد بھی انگریزی پڑھتا تھا۔ اسے پڑھانا مشکل نہیں تھا۔ لیکن زیبی -----

جانے ان دنوں اسے کیا ہو گیا تھا۔ جو کچھ بھی پڑھاتا دوسرے دن پوچھتا تو اسے پتہ ہی نہ ہوتا۔

زیبی کا گھر دو منزلہ تھا۔ ہمارے گھر سے نسبتاً اچھا تھا۔ کہ اس میں آٹھ کمرے تھے۔ ویسے بھی زیبی کے والدین کی مالی حالت ہم سے اچھی تھی۔ زیبی کے ابا جی چاولوں کے بیوپاری تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے انکی ہندو آڑھتیوں کے ساتھ شراکت تھی۔ ان کے جانے کے بعد آڑھت کی دکان انہیں کے حصے میں آئی تھی ----- آمدنی خاصی تھی ----- بڑا بیٹا شاہد بھی کاروبار میں لگ گیا تھا۔ اس سے چھوٹا واجد بھی تھرڈ ایئر میں فیل ہونے کے بعد کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔ زیبی کے ابا جی کا خیال تھا کہ اسے دوبئی بھجوا دیں ----- جب سے ہمارے محلے کے دو گھروں کے جوان دوبئی گئے تھے۔ اور سال دو سال ہی میں ان کے گھروں کی حالت بدل گئی تھی۔ الیکٹرک کی دنیا جہان کی چیزیں، گھروں میں آ گئی تھیں۔ ایسی چیزیں بھی جو اس محلے کے اکثر مکینوں نے دیکھی تک نہ تھیں ----- مسالہ پیسنے کی مشین جوس نکالنے کی مشین۔ فرج ریڈیو، ٹرانسسٹر اور ٹی وی جیسی چیزیں عام گھروں میں کب تھیں۔ فرج اور ٹی وی تو ان دنوں ہمارے پاس بھی نہیں تھا۔

یہ دونوں جوان سال میں جب ایک چکر لگاتے تو لدے پھندے آتے، محلے میں ان کی لائی ہوئی چیزوں کے چرچے ہوتے۔ ان کی آمدنی کا حساب لگایا جاتا اور دوبئی جانے کی خواہشیں ہر دل

میں مچلنے لگتی۔ واجد کو ابا میاں بھی دوبئی بھجوانے کے چکر میں تھے۔

زیبی کے گھر کا صحن ہمارے صحن سے قدرے تنگ تھا۔ کیونکہ چاروں طرف کمرے تھے۔ اوپر کی منزل پر باورچی خانہ تھا۔ اور کمروں کے آگے کھلی جگہ۔ میں یہیں بیٹھ کر زیبی کو پڑھایا کرتا تھا پھپھو کبھی باورچی خانے میں اور کبھی پرے بچھے تخت پر بیٹھ کر سبزی ترکاری بناتی رہتیں۔ کبھی چاول چنتیں اور کبھی دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرتیں۔

مجھے کبھی احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ تجربہ کار خاتون ہیں۔ اور اس طرح اپنی بیٹی کی نگرانی بھی کرتی رہتی ہیں ----- زیبی جوان ہو گئی تھی۔ احتیاط لازمی تھی۔ لیکن میں نے زیبی کو چاہنے اور ٹوٹ کر پیار کرنے کے باوجود کبھی کوئی اوچھی حرکت نہ کی تھی۔

یہی حال زیبی کا بھی تھا۔

چاہت تو ہمارے وجودوں سے لپٹی ہمارے ساتھ ہی پلی بڑھی تھی -----

میں کرسی پر بیٹھا تھا۔

دوسری پر امجد تھا۔

اور

زیبی چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ درمیان میں چھوٹی تپائی تھی جس پر کتابیں اور کاپیاں پڑی تھیں۔

"یہ کلیہ زبانی یاد کر لو" میں نے زیبی سے کہا۔

"مجھ سے نہیں ہوتا" اس نے کتاب پرے دھکیل دی۔

"کیوں۔"

"بس۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"کہہ جو دیا ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔"

"میں جو اتنا مغز کھپا رہا ہوں۔"

"تم کھپا رہے ہو نا۔"

"تمہارے لئے ہی تو -----"

"میں نہیں سمجھ پائی۔"

"دماغ حاضر رکھا کرو نا۔"

مجھے تاؤ آ گیا۔ جی چاہا کتاب اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں۔

"زیبی ----- مذاق تو نہیں ہے نا۔" امجد اپنی کاپی پر لکھتے لکھتے ہاتھ روک کر بولا۔ "اتنی

محنت سے تمہیں بھائی جان پڑھاتے ہیں اور تم -----"

"نہ پڑھائیں۔ مجھے نہیں آتا" وہ ضد میں آگئی۔

"زیبی -----" میں نے اپنا غصہ کنٹرول کر کے تحمل سے کہا۔

"ہوں۔"

"یہ امتحان میں سوال آگئے تو۔"

"نہیں کروں گی۔"

"فیل ہونے کے ارادے ہیں۔"

"میٹرک بھی نہ کر سکے گی" امجد نے طنز کیا۔

"کیسے نہیں کرے گی۔ میٹرک کیا اس نے تو بی اے کرنا ہے" میں نے جانے کس جذبے کے تحت کہہ دیا۔

"اوہ ----- بی اے" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور میں اس کے سفید دانتوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح ہنستے ہوئے کتنی پیاری لگ رہی تھی۔

"زیبی" پھپھو نے تخت پر بیٹھے بیٹھے ڈانٹ بھرے لہجے میں اسے پکارا۔

"جی امی۔"

"کیا ہو رہا ہے۔"

"پھپھو اتنی دیر سے سوال سمجھا رہا ہوں۔ اسے سمجھ ہی نہیں آتا" میں نے پھپھو سے کہا۔

"پھر میں کیا کروں" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"زیبی بیٹی۔ دھیان سے پڑھو۔ وہ بے چارہ اپنا وقت ضائع کر کے تمہیں پڑھانے آتا ہے۔"

"ہاں پھپھو۔ میرے امتحان سر پر آرہے ہیں----- میں نے بھی پڑھنا ہوتا ہے۔"

"بھئی ----- میں کیا کروں۔ مجھے یہ چکر سمجھ نہیں آتا' اسلذر کلذر سود در سود-----"

"حساب میں اتنی کمزور تھیں' تو یہ مضمون لیا ہی کیوں۔ تمہیں تو الجبرا بھی بالکل نہیں آتا۔ پاس کیسے ہو گی۔"

"ہو جاؤں گی۔"

"مذاق ہے نا----- بغیر پڑھے پاس ہو جاؤ گی۔"

"شرط -----؟"

"یہ کلیہ یاد نہ کیا تو یقیناً فیل۔"

"خدا نہ کرے۔"

کئی دنوں سے زیبی نے حساب میں دلچسپی چھوڑ رکھی تھی۔ مجھے فکر لگی رہتی۔ اگر اس نے یہی رویہ رکھا تو میٹرک کے امتحان میں لڑھک جائے گی۔

میں اس سے الجھنے لگا۔ زیبی کی امی پلیٹ میں مالٹے اور کنو رکھ کر لے آئیں۔ زیبی نے کتاب چارپائی پر پھینک دی اور بولی۔

"کھاؤ-----"

"پڑھو۔" میں نے زور سے کہا۔

"وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"عجب نالائق ہو۔ میں نے جھلا کر کہا۔

"جیسا استاد ویسا شاگرد" زیبی جھٹ سے بولی۔ پھپھو اور امجد مسکرانے لگے۔

میں غرایا "مجھے نالائق کہتی ہو۔"

"جی نہیں آپ نے شاگرد کی بات کی میں نے استاد کی" وہ شوخ ہوئی جا رہی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں جم جانے والی چاندنی کے سحر میں ڈوب گیا۔

"زیبی شاید میرے ڈوبنے کی کیفیت کو پا گئی ----- جلدی سے چارپائی سے اٹھ گئی۔

"کہاں" امجد نے پوچھا۔

"نمک دانی لے آؤں مالٹے نہیں کھانے-----"

"بس کھانے کی پڑی رہتی ہے تجھے-----"

"تو پڑھ پڑھ کر میدان مار لے۔"

"سر پھری سی ہے"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دونوں مسکرا دیے۔

زیبی نمک دانی لے آئی۔ کنو اور مالٹے چھیل چھیل کر وہ پلیٹ میں رکھنے لگی۔ چھلکے فرش پر ہی پھینکتی گئی۔

"عجب پھوہڑ لڑکی ہو" میں نے کہا۔

"کیوں۔"

"چھلکے سارے فرش پر پھینک دیئے۔"

"کہاں پھینکتی؟"

"عقل ہوتی تو ایک پلیٹ اور لے آتیں۔"

وہ کھسیانی سی ہو گئی۔ چھلے ہوئے کنو اور مالٹے پلیٹ میں رکھ کر میری طرف بڑھا دیئے۔

پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے مالٹے سے ایک ایک پھانک اتار کر نمک لگا لگا کر کھانے لگی۔

امجد اپنی کاپی لے کر اٹھ گیا۔

"کھاؤ نا" میں جو کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ زیبی کے کہنے پر مالٹا اٹھا کر کھانے لگا۔

"میرا ذرا جی نہیں چاہتا پڑھنے کو راجو ----" زیبی چٹخارے لیتے ہوئے مالٹا کھا رہی تھی۔ کھٹ مٹھا مالٹا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

"پھر چھوڑ دے پڑھائی" میں نے جل کر کہا۔

"نہیں چھوڑوں گی تو نہیں۔ امتحان تو ضرور دوں گی۔"

"فیل ہونے کے لئے۔"

"اللہ نہ کرے۔"

"پاس کیسے ہو گی۔"

"ہو جاؤں گی۔"

ہم دونوں مالٹے کھاتے رہے۔ امجد سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ پھپھو پالک کا ساگ بنانے لگیں۔

ہم دونوں اوٹ پٹانگ سی باتیں کرتے رہے۔

جانے زیبی نے کیا کہا ---- کہ میں بولا۔

"یہ بات ہے ---- تجھے پڑھنا ہی نہیں۔ تو کل سے میں نہیں آیا کروں گا۔۔۔۔"

وہ ایک دم گھبرا گئی ----

"نہیں راجو ---- تو ضرور آیا کر ---- نہیں تو ---- نہیں تو ----"

"نہیں تو کیا ----" میں نے کاپی پر لکیریں کھینچتے ہوئے اس کی طرف یونہی دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں جادو تھا ---- میری نظریں اسیر ہو گئیں۔

"میں پڑھا کروں گی راجو ---- اب تنگ نہیں کروں گی ---- لیکن یہ نہ کہنا کہ نہیں آیا کروں گا" اس نے بے باک سچائی سے کہا۔

"اچھا۔"

میں نے بھی مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ زیبی کے ہاں جائے بنا میں رہ بھی کیسے سکتا تھا۔ ایک دو دن نہیں یہ تو برسوں کی روٹین تھی ---- زیبی تو وہ نقطہ تھی جس کے گرد میری ہستی گھومتی تھی۔ محور تھی ---- جس کے چاروں سمت آنکھیں بند کئے اندھا دھند گھوم رہا تھا۔

اور بات ہے کہ اپنے ان جذبوں کی شدت کا پوری طرح اس وقت احساس نہ تھا۔

جذبے تھے ضرور۔ لیکن بے نام تھے۔

○ ☆ ○

"راجو۔"

"ہاں۔"

"پکچر دکھاؤ گے۔"

"کیا؟"

"بڑی اچھی فلم لگی ہے۔"

"تجھے کس نے کہا۔"

"کیوں؟ ---- مجھے پتہ نہیں چل سکتا کیا ----"

"مار کھائی ہے فلم کا نام لے کر ----"

"لے چلیں نا بھائی جان" رانی کے ساتھ قمو بھی منت کرنے لگی۔ ان دنوں فلم لڑکیوں کو دکھانا کم از کم ہمارے ہاں بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اباجی سے تو خیر اجازت لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہاں ان کی عدم موجودگی میں میں کبھی کبھی امی سے لڑ جھگڑ کر یا منت سماجت کر کے رانی اور قمو کو فلم دکھا لایا کرتا تھا۔ امی کے سامنے تو میں خوب تقریر جھاڑ لیا کرتا تھا "امی زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری میں قید کر کے آپ انہیں بالکل جانور بنا دیں گی۔ نئی تہذیب سے آشنائی بھی ضروری ہے۔ آپ کو کیا پتہ ان کی آئندہ زندگی کیسی ہو گی۔ کیسے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑے گا۔ یہ نہ ہو لوگ انہیں دقیانوسی اور قدامت پسند سمجھ کر لفٹ ہی نہ دیں۔"

کبھی کبھی تو امی پر واقعی اثر ہوتا۔ وہ چپ ہو جاتیں۔ قمو رانی کو فلم دیکھنے کی اجازت دے دیتیں۔

لیکن

جب موڈ خراب ہوتا۔ یا کسی اور بات کا غصہ ہوتا۔ تو میری وہ گت بناتیں کہ مجھے کان لپیٹ کر بھاگنا پڑتا۔ ایسے وقت امی کو ذرا احساس نہ ہوتا کہ میں جوان لڑکا ہوں۔ قد بت میں ان سے بالشت بھر اونچا ہوں۔ وہ مجھے یوں کوسنے دیتیں ---- جیسے میں چار پانچ سال کا ناسمجھ بچہ

ہوں۔

میں بھی تو اس وقت نا سمجھ بچہ بن جاتا تھا۔ چپ چاپ ڈانٹ سہ لیتا تھا۔ رانی اور قمو دروازے کے پٹ پیچھے سے سر نکال نکال کر مجھ پر ہنستی تھیں۔

پکچر واقعی بہت اچھی لگی ہوئی تھی۔ چرچے بھی بہت تھے۔ ہیں واجد اور امجد دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

رانی اور قمو منت سماجت کرنے لگیں۔

"اباجی کو کون پٹو ڈالے گا" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہائے اللہ ---- اباجی اور امی تو جا رہے ہیں۔"

"کہاں۔"

"ملتان۔"

"کب۔"

"کل صبح کی گاڑی سے۔"

"کیوں۔"

"چھوٹی خالہ کے دیور کی تعزیت کرنے۔"

"اوہ ہاں۔"

"گھر میں ہوتے ہو۔ اور کسی بات کی خبر نہیں ہوتی" رانی نے ڈانٹا۔۔۔۔

"خدا قسم مجھے بالکل خبر نہیں" میں نے کہا۔

"کل چلیں گے نا۔"

"فلم دیکھنے۔"

"ہاں۔"

"بالکل ---- تین چار دن تو گھر میں مابدولت کی حکمرانی ہوگی۔ کہو تو روز ایک پکچر دکھا دیں۔"

"اونہ ----" قمو نے منہ بنایا "ایک پکچر کے لئے پیسے بمشکل نکلیں گے۔"

"ہوں ---- پیسوں والا معاملہ تو زیر غور ہی نہ آیا۔ مابدولت کے۔"

"امی چار دن کا گنا چنا خرچہ دے کر جائیں گی۔"

"چلو ایک دن فاقہ کریں گے ---- اور پکچر کی عیاشی کریں گے۔"

"فاقہ کیوں دال پکالیں گے۔"

"نہ بھئی۔ دال حلق سے نہیں اترے گی۔"

"فاقہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن دال نہیں کھائی جائے گی۔"

"رانی بیگم۔ ہم کشمیری لوگ ہیں۔ خالص کشمیری۔ کھائیں تو ڈٹ کے نہ کھائیں ---- تو خیر ہے۔"

ہم تینوں بہن بھائی مل کر پروگرام بنانے لگے۔

"کل پکچر کا پروگرام پکا۔" میں نے کہا۔

"کون کون جائے گا۔" قمو نے پوچھا۔

"میں رانی۔ تم اور ----۔" میں رک گیا۔

"زوبی؟۔" وہ بولی۔

"نہیں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا "زوبی ابھی چھوٹی ہے۔ زوبی نہ مجو نہ ناجا۔"

"تو پھر اور کون؟" رانی سمجھ گئی شوخی سے مسکرائی۔

"زیبی ----" قمو نے ہنس کر کہہ دیا۔

"ہاں۔" میں بولا۔

"لیکن ---- اس کی امی سے اجازت کون لے گا۔" رانی سوچنے لگی۔ "اب وہ زیبی کو یونہی کہیں آنے جانے نہیں دیتیں۔"

"ہمارے گھر کی ممانعت نہیں" میں بولا۔

"لیکن فلم ----" رانی نے کہا۔

"ہاں یہ مسئلہ ہے۔" میں سوچ کر بولا۔

"تو کیا ضروری ہے زیبی بھی جائے" قمو سمجھی پروگرام کینسل ہو رہا ہے۔"

"بالکل" میں نے کہا دونوں میری راز دار تھیں نا۔ میں ان سے دل کی بات کھل کر کر لیتا تھا۔ میں نے قمو کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولا

"وہ نہ گئی تو کوئی بھی نہ جائے گا۔"

"آئے ہائے" رانی نے بڑے پیار سے مجھے دیکھ کر منہ بنایا۔

"آئے ہائے" میں نے بھی ہنس کر اس کی نقل اتاری۔

"میاں مجنوں" رانی پیار سے بولی "تم تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدہ ہوتے جا رہے ہو ----"

"کیا نہیں ہونا چاہئے"

"بھئی اللہ جانے۔ کیا حالات ہوں۔ زیبی کی امی کو اس کی شادی کرنے کی لگتا ہے بہت جلدی ہے۔ جہیز ابھی سے بننا شروع ہو گیا ہے"

"تو کیا ہوا"

"جناب ابھی کس قابل ہوئے ہیں۔"

"پڑھ رہا ہوں ---- پڑھ لکھ کر ہی قدموں پر کھڑا ہوؤں گا"

"خدا کرے ----"

"ایم اے کرنے میں ابھی دو سال ہیں ----"

"ہاں وقت تو ابھی ہے۔ ویسے زیبی بھی ایف اے تک تو ضرور پڑھے گی"

"میٹرک میں لڑھک نہ گئی تو ----"

"اتنی کند ذہن بھی نہیں ---- صرف تمہیں ستاتی ہے۔ حساب میں کمزور ہے۔ لیکن پاس ہو جاتی ہے ----"

ہم باتیں کرنے لگے زوبی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ پکچر کے لیے اس کا بھی جی للچایا۔ لیکن مجھ سے ڈرتی تھی۔ بڑا بھائی جو تھا ---- وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے خود ہی اسے قریب بلایا۔ اس کے سر پر بزرگوں کی طرح ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "ننھی بی جب آپ تمو جتنی ہو جائیں گی نا تو آپ کو بھی فلم دکھاؤں گا۔ میرا ذمہ ----"

وہ حسرت سے مسکرائی ----

"جا چائے بنا لا" رانی نے اسے آرڈر دیا۔ وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ مجھے اس کی سعادت مندی پر پیار آگیا۔

ہم چھ بہن بھائی تھے۔ چھوٹوں پر بڑوں کی عزت و احترام تھا یہ سب ہماری امی کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

کتنے پرسکون دن تھے وہ ---- چھ بچوں کی فوج ظفر موج گھر میں تھی اور گھر کا نظام سنجیدہ سے سلیقے سے چل رہا تھا ---- ابا جی کی تنخواہ کافی تو نہ تھی۔ لیکن ناکافی بھی نہیں تھی ---- مہنگائی ان دنوں اس طرح کمر توڑ نہ تھی۔ جس طرح اب ہے۔ کچھ زندگی کی قدریں بھی مختلف تھیں۔ اتنا مصنوعی پن نہیں تھا۔ قناعت بھی سکون کی ایک حد تھی ---- بچوں کو والدین کی مالی حالت کا شعور تھا۔ حد سے بڑھنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا ننھی منی خوشیاں جو ہماری مالی حدود میں آتی تھیں۔ ہم انہیں ضرور سمیٹا کرتے تھے۔

پکچر کا پروگرام بن گیا۔ زیبی کا مسئلہ تھا۔ وہ میں نے حل کر لیا۔ "واجد اور امجد نے بھی پکچر دیکھنی ہے۔"

"پھر۔" رانی بولی۔

"تم زیبی سے کہو ان کے ساتھ وہ بھی آجائے۔ سب اکٹھے ہی دیکھیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

دوسرے دن صبح کی [illegible] ن سے میں ابا جی اور امی کو ملتان کے لئے سوار کر کے آیا۔ امی نے جاتے وقت چار دن کے خرچ کے واقعی گنے چنے پیسے رانی کو دیئے۔

میں مسمی صورت بنا کر بولا "امی کچھ ادھر بھی عنایت کر دیں"

امی جو ملتان جانے کے مفت کے خرچے سے کچھ الجھی ہوئی تھیں جھلا کر بولیں۔

"تیرا ہاتھ تو پھیلا ہی رہے گا۔ خدا جانے کب خود کمانے کے قابل ہو گا ----"

"دو سال بعد امی ---- دو سال بعد ---- جھولیاں بھر بھر کے دولت لاؤں گا۔ آپ کے قدموں میں ڈالنے کے لئے ----"

رانی نے ٹھٹھے سے قہقہہ لگایا ---- میں نے گھور کر اسے دیکھا وہ بولی۔

"راجو ایم اے کر کے تو کہیں کے راجہ بن جاؤ گے نا"

"راجہ ہی بنوں گا ----" میں خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ امی نے ترس کھا کر مجھے تھوڑے سے پیسے دے دیئے۔

"ہرا زندہ باد امی ---- زندہ باد" میں نے امی کو گلے میں بانہیں ڈال کر چکر دے دیا۔

"تیرا ستیا ناس" امی نے گھبرا کر میرے لمبے لمبے مضبوط بازو اپنی گردن سے نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے امی کے کان میں ہولے سے سرگوشی کی "ان پیسوں کی آج ہم فلم دیکھیں گے رانی تمو اور میں ----"

امی کچھ کہنے کو تھیں کہ ابا جی کمرے سے نکل آئے۔ انہوں نے اپنا کافی پرانا لیکن صاف ستھرا گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔

کتنے وجیہہ تھے میرے ابا جی۔ میں انہیں تکنے لگا۔ ان کے صحن میں آتے ہی ہم سب بہن بھائی مودب کھڑے ہو گئے تھے۔ ساری [illegible] تو ہم آپس میں اور کبھی امی کے ساتھ کرتے تھے۔ ابا جی کے سامنے تو اونچا بولنے کی بھی مجال نہ تھی۔

شام ہم نے فلم دیکھی۔ زیبی اور امجد بھی آئے تھے۔ سب بے حد خوش تھے۔ زیبی مجھ سے دور بیٹھی تھی۔ لیکن قربتوں کا احساس ہی نشہ بن رہا تھا۔ میں پکچر سے زیادہ زیبی کی قربت کو محسوس کر کے مسرور ہو رہا تھا۔

واپسی پر ہم نے ریگل سے دہی بھلے کھائے۔ پھر دو تانگوں میں الگ الگ بیٹھ کر گھر واپس آگئے۔

خوشیاں انمول تھیں ---- ماضی کا وسوسہ تھا نہ مستقبل کا غم زندگی حال کے خوبصورت لمحوں میں مقید تھا۔

○ ☆ ○

"بیٹے مان جاؤ"

"نہیں امی۔ میں نے ایم اے میں داخلہ ضرور لینا ہے۔"

"نوکری مل رہی ہے۔ ایم اے پرائیویٹ کر لینا۔"

"نہیں نہیں نہیں-----"

"کچھ تو خیال کر۔"

"کلرک بھرتی کروا کے آپ بہت خوش ہوں گی۔"

"آہستہ آہستہ ترقی ہو جائے گی۔
ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔"

"عمر ہی کیا ہے۔ تو پھر پڑھنے دیں نا۔ دو سال ہی تو ہیں میں نے ایم اے ضرور کرنا ہے"

کئی دنوں سے گھر میں بحث چل رہی تھی۔ میں نے بی اے ہائی سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا تھا۔ چند نمبر اور مل جاتے تو کھری فسٹ ڈویژن تھی۔ پھر بھی میں خوش تھا۔ اور ایم اے میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا کہ ابا جی نے میرے لئے ایک نوکری تلاش کر لی۔

کلرک بھرتی ہونا مجھے زہر لگتا تھا۔ ابا جی نے مجھے پیار سے کہا تھا "بیٹے پیر اڑا لو۔ پھر کوئی اچھی نوکری مل گئی۔ تو چھوڑ دینا۔"

میں جو ابا جی سے بہت ڈرتا تھا۔ ان کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتا تھا اس معاملے میں اڑ گیا۔

"میں کلرکی نہیں کروں گا" میں نے انہیں صاف جواب دے دیا۔

"یہ ڈی سی صاحب نے بڑی عنایت کی ہے۔ وہ تمہارے لئے اور بھی بہت کچھ کریں گے" ابا جی نے مجھ قائل کرنا چاہا۔

لیکن

میرے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ میرے خواب اونچے تھے۔ میں بلندیوں پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اتنی سمجھ تو نہ تھی کہ ایم اے کر کے کون سا پہاڑ ڈھا لوں گا۔ پھر میں بھی اپنی بات

پر اڑ گیا تھا۔

ابا جی تو میرے انکار پر چپ ہو گئے۔ [illegible] جب غصہ زیادہ آتا۔ تو چپ ہو جاتے۔ ان کی چپ کی مار بڑی [illegible] ہوتی [illegible] لیکن میں اس دفعہ ان کی چپ سے بھی نہیں ڈرا۔

رانی نے مجھے چپکے چپکے سمجھانا چاہا "راجے۔ ابا جی کی بات مان لو تم نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا ---- ڈی سی صاحب کیا کہیں گے کہ بیٹے پر باپ کا اختیار نہیں۔"

"[illegible] نہیں کروں گا۔"

"ایم اے کر کے کیا کرو گے۔"

"کوئی اچھی نوکری تو مل جائے گی نا۔"

"بڑی اچھی ملے گی۔"

"کیوں۔ فاضل بھائی کوئی کام کر کے مل گئی ہے۔ بنک میں اتنی اچھی نوکری۔ مجھے ایم اے کر کے [illegible] ملے گی۔"

رانی چپ ہو گئی چاہتی تو دل سے وہ بھی تھی۔ کہ اس کا پیارا دلارا بھائی افسر ہی بنے۔ جل کر بولی "بیٹے پڑھنے کی [illegible] ایف اے کے بعد بھی کہا تھا آرمی جائن کر لو۔"

"[illegible]"

"[illegible] تک کمیشن مل گیا ہوتا۔"

"[illegible] کی سوچنا ہے میں پڑھوں گا۔ ابھی ----"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی کوشش کی۔ بہت کچھ کہا۔ [illegible] سمجھایا۔ غصے ہو گئیں۔

[illegible] کی کوشش کی

[illegible]

[illegible] لگ جاؤ دنوں میں گھر کی حالت بدل جائے گی۔"

"[illegible] لوں گا۔ اور گھر کی حالت بھی بدل دوں گا۔ صرف دو سال

اور پڑھ لینے دیں-----"

"کچھ باپ ہی کا خیال کر۔ ایک کمانے والا ہے۔ اور اتنے کھانے والے۔ جوان بہنوں کا سوچ راجو ----- ان کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔ آج ایک بیٹی کی شادی کریں تو پتہ چل جائے گا۔"

"سب کچھ ہو جائے گا" میں ضد پر اڑا رہا۔

انہی دنوں رانی کے لئے فاضل کا باقاعدہ رشتہ آگیا۔

تایا جی تائی جی اور ان کی بڑی بیٹی فاخرہ اور اس کا شوہر ہمارے ہاں آئے۔

اس دن گھر میں بڑی گہما گہمی تھی۔ بیٹھک جو ان دنوں ڈرائنگ روم ہے تب اس طرح آراستہ نہ تھی۔ درمیان میں چوکور بارڈر والی سبز دری پڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف بید کی بنی کرسیاں رکھی تھیں جن پر رانی اور قمو نے گل بوٹوں والے کشن بنا کر رکھے تھے۔ درمیانی میز پر اماں کے ہاتھ کا بنا کروشئے کا رومال تھا۔ مینٹل پیس پر ابا کی پرانے فریم والی بڑی سی تصویر تھی۔ جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے پیتل کے منقش گلدان تھے۔ جن میں کاغذ کے پھول سجے تھے۔ دائیں بائیں ہم تینوں بھائیوں کی تصویریں تھیں۔ ابا کی تصویر کی جگہ پہلے فریم شدہ آئینہ ہوتا تھا جسے پرانا فیشن سمجھ کر رانی نے اتار دیا تھا۔ اور اباجی کی تصویر ان کے کمرے کی دیوار سے اتار کر یہاں لگا دی تھی مینٹل پیس پر نیلے پیلے پھولوں کی کڑھائی والا کپڑا پڑا تھا۔

اس بیٹھک میں اس دن سب بزرگ بیٹھے تھے۔ یہاں سے بڑی پھپھو بھی آئی تھیں۔ زیبی کی اماں اور ابا بھی بلائے گئے تھے۔

رشتہ تو بچپن سے ہی طے تھا۔ رسمی طور پر مانگنے کے لئے تایا جی اور اہل خانہ آئے تھے۔

تایا جی نے گھر گجرات ہی میں بنوا لیا تھا۔ تائی جی کا میکہ وہیں تھا انسپکٹر پولیس رہے تھے۔ ہر پولیس والے کی طرح ان پر بھی فضل ربی بہت تھا۔ اب ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ لیکن اتنا کچھ کر لیا تھا کہ مزے سے گزر ہو رہی تھی۔ دکانیں اور مکان کرائے پر اٹھے تھے' کچھ زمین الاٹ کرائی ہوئی تھی۔ اور پنکھوں کے کاروبار میں کسی دوست کے ساتھ سرمایہ بھی لگایا ہوا تھا۔ جس سے ماہانہ رقم مل جایا کرتی تھی۔ رانی کے لئے ایسے گھر کی بہو بننا بہت سوں کے لئے رشک و حسد کا باعث تھا۔ ہم سب بے حد خوش تھے۔

رانی بھی خوش تھی۔

امی اور اباجی بھی خوش تھے۔

بیٹھک اس دن مسرور قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ اباجی کو اس طرح مذاق کرتے اور کھل کر ہنستے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اندر رانی باورچی خانے میں مصروف تھی۔ قمو اور زوبی دوڑ دوڑ کر کام کر رہی تھیں۔ زیبی

بھی ان کا ہاتھ بٹانے کو آئی ہوئی تھی۔

وہ رانی کو چھیڑ بھی رہی تھی۔ اور رانی سرخ سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ بڑے مزے مزے کے کھانے پکا رہی تھی۔ پلاؤ' مرغی' آلو گوشت' کوفتے جانے کیا کچھ بنا رہی تھی۔

"آئے ہائے ----- خاطریں" میں نے رانی کو چھیڑا۔ جو آگ کے قریب مسلسل بیٹھنے سے پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

"سسرال والے آئے ہیں نا" زیبی جو آتشی رنگ کا ریشمی سوٹ پہنے پیاز کاٹ رہی تھی ----- پیاز کی کڑواہٹ آنکھوں میں لگ کر آنکھوں کو بھی آتشی رنگ دے رہی تھی۔ رانی کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

میں مسکرا دیا۔ تب رانی بازو سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

"زیبی ----- دیکھتی جا ----- ہم آئے تو تو نے بھی ایسے ہی خاطریں کرنا ہوں گی ہماری۔"

"کیا" زیبی پہلے تو سمجھ نہ پائی -----

میں نے شوخی سے دیکھ کر کہا "واقعی ایسے ہی کھانے بنانا۔"

زیبی شرما گئی ----- اس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر محظوظ ہونے لگا۔

میں کتنا خوش تھا ----- ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

رانی کے رشتے کی بات پکی ہو گئی۔

تائی جی نے اپنے ساتھ لائی ہوئی مٹھائی پلیٹ میں نکال کر سب کا منہ میٹھا کرایا۔ امی نے پستے باداموں والا دودھ شگن کے طور پر سب کو پلایا۔

مبارک سلامت کا شور مچا۔

رانی کو میں نے بازوؤں میں بھر کر پیار کر لیا۔ "خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے میری پیاری بہن-----"

رانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور جانے کیوں میں بھی دلگیر ہو گیا۔

منگنی کی تاریخ طے کر کے وہ لوگ چلے گئے۔

امی اباجی اور رانی سب تیاریوں میں لگ گئے۔

اور

میں نے چپکے سے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ گھر میں خوشیوں کا دور تھا۔ مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ امی اور رانی کو تو اب اپنی پڑی تھی۔ اس لئے مجھ سے الجھنے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔

یہی موقعہ غنیمت جان کر میں نے اپنی دلی خواہش پوری کر لی۔

چھوٹی پھپھو تایا جی کے [illegible]
آگئیں۔ زیبی کی امی سے انہیں کچھ کام تھا۔ [illegible]
سب امی کے کمرے میں بیٹھے تھے ابا جی دفتر جا چکے تھے۔ [illegible]
----- اس لئے میں گھر پر تھا۔

رانی چائے کی ٹرے لے آئی۔ میز پر برتن لگا کر [illegible] والی [illegible] چائے ہمارے ہاں بڑے شوق سے پی جاتی تھی۔ بارہ خطائی والی چائے رانی بناتی بھی بہت عمدہ تھی۔

اماں نے گول بے ڈنڈی کے چینی کے پیالوں میں چائے ڈال کر پھپھو اور زیبی کی امی کو دی، ہم نے بھی اپنا اپنا پیالہ اٹھا لیا۔ ہم سب بڑے شوق و تجسس سے پھپھو کی باتیں سن رہے تھے۔

پھپھو وہاں منگنی کی تیاریاں دیکھ آئی تھیں۔ ایک ایک چیز کے متعلق بتا رہی تھی۔

"بھابی کوئی خوبصورت کیم خواب کا جوڑا ہے" پھپھو نے کمخواب کے جوڑے کے متعلق امی کو بتایا "بھئی اس کی چمک دمک ہی بتاتی ہے کہ کتنا قیمتی ہے۔"

"کس رنگ کا ہے" قمو خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"سرخ ہے ----- کچھ نارنجی سرخ ----- دوپٹے پر پورا جال بنوایا ہے اور یہ اتنی اتنی لمبی کرن اور گوٹا لگا ہے" پھپھو نے میز پر پیالہ رکھ کر ہتھیلی پر انگلی رکھ کر کرن کی لمبائی بتائی۔

رانی پلنگ پر امی کے پہلو میں بیٹھی خوش ہو رہی تھی۔ سرخ ہو رہی تھی۔ اور سمٹی جا رہی تھی۔

ابا جی کے پلنگ پر چھوٹی پھپھو زیبی کی امی اور [illegible] بیٹھے تھے۔ قمو پلنگ کا پٹی تکیہ پکڑے کھڑی تھی۔

"اور کیا کچھ بنا ہے پھپھو" قمو مارے شوق کے بولی۔

"بہت کچھ -----"

"جوڑے؟"

"پانچ جوڑے ہیں۔ دو ساڑھیاں" پھپھو نے کہا۔ پھر ایک ایک جوڑے کی تفصیل بتانے لگیں۔

"ماشاء اللہ ----- رانی تو سچ مچ کی رانی بنے گی" زیبی کی امی نے پیار سے کہا۔

"زیور، کون سا کم ہے ----- بارہ تولے کی تو چوڑیاں ہیں" پھپھو نے کہا "ایک کندن کا سیٹ ہے۔"

"اللہ۔" قمو خوشی کے جذبوں پر قابو نہ پا سکی۔ رانی کی خوشیاں گلرنگ جوڑے کی طرح اس کے چہرے پر پھیل رہی تھیں۔ مجھے جوڑوں اور زیوروں سے کیا لگاؤ ہوتا تھا۔ ہاں میں رانی کے چہرے پر کھیلتی مسرتوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

لیکن

جانے کیا بات تھی پھپھو جوں جوں تفصیلات بتا رہی تھیں۔ امی کے چہرے پر غبار سا پھیلتا جا رہا تھا۔

"مٹھائی سوا من آئے گی" پھپھو نے کہا اور "بد بھی سوا من۔" "کھوپا، بادام، چھوہارے، میوہ اور کھانے تو بھائی جی لے بھی آئے بڑے دھوم دھڑکے سے آئیں گے انشاء اللہ منگنی کرنے۔"

منگنی پر اتنا کچھ ہو رہا ہے۔ تو شادی پر اللہ جانے کیا کچھ کریں گے" زیبی کی امی بولیں۔

"بھائی خود ہی سمجھ لو آپا۔ جو منگنی پر اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ شادی پر کیا کچھ نہیں کریں گے۔"

"شادی کا ارادہ کب تک ہے۔"

"بھئی سال ڈیڑھ سال تو لگ ہی جائے گا۔ فاضل ابھی ابھی تو ملازم ہوا ہے۔"

"ہوں"

"بھابی بڑی خوش قسمت ہیں آپ" پھپھو نے میری امی سے کہا "لڑکا بھی ماشاء اللہ ہیرا ہے ہیرا۔"

"ہاں شکر ہے اللہ کا" امی نے اک گہری سانس لے کر کہا۔

"اپنا ہی بچہ ہے" زیبی کی امی بولیں "اپنوں کی بات ہی اور ہوتی ہے جمیلہ ----- اچھائیاں برائیاں سب پتہ ہوتی ہیں۔"

اور پھپھو جمیلہ کو جانے کیا سوجھی۔ شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے زیبی کی امی سے بولیں "آپا آپ بھی زیبی کے لئے کہیں اپنوں ہی میں نظر رکھئے گا-----"

رانی نے امی کے پہلو سے سر نکال کر میری طرف شریر نظروں سے دیکھا۔ قمو نے بھی میرے کندھے کو دبایا۔

میں خجل سا ہو گیا۔

زیبی کی امی بھی شاید پھپھو کے اشارے سے بات سمجھ گئی تھیں۔ آہستگی سے بولیں "جو اللہ کو منظور ہو گا-----"

امی دعائیہ انداز میں بولیں "نصیب اچھے ہوں بیٹیوں کے۔"

"آمین" دونوں پھپھو نے بیک زبان کہا۔

کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھتے ہوئے بولا "امی ادھر کوئی کام تو نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں۔"

"یونیورسٹی۔"

"اوہ اچھا" پھپھو جمیلہ نے میرا بازو پکڑ کر پلنگ پر بٹھاتے ہوئے مجھے لپٹا لیا "ماشاء اللہ داخلہ لے لیا ہے۔"

"ہاں پھپھو ----- آپ کو تو زیور اور کپڑوں کی باتوں کے سوا کسی اور بات کا ہوش تھوڑا ہی ہے -----" میں نے ہنس کر کہا چھوٹی پھپھو مجھ سے پانچ چھ سال ہی بڑی تھیں۔ بڑی بہنوں کی طرح تھیں۔ ہم سب بہن بھائیوں کو پیار بھی بہنوں ہی کی طرح کرتی تھیں۔

انہوں نے میرے سر پر بوسہ دے کر کہا "ہائے راجو ----- مجھے تیری جو خوشی ہے نا کسی کی بھی نہیں -----"

"اوں ----- ہوں" میں لاڈ سے مچلا "خوشی تو آپ کو فاضل بھائی کی ہے۔ انہی کی باتیں کئے جا رہی ہیں ----- اپنا ذکر ہی نہیں ----- آپ کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ میں بھی آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔"

"شریر کہیں کا" پھپھو نے پیار سے میرے گال پر چٹکی کاٹی۔ پھر بولیں "بھائی قسم لے لو راجو ----- یہ تو غلط ہی بات لیکن سب بھتیجے بھتیجیوں سے تو مجھے زیادہ ہی پیارا ہے ----- اللہ کرے تو پڑھ لکھ کر بہت بڑا افسر بن جائے۔"

میں نے پھپھو کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔

سب کو ہنسی مذاق کرتے چھوڑ کر میں کمرے سے نکل آیا۔ ڈیوڑھی میں میری سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے اپنی فائل اٹھائی ----- ڈیوڑھی میں آیا سائیکل کے کیریر پر فائل رکھ رہا تھا ----- کہ زیبی آ گئی۔

وہ یونیفارم میں تھی۔ اور دو ایک کتابیں سینے کے ساتھ لگا رکھی تھیں گرم فیروزی شال میں اس کا سنہری چہرہ چمک رہا تھا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔

وہ قدرے لجائی اس کی آنکھوں میں حسب معمول تاروں کی چمک بھری تھی۔

"امی ادھر ہیں" وہ بولی۔

"کالج سے آ بھی گئی"

"ہاں-----"

"اتنی جلدی" میں نے آستین کھینچ کر اپنی پرانی سی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"پیریڈ فری تھے۔ مس نہیں آئی تھیں" وہ میرے قریب سے گزری مجھے یوں لگا جیسے مرتعش مترنم ہوا کا جھونکا مجھے چھو گیا ہے۔

میں سرشار مخمور اور اپنے آپ میں کھو گیا۔ سائیکل باہر نکالی اور گلی میں سائیکل لئے چلتا بڑی گلی میں آ گیا۔

چند منٹ مجھے چاچا جی خیر محمد کے پاس رکنا پڑا۔ بڑی گلی میں ان کا سرخ پتھروں کی چنائی والا بڑا سا مکان تھا۔ چاچا جی خیر محمد سب کے خیر خواہ تھے ----- بہت نیک اور پارسا انسان تھے۔ سارا محلہ ان کی عزت کرتا تھا۔

وہ میری اور گھر والوں کی احوال پرسی کرنے لگے۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔ میرے ایم اے میں داخلہ لینے کا سن کر وہ بہت خوش ہوئے ----- محلے داری کا ناطہ بھی عجب ناطہ ہوتا تھا۔ اتنا خلوص اتنی محبت کہ انسان سرشار ہو جاتا۔

بڑی گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ لوگ آ جا رہے تھے مہترانیاں سروں پر کوڑے اور گندگی کے ٹوکرے اٹھائے گھروں سے نکل اور داخل ہو رہی تھیں ----- سردیوں کا آغاز تھا صبح ہلکے سے بادل آسمان پر تیرتے نظر آ رہے تھے۔ دور کہیں بارش ہوئی تھی۔ ہوا بے حد خنک تھی۔ اور دھوپ نکل آنے کے باوجود فضا ٹھٹھری سی لگ رہی تھی۔ تاہم دوپہر کو اب بھی موسم خاصہ تپ جاتا تھا۔

میں بڑی گلی میں بھی سائیکل کے ساتھ چلتا گیا۔ بیرونی سڑک پر آ کر پیڈل پر پاؤں رکھا اور یونیورسٹی کی طرف چل دیا۔

○ ☆ ○

میں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ ڈیوڑھی میں کھلنے والے بیٹھک کے دروازے پر پردہ پڑا تھا۔ اس لئے دیکھ نہ سکا۔ کہ بیٹھک میں کون ہے۔ میں زیبی کے گھر رانی کے دوپٹے دینے آیا تھا۔ یہاں آنے کا تو بہانہ ہی ہونا چاہئے تھا۔ اب زیبی نے مجھ سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا...... اس لئے روزانہ جانے کا بہانہ رہا نہیں تھا۔

پھر بھی کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی حیلے میں وہاں جا ہی پہنچتا تھا۔

بیٹھک میں شاید کوئی مہمان آیا بیٹھا تھا۔ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں سمجھا پھوپھا جی کے کوئی ملنے والے ہوں گے یا واجد اور شاید کا کوئی دوست آیا ہو گا۔

مناسب نہ سمجھا کہ بیٹھک میں جھانکوں اس لیے سیدھا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

پہلی منزل پر پہنچ کر میں رکا۔ بڑی خاموشی تھی۔ چاروں کمروں کے دروازے صحن میں کھلتے تھے۔ دروازے کھلے تھے۔ کمروں میں کوئی نہ تھا۔

"پھپھو" میں نے آواز دی۔

کوئی نہ تھا۔ جواب نہ ملا۔

"اے بھئی کہاں ہو سب لوگ ......" میں نے کہا۔ اوپر سے برتنوں کے کھنکنے کی آواز آئی۔

میں سیڑھیاں دھپ دھپ چڑھتا اوپر چلا گیا۔ زیبی کے گھر کا باورچی خانہ اوپر کی اس منزل میں تھا۔ ایک بڑا کمرہ چھوٹا سا سٹور اور باورچی خانہ .....

پھپھو جی کا سارا دن تقریباً اوپر ہی گزرتا تھا ...... کھانا پکانا سوئی سلائی کپڑوں کی دھلائی سارے کام یہیں ہوتے تھے۔ پھپھو کے ہاں جیراں میراثن ادھر ادھر کا کام کرنے کے لئے آتی تھی۔ برتن جھاڑو کپڑے وغیرہ اسی کے ذمہ تھے۔

ایک تو یہ بات تھی۔ کہ یہ لوگ نوکر رکھنے کی استطاعت رکھتے تھے دوسرے پھپھو اکیلے گھر داری کا بار نہ اٹھا سکتی تھیں ----- زیبی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ بھی کالج میں پڑھنے لگی تھی۔ اس لئے ایسے ایسے کام وہ نہیں کرتی تھی ویسے پھپھونے اسے گھر کے کاموں کی تربیت ضرور دی تھی۔

[illegible]

[illegible] ننگی پنڈلیاں اور پاؤں [illegible] سرخ سرخ تلووں والے سفری پاؤں [illegible] ذہن پر مسلط رہے تھے۔

میں اوپر آگیا۔ اوپر [illegible] کھڑا [illegible]

[illegible] مسکرا کر [illegible]

[illegible]

"بڑی خاموشی ہے کیا بات ہے ---- پھپھو کہاں ہیں۔"

"بیٹھک میں..."

"کوئی آیا ہے۔"

"ہاں۔"

میں صحن میں آگیا۔ باورچی خانے میں زیبی چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ [illegible] اس نے چائے کے برتن رکھے تھے۔ اور مٹی کے تیل کے چولہے پر فرائنگ [illegible] تھی۔

[illegible] میں ایک پلیٹ میں [illegible] رکھی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص الخاص مہمان ہے۔ یونہی تجسس سا ہوا۔

میں نے زیبی سے ہنس کر کہا "بڑی خانہ داری ہو رہی ہے۔"

اس نے مسکرا کر دیکھا "کیا [illegible]"

"تم پہلے اپنے مہمانوں تو نمٹا لو......"

[illegible] جائیں گے......"

اس نے شامی کباب پلیٹ میں نکال کر میری طرف بڑھایا۔

[illegible] چکھا کیا۔

"چکھ لیں ---- کیسے بنے ہیں" اس نے اصرار کیا۔ میں باورچی خانہ کی طرف بڑھا اور پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"آؤ امجد" میں نے امجد کو بلایا۔

"کھائیں آپ۔"

"آؤ یار چکھ لو تم بھی....."

امجد نے آدھا کباب لے لیا۔ آدھا میں نے کباب خوب کرارے اور مزیدار تھے۔

"کیسا ہے" زیبی نے تجسس سے پوچھا۔

"تم نے بنائے ہیں "میں نے پلیٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

میں جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کرنے لگا۔

"کیسے ہیں" وہ شوق سے بولی۔

کچھ خاص اچھے نہیں میں نے منہ بنایا۔

وہ بگڑ کر بولی "کبھی کھائے ہوں ایسے کباب تو پتہ ہوتا۔"

امجد بولا "آدھا کباب دے کر احسان جتا رہی ہو۔ چکھانے ہیں تو دو چار چکھاؤ۔"

"بالکل" میں نے کہا۔

زیبی نے اک نگاہ غلط انداز میں مجھ پر ڈالی اور چار کباب پلیٹ میں رکھ کر میری طرف بڑھا دیئے۔

"نہیں نہیں زیبی ---- میں تو مذاق کر رہا تھا" میں جلدی سے بولا-----

"کھالیں بھائی جان ----" امجد نے پلیٹ اس سے لینا چاہی زیبی نے پلیٹ اسے نہیں دی۔

"پیٹو کہیں کا---- راجو کو کھانے دے-----"

امجد نے پلیٹ چھین کر مجھے دے دی۔ ہم دونوں مزے لے لے کر کباب کھانے لگے۔

"بہت لذیذ ہیں" میں نے امجد سے آہستگی سے کہا۔

"ہاں۔"

"زیبی کو چڑانے کے لئے کہیں گے بد مزہ ہیں۔"

"بڑی چڑ لگتی ہے اسے۔"

"کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے" زیبی اور کباب تلتے ہوئے بولی۔

"کچھ خاص مزے کے نہیں ہیں تمہارے کباب" میں نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

"کھانے کا سلیقہ ہونا جب" وہ چڑ کر بولی۔

"اب جھوٹی تعریف بھی تو نہیں ہو سکتی" امجد نے آخری کباب منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جھوٹی سچی اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے ضرورت نہیں تعریف کروانے کی" وہ بولی۔

"اوئے ہوئے" امجد نے ہنس کر کہا۔

"بہت اچھے ہیں بھئی زیبی ----" میں نے اس کا دل توڑنا نہیں چاہا۔

"شکریہ" وہ تمسخر سے بولی۔

"دو اور دے دو زیبی" امجد نے منت بھرے انداز میں کہا۔ وہ پلیٹ لے کر اس کے پاس گیا۔

"چل ہٹ ---- اب نیچے چائے بھی بھیجنے دے گا یا نہیں -----" وہ بولی۔

"کون آیا ہے" میں نے پوچھا۔ میں رومال نکالے ہاتھ منہ صاف کر رہا تھا "کوئی خاص مہمان؟"

"جی ہاں خاص ہی ہے۔ جو امی نے اتنی خاطرداری کرنا مناسب سمجھی ہے" امجد بولا۔ میں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔

وہ خود ہی بولا "دوبئی سے مہمان آئے ہیں----"

"کون" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جہانگیر چچا ہیں نا ہمارے۔"

"ہاں۔"

"ان کے بڑے صاحبزادے۔"

"کون؟"

"مشتاق صاحب ---- دوبئی ہوتے ہیں نا ---- ایک ماہ کی چھٹی آئے ہیں۔ آپ ملے نہیں ان سے۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا ٹھاٹھ باٹھ ہیں۔ دوبئی جا کر تو وہ کچھ اور ہی چیز بن گئے ہیں اللہ قسم چیزیں لاجواب ہیں وہاں۔ جو جیکٹ پہنی ہوئی ہے جی چاہتا ہے اتروا لوں۔"

"ہوں۔"

میں چپ سا ہو گیا۔ میرے اندر اک چھناکا سا ہوا۔

زیبی نے ایک ٹرے میں چائے کے برتن دوسری میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دیں۔ "لے جا امجد۔"

میں نے ایک خالی خولی نگاہ زیبی پر ڈالی۔ بعض خدشے اپنا آپ بڑے غیر محسوس طریق سے

یونیورسٹی میں داخلہ لے کر میں ایک نئی دنیا سے متعارف ہوا تھا۔ اب تک میری دنیا میرے چھوٹے سے گھر، گلی اور محلے تک ہی محدود تھی۔ میرے دوست بھی میرے جیسے ہی تھے۔

لیکن یونیورسٹی میں آکر شہر کے چوٹی کے لوگوں کی اولادوں سے واسطہ پڑا ----- امراؤ روسا کے صاحبزادے دیکھے۔ بہترین لباسوں میں ملبوس' اعلیٰ برانڈ کے سگریٹ پینے والے۔ لمبی لمبی چمکتی گاڑیوں اور برق رفتار سکوٹروں اور موٹر سائیکلوں پر آنے والے لڑکوں کی دنیا ہی اور تھی -----

ایسے لڑکوں کی خاصی تعداد تھی میں نے دیکھا تھا۔ کہ یہ لوگ پڑھائی میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ بس یونیورسٹی جوائن کی ہوئی ہے۔ شاید ایک دوسرے پر اپنی امارت کا رعب جتانے کے لئے یا اس احساس کے لئے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے ان کی شخصیات جلا پاتی ہیں۔

مجھ ایسے بھی لڑکے تھے۔ بلکہ کچھ تو مجھ سے بھی بد حال تھے لیکن میری نظریں تو ان چیدہ چیدہ لڑکوں پر ٹھہرتی تھیں جو گاڑیوں سکوٹروں پہ آتے جاتے تھے۔ بہترین اور فیشن ایبل لباس پہنتے تھے۔ سگریٹ بے دھڑک پیتے تھے اور ریستورانوں میں چائے پیتے۔ کلبوں میں شامیں گزارتے اور ہوٹلوں میں رقص و سرور کی محفلوں میں جاتے تھے۔

مجھے یہ احساس کچھ زیادہ ہی ڈبونے لگا۔ مجھے اپنے فرسودہ اور پرانے فیشن کے کپڑوں پر جھلاہٹ ہونے لگی۔ سائیکل جو برسوں پرانی تھی اس پر آتے جاتے کچھ ہتکی کا احساس ہونے لگا۔

میں جو اپنے گھر اپنے ماحول اور اپنے گلی محلے میں بہت کچھ تھا یہاں آکر کچھ بھی نہ لگتا تھا۔

میں کپڑوں اور جوتوں کے لئے امی کو تنگ کرنے لگا۔ بے دریغ پیسہ تو خرچ کرنے کے قابل نہیں تھا پھر بھی لڑ جھگڑ کر امی سے زیادہ سے زیادہ پیسے بٹورنے لگا۔

امی جھلا جاتیں ----- لیکن میں من مانی کر لیتا۔

امی نے شاید فاضل بھائی کے لئے ایک گرم سوٹ سنبھال کر رکھا ہوا تھا ---- ایک دن شاید وہ کپڑوں کو ہوا لگا رہی تھیں کہ میں نے وہ سوٹ دیکھ لیا۔

"امی" میں نے کہا۔

"ہوں۔"

سودا لیتے ہیں۔

میں جان نہ پایا تھا کہ یہ کون ہے۔ مشتاق صاحب ہیں۔ لیکن کیوں دل اداس سا ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے میں کتنے خوشگوار موڈ میں تھا۔

[illegible] دونوں ٹرے اکٹھے نہیں لے جا سکتا تھا۔ دوسری ٹرے زیبی نے اٹھائی۔

"لاؤ مجھے دے دو" [illegible] نے زیبی سے ٹرے لے لی۔ لاشعوری طور پر میں نے [illegible] زیبی کو اس شخص کی خاطر مدارات میں یوں [illegible] نہیں بننا چاہتا تھا ----

[illegible] اور [illegible] ٹرے [illegible] سیڑھیوں کی طرف آ گئے ---- [illegible] علی گئی۔

[illegible] کا ڈرائنگ روم خاصا تھا۔ قالین بھی پڑا تھا۔ ریشمی پردے بھی تھے۔ دو صوفے [illegible] ---- اور کونے میں بڑے سے چینی کے مرتبان میں لمبی لمبی ٹہنیوں پر پلاسٹک کے [illegible] پھول بھی سجے تھے ----

ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سلام دعا ہوئی مشتاق [illegible] مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں پہلی نظر میں مشتاق کو پہچان نہ سکا۔

لیکن غور سے دیکھا تو میرے ہونٹوں پر "شاکا" تھرک گیا۔

شاکا پھوپھا کا عزیز تھا۔ میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ ایف اے میں تعلیم چھوڑ کر دوبئی چلا گیا تھا۔ [illegible] اور بالکل [illegible] سا لڑکا ہوتا تھا۔ گھریلو حالات بھی خراب تھے۔ بہت غریب تھا۔

لیکن

[illegible] لیکن شکل و صورت [illegible] تھی۔ بڑی خوبصورت جیکٹ [illegible] پہنے ہوئے تھا۔ [illegible] اچھی تھی [illegible] چہرے سے خوشحالی کا رنگ [illegible] رہا تھا۔ اس کی کلائی پر بہت قیمتی گھڑی تھی۔ [illegible] سا ہو گیا [illegible] تین سال [illegible] نے [illegible] میں [illegible] دیا۔

[illegible] چلا [illegible] لیکن [illegible] آنکھوں میں شاکے کی [illegible] جلتے چراغ [illegible] تھے

[illegible] اداس ہو رہا تھا۔

"یہ سوٹ مجھے دے دیں۔"
"کیوں۔"
"سلوانا ہے۔"
"کس لئے۔"
"کس لئے ہوتا ہے سوٹ۔ یونیورسٹی میں فنکشن ہے۔ میں نے نیا سوٹ پہننا ہے۔"
ضروری ہے۔"
ہاں ---- مجھے کپ مل رہا ہے۔ سٹیج پر جاؤں گا۔ اور اس پرانے جوڑے میں۔ نہیں امی ---- میں یہ سوٹ سلواؤں گا ---- کچھ تو خیال کریں۔ یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں۔ ڈرامے میں عمدہ اداکاری پر کپ انعام مل رہا ہے۔"
امی نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا ---- میں بضد تھا۔
"یہ سوٹ فاضل کے لئے ہے۔"
"اس کے لئے اور خرید لیں۔"
"خزانہ کھلا ہے نا تیرے باوا کا ---- ذرا خیال نہیں تجھے۔ رانی کی شادی کرنا ہے۔ منگنی پر اتنا خرچہ اٹھ گیا ہے کہ کمر سیدھی نہیں ہو رہی۔ تنکا تنکا اکٹھا کر رہی ہوں۔ کہاں سے آئے گا اتنا کچھ ----"
"مجھے نہیں پتہ۔ مجھے یہ سوٹ چاہئے۔"
"تجھے پتہ ہونا چاہئے۔ ایک اکیلا تیرا باپ ہے کمانے والا۔ اور دس کھانے والے ہیں۔ شادی سر پر آرہی ہے۔ ہماری تو دن رات کی نیندیں حرام ہیں۔ اور تجھے اپنی پڑی ہے۔ گزارہ کرنا سیکھو راجو ----"
"ساری عمر ہو گئی ہے۔ گزارہ کرنا سیکھ رہا ہوں" میں نے سامنے پڑی میز پر زور سے ٹھڈا مارا۔ اور غصے سے بھناتا ہوا باہر نکل گیا۔
دوسرے دن امی نے وہ سوٹ مجھے دے دیا۔ میں نے خوش ہو کر امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا "امی فکر نہ کریں' اس طرح کے کئی سوٹ آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔"
امی نے اک گہری سانس لی میں جو اپنی ذات کے کنوئیں میں بند تھا ماں کے چہرے پر چھائی گمبھیر اداسی کو دیکھتے ہوئے بھی محسوس نہ کر سکا۔ سوٹ میں نے سلنے کے لئے دے دیا۔
پھر جوتوں' ٹائی' اور قمیض اور رومال کے لئے رانی اور قمو سے پیسے بٹورے۔
فنکشن میں میں نے وہ سوٹ پہنا۔ میری شخصیت اتنی اجاگر ہو گئی کہ کئی لڑکے مجھ سے دوستی کے خواہاں ہوئے۔ میں ڈرامیٹک سوسائٹی کا صدر بھی تھا۔ اور اداکاری میں فسٹ پرائز بھی

نیا تھا ---- میں چاہنے والوں میں گھر گیا ---- اور اپنے آپ کو بہت اونچا اور بہت بڑا سمجھنے لگا۔
اسی دن میری شکیل سے علیک سلیک ہوئی۔ وہ درمیانے قد کا سمارٹ سا لڑکا تھا۔ گلبرگ میں چار کنالوں کی وسیع و عریض کوٹھی جو جدید سہولتوں سے آراستہ تھی اس میں رہتا تھا۔ ذاتی کار تھی۔ بہترین لباس پہنتا تھا۔ باپ کی کمائی پر خوب عیش اڑا رہا تھا۔
اس دن میں نے چونکہ نیا اور خوبصورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس لئے پرانی سائیکل پر یونیورسٹی نہیں آیا۔ گلی کے ایک واقف کار کے سکوٹر پر لفٹ لے لی تھی۔
واپسی پر کوئی ٹیکسی لے لوں گا۔ میں اپنا بڑا سا کپ اٹھائے گیٹ سے باہر نکلا تو شکیل اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔
مجھے دیکھ کر میری طرف آیا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "میں آپ سے ملنا چاہ رہا تھا۔ بہت خوبصورت اداکاری کی تھی آپ نے ---- کپ کے لئے مبارک باد۔"
میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "نوازش ہے آپ کی۔ بہت بہت شکریہ"
"آپ کس سبجیکٹ میں ایم اے کر رہے ہیں۔"
"اکنامکس میں۔"
"اچھا۔"
"اور آپ۔"
وہ مسکرا کر بولا ---- "سوشیالوجی میرا سبجیکٹ ہے بس یونہی" میں بھی مسکرا دیا۔
شکیل ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے مجھ سے قدرے بے تکلف ہو گیا۔
"آپ کہاں جا رہے ہیں ----" اس نے پوچھا
"گھر ----"
"ہوں۔"
"نہیں رکشا ٹیکسی لے لوں گا۔"
"آیئے میں ڈراپ کر دوں گا۔"
"نہیں نہیں' میں چلا جاؤں گا۔ شکریہ۔"
جانے کیوں مجھے پہلی دفعہ شہر کی گلیوں میں اپنے پر جھجک سی محسوس ہوئی۔ گلبرگ کے ایک امیرزادے کے ساتھ اندرون شہر کی تنگ گلیوں اور سلین زدہ مکان تک کیسے جا سکتا تھا۔
اس نے بہت اصرار کیا۔ میں انکار کرتا گیا۔
"تو آئیں۔ کہیں چائے وائے تو پیئیں آج آپ کو کپ ملا ہے۔ ہو جائے ایک کپ چائے اسی خوشی میں ----" وہ بڑے تپاک سے بولا۔

"ٹھیک" میں نے بے دلی سے کہا۔

اس نے گاڑی کا لاک کھولا ----- دروازہ کھول کر پہلے مجھے بیٹھنے کی آفر کی۔ مجھ سے کپ لے کر اس نے بڑی احتیاط سے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ پھر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے جیب سے تھری کیسل کی ڈبیہ نکالی۔ بیس سگرٹوں کا یہ پیکٹ ان دنوں عام طور پر عمدہ سگریٹ پینے والوں کے پاس ہی ہوا کرتا تھا۔ خوبصورت سا لائیٹر بھی نکال کر ہتھیلی پر رکھا۔

"لیجئے" اس نے مجھے سگریٹ کی آفر کی۔

"جی نہیں میں، میں نہیں پیتا-----" میں گھبرا کر بولا۔ میری گھبراہٹ محسوس کر کے وہ بے اختیارانہ مسکرا دیا۔ "نہیں پیتے تو پی لیں۔"

"شکریہ" میں نے آفر قبول نہ کی۔

"حیرانی کی بات ہے۔ آپ سگریٹ تک نہیں پیتے-----" وہ مسکرایا۔

"بس۔ عادت نہیں ڈالی-----"

"آپ کے گھر میں اور کوئی بھی نہیں پیتا ہو گا۔"

ابا جی پیتے ہیں۔"

"پھر آپ نے اپنے ابا جی کی عادت اپنائی کیوں نہیں ----- وہ پیتے ہیں تو آپ کو بھی حق ہے پینے کا۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ ہمارے ہاں باپ کی حیثیت گھر میں وزیر اعلیٰ کی تھی۔ ان کے کسی کام میں ہمیں بحث و تبصرہ کرنے کا حق تھا نا کبھی ایسا خیال آیا تھا۔ جو کرتے تھے۔ جو کہتے تھے اس سے ٹکرانا ہمیں سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ ان سے مقابلہ تو کسی طور پر کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھی احترام کی ایک حد تھی جو مجھے شکیل کے خیالوں میں ٹوٹی ہوئی نظر آئی۔

میں نے پوچھا "آپ کے والد پیتے ہوں گے۔"

وہ ہنسا "بہت کچھ پیتے ہیں۔"

میں چپ ہو رہا۔

شکیل نے گاڑی چلا دی۔ اور وہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا شیزان آگیا۔ کسی ریسٹورانٹ میں آنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تو نہیں تھا۔ دو ایک دفعہ میں اپنی گلی کے دوستوں کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔

لیکن اس ٹھاٹھ سے آنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ ہم دونوں میز کے اردگرد بیٹھ گئے۔ فضا باہر کے لحاظ سے کچھ گرم سی تھی۔ جو بہت بھلی لگی۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں فضا میں تیر رہی

تھیں۔

بیرا آرڈر لینے آگیا۔ میں چپکا بیٹھا رہا۔ آج جیب میں کچھ پیسے تھے۔ اس لئے گھبراہٹ مسلط نہ ہوئی۔

ہم دونوں چائے کے دوران باتیں بھی کرنے لگے۔ اردگرد کی میزوں پر اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ چائے کافی پی رہے تھے ----- ابھی زیادہ لوگوں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکا دکا میزیں بھی فی الحال خالی تھیں۔

شکیل کی کئی باتوں سے مجھے اختلاف تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے اس کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں ----- وہ ہر موضوع پر بڑی روانی سے گفت و شنید کر سکتا تھا۔ یہ گفت و شنید بے شک مدلل نہ تھی۔ لیکن اس کی باتوں کا انداز دلنشین ضرور تھا۔

چائے کے بعد بھی ہم کافی دیر بیٹھے رہے۔

بیرا بل لے کر آیا۔ میں نے بل والا کاغذ لینا چاہا۔

"اوہ نہیں سراج صاحب ----- بل میں پے کروں گا۔"

"نہیں ----- میں۔"

"میں۔"

"میں۔"

ہم دونوں ہنس پڑے تکلف کی ایک اور کڑی ٹوٹی۔ بل شکیل نے ہی پے کیا۔

"آپ کے انعام پانے کی خوشی میں" وہ بولا۔

"حالانکہ دینا مجھے چاہئے تھا۔"

"اوہ چھوڑو دوست۔ پھر سہی ادھار رہا تم پر ----- کل پرسوں، کسی دن-----"

"ٹھیک ہے۔"

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ شکیل گاڑی کھولنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا "اب میں گھر چلا جاؤں گا----- رکشے پر-----"

"گھر جانے کی بہت جلدی ہے تمہیں-----" شکیل نے کہا موسم اتنا اچھا ہے گھومتے پھرتے ہیں۔"

"گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے-----" میں نے جلدی سے کہا مجھے اپنا کپ سب کو دکھانا تھا۔ اور اس نئے سوٹ میں زیبی کے ہاں بھی تو جانا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں شاکا چھپا بیٹھا تھا۔ اس پر برتری پانے کی خواہش بھی تھی۔ گو وہ واپس جا چکا تھا۔ لیکن' اپنی امارت کے جو نقوش زیبی کے گھر والوں پر چھوڑ گیا تھا۔ وہ مٹانے کی مجھے شدت سے خواہش تھی۔

شکیل کے اصرار کے باوجود میں نے گاڑی کی بجائے رکشہ لے لیا۔ وہ شاید میری پوزیشن سمجھ گیا تھا۔ اسی لئے چپ ہو گیا۔

میں نے گاڑی سے کپ نکالا۔ شکیل سے مصافحہ کیا اور رکشے میں بیٹھ گیا۔ شکیل بھی اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

اور

مجھے ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھ سے مخالف سمت چلا گیا۔

○ ☆ ○

"بھئی وہ کوئی چیزیں لایا ہے دیکھ دیکھ کر بندہ حیران رہ جاتا ہے۔"

آمدنی بھی تو ہوگی چیزیں یونہی تو نہیں لائی جاتیں۔۔"

"بہن کا جہیز بنا رہا ہے۔"

"ہاں جی کیوں نہیں۔ ایک ایک چیز دیکھنے والی ہے۔"

"اس دفعہ سنا ہے فرج بھی لے کر آیا ہے۔"

"ہاں فرج ---- وہ بیچنے کے لیے سنا ہے پھپھو خرید رہی ہیں۔"

"کون جمیلہ۔"

"نہیں زہی کی امی -----"

میں ایک دم چونکا کتاب پرے پھینک کر بستر میں اٹھ بیٹھا۔ میرے کمرے میں دوسری چارپائی پر قمو رانی اور بڑی پھپھو کی بڑی بیٹی جس کی دو سال پہلے شادی ہوئی تھی بیٹھی تھی۔

میں اپنی کتاب پڑھنے میں منہمک تھا۔ کوئی جملہ کانوں میں پڑ جاتا تو میرا انہماک لمحہ بھر کے لئے ٹوٹ جاتا۔ دو ایک دفعہ میں نے انہیں منع بھی کیا ---- کہ پڑھ رہا ہوں ---- اتنی باتیں نہ کریں۔

لیکن

عاصمہ آئی ہوئی تھی۔ وہ رہتی بھی شاکے کے گھر کے پاس تھی۔ اسی کی باتیں کر رہی تھی۔ شاکا ان دنوں پھر آیا ہوا تھا۔ اس دفعہ جلدی آگیا تھا۔ اس کی بہن کی شادی تھی ---- اس کے لئے سامان وغیرہ لایا تھا۔

مجھے اس سے خدا واسطے ہی کا بیر ہو گیا تھا۔ امی یا ابا جی اس کی کوئی بات بھی کرتے ---- تو میں بدک جاتا۔ قمو رانی کو تو میں اس کا ذکر بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔

آج عاصمہ آئی ہوئی تھی۔ رانی کی شادی کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ تینوں میرے کمرے میں آ بیٹھیں ---- قمو شاید رانی کے دوپٹے کو گوٹہ ٹانک رہی تھی۔ عاصمہ اس کا سویٹر بن رہی تھی زمانے بھر کی باتیں کروا ڈالی تھیں تینوں نے ---- اور اب موضوع شاکے کی بہن کے جہیز کی

طرف مڑ گیا تھا۔

میں جبر صبر کئے کتاب پڑھ رہا تھا۔ لیکن جب عاصمہ نے کہا۔ کہ زیبی کی امی فرج خرید رہی ہیں۔

تو میں چونک گیا۔ میرے ذہن میں شاکے کی شبیہہ آگئی زیبی کی امی کا رویہ آگیا۔ پچھلی دفعہ کی خاطر مدارت یاد آگئیں۔

"کیا دماغ چاٹ ڈالا ہے تم لوگوں نے" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ تو تینوں نے میری طرف دیکھا۔

"ہم تو آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں" قمو بولی۔

"یہی موضوع رہ گیا ہے"

"ہائے راجو ---- ہم تو خرچ کی باتیں کر رہے ہیں۔ زیبی کے ہاں فرج آنے والا ہے" رانی نے کہا۔

"وہ ٹڈا لایا ہے" میں نے غصہ سے کہا۔

قمو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عاصمہ پہلے تو کچھ سمجھی نہیں جب رانی نے کہا کہ راجو شاکے کو ٹڈا کہتا ہے تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ رانی بھی ہنسنے لگی۔

"دو ٹکے کا آدمی تھا۔ دوبئی جا کر پائے خان بن گیا" میں نے ٹھڈے سے کرسی پرے ہٹائی۔

"اب تو دو ٹکے کا نہیں" عاصمہ بولی "اب گھر والوں کے لئے تو وہ فرشتہ رحمت ہے۔ پتہ ہے نا بیچاروں کا کیا حال تھا۔ مشتاق دوبئی گیا ہے تو گھر کی حالت ہی بدل ڈالی ہے۔ اس دفعہ تو سنا ہے زمین بھی خرید رہا ہے۔ کوٹھی بنائے گا اپنی ----"

مجھے خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ جل کر بولا "جہنم میں جائے کوٹھی بنائے یا کوٹھا۔"

"اے ہے راجے۔ تجھے کیا ہو گیا۔" رانی بولی۔ قمو بھی حیرانگی سے مجھے تکنے لگی۔

میں کمرے سے نکلنے والا تھا کہ مجو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آگیا۔ وہ سیدھا کمرے میں آیا۔

"رانی باجی۔ رانی باجی" اس نے کہا۔

"کیوں ----"

"رانی باجی زیبی باجی کے گھر فرج آیا ہے۔ فرج اتنا بڑا۔ سفید سفید ساری چیزیں ٹھنڈی رہا کریں گی۔ اس میں پانی رکھیں گے وہ بھی خود بخود ٹھنڈا ہو جایا کرے گا----"

وہ بڑا اکسائٹڈ تھا۔

عاصمہ بولی "میں نے ٹھیک کہا تھا نا کہ پھپھو خرید رہی ہیں۔ کل ان کے گھر زیبی اور وہ گئی ہوئی تھیں۔ فرج کھلوا کر دیکھ رہی تھیں۔"

زیبی شاکے کے گھر گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں جل گیا۔

"رانی باجی چلیں نا۔ چل کر فرج دیکھیں ---- میں تو دیکھ بھی آیا ہوں۔"

"فرج کون لایا ہے" میں نے مجو سے کہا۔

"بھائی جان مشتاق لائے ہیں۔ انہوں نے ہی لگایا ہے۔ اس میں دودھ کی دیگچی بھی رکھی ہے۔ پانی کے جگ اور بوتلیں بھی۔ شام تک ٹھنڈی ہو جائیں گی----"

"میں اور کچھ سنے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ سیڑھیاں اترا اور سیدھا زیبی کے گھر گیا۔

بیٹھک میں شاید شاکا ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اندر جھانکنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی ---- اور سیدھا اوپر چلا گیا۔

زیبی صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی تھی ---- شاید کسی کپڑے پر بیل بوٹے بنا رہی تھی۔ میں اوپر پہنچا تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ حسب عادت اس کے لب متبسم ہو گئے۔

میں نے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینے کی بجائے گھور کر اسے دیکھا۔

وہ کچھ حیران ہوئی۔ میرے تیوروں سے میرے مزاج کی کیفیت وہ فوراً بھانپ جایا کرتی تھی۔

"آجاؤ ---- وہیں کیوں رک گئے ہو" اس نے آہستگی سے کہا۔

"نیچے شاید مہمان آئے بیٹھے ہیں۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ غور سے دیکھا اور پھر فریم پر پھول بناتے ہوئے سوئی دھاگے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کوئی گرہ پڑ گئی تھی۔ وہ دانتوں سے گرہ کھولنے لگی۔

"شاکا آیا ہے۔"

"کون؟"

"تمہارا شاکا----"

"کیا؟؟؟"

"بہت آنا جانا ہو رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"اس ٹڈے کے ہاں۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔"

"زیبی ----" میں دو قدم آگے بڑھا۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ایک ہاتھ فریم میں اور دوسرے میں سوئی پکڑے وہ ٹکر ٹکر مجھے تکنے لگی۔

"زیبی ---- مجھے شاکے کا تمہارے ہاں آنا جانا بالکل پسند نہیں" میں نے غصے سے کہا۔ وہ

ہکا بکا سی رہ گئی۔

میں پھنکارا "سمجھ گئی ہونا......"

وہ سنبھلی ..... پھر شائد اسے بھی غصہ آگیا۔ سرخ ہوتے ہوئے بولے "تمہیں کیا ہوا ہے۔ مشتاق ابو کے کزن کا بیٹا ہے۔ رشتہ دار ہے ہمارا ..... آتا ....."

"اچھا ٹھیک ہے۔ رشتہ دار ہے تمہارا ....." میں جز بز ہو کر بولا۔

"راجو ..... تمہیں کیا ہو رہا ہے ..... کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا....."

"میں تمہارے گھر نہیں آیا کروں گا ..... ٹھیک ہے تمہارا رشتہ دار تمہیں مبارک ہو....."

"کیا بک رہے ہو" وہ فریم پرے پھینکتے ہوئے غصے سے بھنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم کل شاکے کے ہاں گئی تھی نا" میں اس کے غصے سے مرعوب نہیں ہوا۔

"ہاں گئی تھی....."

"کیوں گئی تھی۔"

"فرج دیکھنے۔"

"تمہارا جانا ضروری تھا نا....."

"راجو میں لڑ پڑوں گی۔ الٹی سیدھی باتیں مت کرو..... فضول کہیں کا....."

"زیبی جو جی میں آئے کہہ لے۔ لیکن کان کھول کر سن لے میں اس لڈے کو برداشت نہیں کر سکتا..... وہ یہاں کیوں بار بار آتا ہے۔ میں جانتا ہوں۔"

اب زیبی بھی چونکی ..... آہستگی سے بولی "ہم نے اس سے فرج لینا تھا۔ اس لئے وہ آتا رہا ہے۔ کل ہم بھی فرج ہی دیکھنے ان کے ہاں گئے تھے ..... تم تم ..... پاگل ہو۔ جانے کیا سمجھ بیٹھے ہو....."

"زیبی ..... میں پاگل ہوں ..... بس پاگل ہوں ....." میں نے پاگلوں ہی سی بات کی۔

زیبی کو ہنسی آگئی۔ شرمیلی ادا سے مجھے دیکھ کر بولی "کہنے کی کیا ضرورت ہے ہو ہی پاگل....."

میرا جی چاہا زیبی کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالوں ..... لیکن آج تک میں نے زیبی کو چھوا تک نہیں تھا۔ یہ جرات نہیں کر سکا۔ پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا "بے شک چھپھو سے بھی کہہ دینا۔ مجھے اس کا یہاں آنا جانا بالکل پسند نہیں ... سمجھیں" میں بلدی سے واپس مڑا۔

زیبی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے رک کر گردن موڑی اور اسی غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی "پھپھو کو خود ہی کہہ دو نا۔ اتنی جرات نہیں ہے کیا....."

میں جز بز ہوتا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اور دھم دھم کرتا نیچے اتر گیا۔

میں بیٹھک میں نہیں گیا۔

اپنے گھر بھی نہیں گیا۔

مجھے جانے کیا ہو رہا تھا۔ زیبی سے اوٹ پٹانگ باتیں کر کے آیا تھا۔ دراصل میرے اندر خطرے کے الارم بجنے لگے۔ شاکا بہت اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا..... اور زیبی کے ہاں آنا جانا بڑھ گیا تھا ...

میں زیبی سے اپنے جذبات کا صحیح طور پر اظہار نہ کر پایا۔ نہ ہی کر سکتا تھا۔ الٹی سیدھی ہانک آیا۔

میں شام تک بازاروں میں گھومتا رہا۔ شام [illegible] بغیر اطلاع دیے گھر سے شام کے بعد غیر حاضر رہنے پر بہت بگڑا کرتے تھے۔

○ ☆ ○

شکیل نے پورچ میں گاڑی روکی۔ ملازم لڑکا وہیں کھڑا تھا۔

"صدیق ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولو" اس نے گاڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا" لڑکا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

میں بھی گاڑی سے باہر نکلا۔ میں نے ایک طائرانہ سی نگاہ ادرگرد ڈالی۔ وسیع و عریض چمنوں میں گھری یہ کوٹھی جدید طرز کی تھی۔ لان بے حد خوبصورت تھے۔ گارڈینیا کی باڑ میں کھلنے کے پودے لگے ہوئے تھے۔ گھنے درخت بھی تھے۔

چمن ڈھاکہ گراس سے ڈھکا ہوا تھا جو خوبصورتی سے تراشی ہوئی تھی۔ خوش رنگ پھولوں کی بیلیں دیواروں سے چمٹی اور چھجوں پر جھول رہی تھیں۔ کیاریوں میں رنگا رنگ پھول تھے ----- برآمدے کے محرابوں میں گملوں میں گھاس چمیلی تھی۔ اور رنگین پتوں والے پودے بڑے جاندار تھے۔

چمن میں کرسیاں بچھی تھیں۔ کین کی کرسیوں پر فوم کی گدیاں تھیں چمنوں میں چھوٹے چھوٹے پول تھے۔ جن پر شیڈ دار بتیاں تھیں۔

نوکر نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔

"آؤ" شکیل نے ڈرائینگ روم کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے کہا ----- میں نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ پچھلی طرف سے سفید ریشین کتا بھاگتا ہوا آیا اور اک اجنبی کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔

"راسی" شکیل نے تحکمانہ انداز میں کتے کو پکارا۔ راسی نے شکیل کی طرف دیکھا۔ پھر موٹی سی دم ہلاتا لمبے لمبے سفید بالوں والا راسی شکیل کی طرف بھاگا اور اس کے قدموں میں لوٹ گیا۔

"راسی" صدیق نے کتے کو بلایا۔ اور پھر اس کے گلے میں پڑے پٹے میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے صدیق کو دیکھا۔ اس نے کتے کو قابو میں کر کے میرے لئے راہ بنا دی تھی۔

میں شکیل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ ایک لمحہ کو تو میں خواب کی سی کیفیت میں مبتلا

ہو گیا۔ اتنا خوبصورت ڈرائنگ روم میں نے بھلا کہاں دیکھا تھا۔ سچی بات کہ میں نے تو سرے سے اس قسم کی کوٹھی بھی کبھی نہ دیکھی تھی۔ سمن آباد میں میرے دو دوست تھے جن کی کوٹھیاں تھیں۔ لیکن پرانی طرز کی ان مکان نما کوٹھیوں اور گلبرگ کے اس علاقے کی جدید طرز کی جدید قسم کے فرنیچر اور قیمتی نایاب چیزوں سے آراستہ کوٹھی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

میں جوتوں سمیت قالین پر پاؤں رکھتے ہو جھجکا۔ اپنے ہاں تو بیٹھک کی دری پر بھی جوتے اتار کر پاؤں رکھا جاتا تھا۔ شکیل کو دیکھا تو وہ جوتوں سمیت قالین پر کھڑا تھا۔ میں بھی اس کی دیکھا دیکھی اس کے قریب آگیا۔

"بیٹھو" اس نے صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔

میں سحر زدہ سا بیٹھ گیا۔

آج شکیل مجھے زبردستی گھر لے آیا تھا۔ اس سے اب میری کافی دوستی تھی۔ لیکن یہ دوستی یونیورسٹی سے لے کر ریستورانوں اور ہوٹلوں تک تھی۔ میں اس کے ساتھ دو تین دفعہ چائے پینے اور ایک دفعہ کھانا کھانے ہوٹل آچکا تھا۔ ان چیزوں سے اب میں کچھ کچھ مانوس ہو رہا تھا۔ ورنہ پہلے تو ہوٹل کا صرف نام ہی سن رکھا تھا۔ ڈنر کھانے کا کب کبھی اتفاق ہوا تھا۔ میرے حالات کے لوگوں کو ایسے اتفاق اتفاق ہی سے میسر ہوتے ہیں ----- مجھے شکیل کے واسطے سے یہ اتفاق ملے تھے۔

دوستی بڑھی تھی۔ شکیل کو میرے حالات کا کچھ کچھ علم ہوا تھا۔ قدر مشترک جانے کیا تھی کہ میں بھی اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ اور وہ بھی میرے ساتھ پورے خلوص سے ناطے جوڑ رہا تھا۔

مجھے اس کی مالی حیثیت سے آگہی تھی۔ لیکن اس کا گھر اتنا خوبصورت آسائشوں سے پر اور اس قدر آراستہ ہو گا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔

میں اس کے کہنے پر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرائینگ روم کی چیزوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ نگاہ نے تو ہر چیز میں اٹکنا چاہا لیکن میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔

"چائے یا کافی" شکیل نے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ لائٹر بھی نکالا۔

"جو مرضی۔"

"تم چائے پی لیتے ہو۔ کافی پسند نہیں کرتے۔"

"یہ کیسے جانا -----"

"اس دن کیفے میں کافی کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے تمہارے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں دیکھ رہا تھا -----"

"بس" میں کھسیانہ سا ہو گیا۔

"تو" اس نے سگریٹ میری طرف بڑھایا۔

"نہیں۔"

"ہو یار۔ کیا بور قسم کے آدمی ہو-----"

میں نے دو چار دفعہ شکیل ہی کی پیش کش پر سگریٹ پیا تھا۔ مجھے تو سگریٹ پینا آتا ہی نہیں تھا۔ اس کے اصرار پر سلگا لیا کرتا تھا۔ سارا دھواں منہ میں بھر کر ہی اگل دیتا۔ اس دھوئیں کو سینے میں اتارنا آتا ہی نہ تھا۔

چند سگریٹ ہی پیے تھے لیکن مجھے اب اس کی کڑواہٹ اور دھواں اچھا لگنے لگا تھا۔ شکیل نے سگریٹ پیش کیا۔

میں نے حسب عادت انکار کیا۔

اس نے پھر اصرار کیا۔ تو میں نے ڈبیہ سے ایک سگریٹ نکال لیا۔ شکیل نے لائٹر سے میرا سگریٹ سلگا دیا۔

میں نے ایک کش لیا----- دھواں حلق کو جا لگا۔ اچھو سا آگیا۔ شکیل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میری آنکھوں میں پانی آگیا۔ جیب سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا "بھئی مجھے پینا نہیں آتا تم زبردستی کرتے ہو۔"

"مت اچھے لگتے ہو سگریٹ کے کش لیتے ہوئے" شکیل نے ہنس کر کہا پھر شوخی سے سرگوشی کرتے ہوئے بولا "یار لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند نہیں کرتیں جو سگریٹ تک نہیں پیتے-----"

میں ہنس دیا۔ میری نگاہوں میں زیبی کی شبیہ آگئی----- میں مسرور و شاد نظر آنے لگا۔

"تم اتنے ہینڈسم ہو جاؤ گے؟ تمہاری طرح میں ہوتا نا----- تو-----" شکیل نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تو کیا ہوتا-----" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تو لڑکیوں کی ایک لمبی قطار میرے پیچھے لگی ہوتی-----" وہ ہنس کر بولا-----

"وہ تو اب بھی خاصی ہے" میں نے چھیڑا۔

"اوں ہوں-----"

"چھپاتے کیوں ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا "اس میں چھپانے کی کیا ضرورت ہے فخر کا مقام ہے۔ فخر کا-----"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔

اس نے دو تین لمبے لمبے کش لئے۔ پھر سگریٹ ماربل کی ایش ٹرے میں پھینکتے ہوئے بولا----- "کام کی ایک بھی نہیں-----"

میں جھجک گیا----- شکیل نے ہاتھ الجھا کر اوپر اٹھاتے ہوئے ایک زور دار انگڑائی لی۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا----- "ممی سے ملاؤں تمہیں دیکھتا ہوں گھر پہ ہیں بھی کہ نہیں-----"

وہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے زور سے آواز دیتے ہوئے انگریزی میں بولا----- "ممی----- ممی آپ ہیں گھر پہ-----"

ممی نے جو شاید کسی دوسرے کمرے میں تھیں۔ انگریزی میں ہی اسے جواب دیا۔ پھر دونوں کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں دونوں انگریزی ہی میں گفتگو کر رہے تھے۔

لفظ ممی اور اس پر انگریزی میں گفتگو----- میں سمجھا شاید اس کی ممی کو فارنیر ہے۔ میرے ذہن میں یہی خیال براجمان رہا اور میں دل ہی دل میں گھبرایا بھی کہ انگریز عورت سے انگریزی میں گفتگو کیسے کروں گا۔ میں انگریزی میں کافی لائق تھا۔ لیکن بول چال میں خاصی جھجک تھی۔

باتوں کی آوازیں دور ہو گئیں۔ شاید وہ دونوں کسی اور کمرے میں چلے گئے تھے۔ میں نے دھیان ڈرائنگ روم کی طرف مبذول کر دیا۔ میں حیران سا بھی ہوا۔ کیونکہ جب آیا تھا تو قطعاً نوٹ نہ کیا تھا۔ کہ ڈرائنگ روم کوئی چار فٹ بیرونی سطح سے نیچے بنا ہوا ہے۔ باہر جانے کے لئے چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں بنی تھیں جن کے دونوں طرف خوبصورت لوہے کے جنگلے لگے ہوئے تھے۔ فرنیچر اور کمرے کی دوسری چیزوں کی مناسبت سے ان جنگلوں پر روغن کیا گیا تھا۔

ایک طرف سے سیڑھیاں ڈرائنگ روم کے لئے بنی تھیں ڈرائنگ روم کوئی چھ سات فٹ اونچا تھا----- یہاں بھی سیڑھیوں کی طرح جنگلہ تھا اور جنگلے کے قریب رکھے گملوں سے پھوٹتی منی بیل جنگلے پر پھیلتی چلی گئی تھی۔ جو بڑی آرٹسٹک لگ رہی تھی۔

ڈرائنگ روم میں بھی پلانٹس پڑے تھے۔ جو بڑے جاذب نظر تھے۔ کچھ بیلیں تھیں جو ٹیک کی دیواروں پر بڑے خوبصورت اور سبک سے زاویے بناتی لٹک رہی تھیں۔ ڈیکوریشن پیس دو تین ہی تھے۔ لیکن نایاب قسم کے تھے۔

میں ایک ایک چیز کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ پسندیدگی کے جذبات ابھر رہے تھے۔ اور اندر ہی اندر احساس کمتری جھنجھوڑ رہا تھا۔ اپنے گھر کی بیٹھک کی مینٹل پیس پر رکھے پیتل کے چھوٹے چھوٹے گلدانوں میں گلابی پیلے کاغذی پھول میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ یا میں ان کا مذاق اڑا رہا تھا۔ سبز دری جس کے سرخ کنارے پیلے ہو ہو کر ملگجے ہو گئے تھے۔ لکڑی کی بید سے بنی کرسیاں اور ان پر پھولوں بوٹوں والے کشن میزوں پر کروشیے کے بنے رومال----- میرے ذہن میں موازنے سے ہلچل سی مچ گئی۔

میں کچھ اپ سٹ ہونے لگا۔ کہ شکیل اپنی ممی کو لے کر آگیا۔

میں ایک لمحہ کو اسے شکیل کی ممی تسلیم نہ کر سکا۔ دبلی پتلی عام شکل و صورت کی سانولی سی عورت جس نے کسی ریشمی کپڑے کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ گولڈن فریم کی عینک تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے بالوں کا گیند نما جوڑا بنا ہوا تھا۔ انہوں نے کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس اور ہاتھوں میں ڈائمنڈ ہی کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔

میں انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا ----- مودبانہ انداز میں سلام کیا۔

وہ سر سے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی "تم سراج ہو نا۔ شکیل تمہاری بڑی تعریفیں کرتا رہتا ہے۔"

میں نے جھینپ کر شکیل کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔

"بیٹھو" وہ خود صوفے پر بیٹھ گئیں۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ شکیل کی یہی ممی چند لمحے پہلے انگریزی بول رہی تھیں۔

میرے سوال کا شاید کوئی جواب نہ تھا۔ جواب ٹٹول بھی نہ پایا تھا کہ وہ مجھ سے انگریزی ہی میں مخاطب ہوئیں "کس سبجیکٹ میں ایم اے کر رہے ہو۔"

"اکنامکس" میں نے جواب دیا۔

"کیسے پیپرز ہوئے"

"اچھے ہی ہو گئے ہیں۔"

"کہتا تو شکیل بھی یہی ہے -----" انہوں نے پیار سے شکیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اوہ ممی -----" شکیل ان کے قریب دھم سے بیٹھ گیا۔ کبھی تو یقین کر لیا کریں۔

"آپ کا بیٹا ایم اے کلیر کر گیا سمجھیں۔"

"رزلٹ کا بھی انتظار نہیں۔"

"نہیں۔"

وہ ہنس پڑیں "شریر لڑکا" انہوں نے انگریزی میں کہا۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں "تم بھی اپنی ممی کو اسی طرح تنگ کرتے ہو۔"

جی چاہا کہوں "میری ممی نہیں امی ہے۔ اور امی کے ساتھ فری کسی اور انداز سے ہوتے ہیں ----- پٹر پٹر جواب دیں تو پٹنے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ نوٹی بائے کہہ کر امی درگزر نہیں کرتیں ----- ممی کر دیتی ہیں شاید۔

ملازم لڑکا ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آیا۔ چونکہ ڈرائینگ روم نیچا تھا۔ اس لئے دو تین سیڑھیاں ٹرالی اٹھا کر نیچے لانا پڑی۔

پھر ٹرالی لا کر اس نے شکیل کے سامنے رکھ دی۔

بڑی خوبصورت ٹرالی تھی۔ جس پر نازک نازک سی پیالیاں اور پلیٹیں پڑی تھیں۔ چائے دانی ٹی کوزی سے ڈھکی تھی۔ نیپکن دھوبی کے دھلے ہوئے کلف شدہ تھے۔ رنگین ٹوکری میں پھل تھا۔ کرسٹل کے پیالوں میں رس گلے اور چاٹ تھی۔ لمبوتری پلیٹ میں کچھ بسکٹ اور کریم رول تھے ایک پیالے میں نمکین دال بھی تھی۔

شکیل نے پلیٹ نیپکن اور چمچ مجھے پیش کیا۔ اپنی امی کو دیا اور پھر کھانے پینے کی چیزیں پیش کرنے لگا۔

باتیں ہونے لگیں میرا حجاب قدرے دور ہوا۔ میں ماحول میں اپنے آپ کو جذب کرنے لگا۔ کچھ اعتماد سے شکیل کی ممی کی باتوں کا جواب دینے لگا۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔

"تم کتنے بہن بھائی ہو" انہوں نے پوچھا۔

"چھ" میں پھر جھینپ گیا۔

انہوں نے آنکھوں کو اک خاص انداز میں گھمایا پھیلایا۔ چھ بچے ان کے لحاظ سے بہت زیادہ تھے۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی۔ اتنے بچوں کا بار اٹھانا مشکل تھا۔

میں جانتا تھا ان کا اگلا سوال میرے ابا کی انکم کے متعلق ہو گا۔ اس لئے جلدی سے بولا۔

"شکیل تو اکیلا ہے نا۔"

"ہاں ----- لیکن یہ اکیلا بھی دس بچوں پر بھاری ہے" وہ ہنس پڑیں۔

"میری بہن بھی تو ہے" شکیل نے کہا۔

"ہاں ----- اس سے چھ سال بڑی ہے ----- وہ میرڈ ہے۔"

اس کی ممی نے کہا "اس کے دو بچے ہیں بہت شریر لیکن بہت پیارے۔"

وہ اپنی بیٹی ریتا کے متعلق بڑے پیار سے بتانے لگیں۔

چائے پی رہے تھے کہ شکیل کے ڈیڈی آگئے۔ وہ مجھ سے تپاک سے ملے۔

پچاس کے لگ بھگ عمر تھی۔ لیکن خوب صحت مند تھے۔ انگریزی میں گفتگو کرنا شاید اس سارے خاندان کی ہابی تھی۔

میں ان سے بے حد مرعوب ہوا۔

بہت بڑا بزنس تھا ان کا۔

چائے کے بعد میں نے اجازت چاہی ----- شکیل مجھے چھوڑنے کے لئے آیا۔ راستہ بھر میں اس کے گھر اور والدین کے بارے میں سوچتا رہا مجھے اپنے گھر اور گھر والوں کا کمپلکس سا ہونے لگا ----- جی بے اختیار چاہا۔ کہ ہمارا بھی ایسا ہی گھر ہو ----- اور گھر والے بھی ایسے ہی ہوں۔

فر فر انگریزی بولنے والے۔ بچوں کی شوخیوں کو در گذر کرنے والے ہنس ہنس کر باتیں کرنے والے۔

گھر آکر میں نے ہر بات بڑی تفصیل سے رانی اور قمو کو سنائی یہ باتیں سناتے ہوئے بڑا فخر محسوس کر رہا تھا۔ یوں جیسے شکیل کے گھر کی باتیں نہیں اپنے گھر کی باتیں کر رہا ہوں۔

○ ☆ ○

"ابا جی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا" میں ابا جی کی پرانی طرز کی پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا وہ حقہ گڑگڑا رہے تھے ہاتھ میں کوئی سیاسی رسالہ تھا جسے انہماک سے پڑھ رہے تھے میں چند دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ ابا جی کچھ مضمحل سے رہتے ہیں ---- دفتر سے آکر وہ باہر نہیں نکلتے شام کی نماز جو وہ ہمیشہ گلی کی مسجد میں پڑھتے تھے اب گھر پہ ہی پڑھ رہے ہیں---- آج وہ دفتر بھی نہیں گئے---- تو مجھے کچھ تشویش ہوئی۔ ان دنوں رانی کے بیاہ کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ سارا دن مجھے گھر اور بازار---- بازار اور گھر کے چکر پڑتے تھے۔ دو تین دفعہ تو شکیل کی موٹر لے آیا تھا۔ شکیل کے ساتھ نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اب میں سگریٹ بڑے اعتماد سے پینے لگا تھا۔ ڈرائیونگ بھی اسی سے سیکھ لی تھی۔

موٹر میں اپنی بہنوں بھائیوں اور امی کو کئی دفعہ بازار لے جا چکا تھا ایک دو دفعہ زیبی کو بھی ان کے ساتھ لے گیا تھا۔ ان دنوں میں اپنے آپ میں بڑی تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا۔ اپنا معیار زندگی اونچا کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ شکیل کی موٹر اس شان سے اڑائے پھرتا تھا۔ جیسے یہ میری اپنی ہو۔

آج بھی موٹر لایا تھا۔ اباجی کی طبیعت ست تھی۔ میں چاہتا تھا انہیں گاڑی میں بٹھا کر کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔

ابا جی نے میری بات سنی---- رسالہ چہرے سے ہٹائے بغیر بولے "ٹھیک ہی ہے۔ بس ذرا پیٹ گڑ بڑ ہے۔"

"کوئی دوائی لے لے نا۔"

"ٹھیک ہو جائے گا۔ رانی نے پہاڑی پودینے کا قہوہ بنا کر دیا تھا۔"

میں قدرے تیزی سے بولا "اس سے کیا ہو گا ابا جی۔ کسی ڈاکٹر کو دکھا دیں نا۔" ان دنوں میری شکیل سے خوب گہری دوستی تھی۔ ان کے ہاں آنا جانا بھی تھا۔ اس کے اچھے بھلے صحت مند والدین بھی ذرا سی تکلیف پر بڑے سے بڑے سپیشلسٹ کے پاس چلے جاتے تھے دوائیں کھائیں نہ کھائیں کنسلٹ ضرور کرتے تھے ڈاکٹر کو۔

ابھی پچھلے ہفتے ہی کی بات تھی۔ شکیل کی ممی ہارٹ سپیشلسٹ سے اپنا پورا چیک اپ کروا کے آئی تھیں۔ ای سی جی بھی ہوتی تھی ایکسرے بھی اترتے تھے۔ انہیں شک تھا کہ انہیں دل کی تکلیف ہے۔

لیکن

بے شک ایسی کوئی تکلیف نہ تھی۔

پر وہ مطمئن تو ہو گئی تھیں نا۔

اباجی کو کبھی کبھی پیٹ کی تکلیف ہو جایا کرتی تھی لیکن سونف پھانک لیتے۔ کبھی کالا نمک---- اب پہاڑی پودینے والا قہوہ پی لیا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس تو کبھی گئے ہی نہ تھے۔ صحت خوب تھی---- خواہ مخواہ کی بیماریاں گلے ڈالنے کے قائل نہ تھے۔

لیکن

ان دنوں میرا آئیڈیل تو شکیل کا گھرانہ تھا۔ میں کسی نہ کسی طور ان لوگوں کو کاپی کرنے کی کوشش شعوری اور لاشعوری طور پر کئے جا رہا تھا۔

میرا بہت جی چاہ رہا تھا کہ اباجی کو کسی بڑے سپیشلسٹ کے پاس نہ سہی ڈاکٹر کے پاس تو لے چلوں۔

"اباجی" میں نے چند لمحوں بعد کہا۔

"ہوں۔"

"چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

انہوں نے رسالہ ایک طرف پھینکا۔ سینے تک ڈالی چادر برابر کی اور سر تلے دونوں ہاتھ اوپر نیچے رکھ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں کچھ گھبرا گیا۔

وہ مسکرائے۔ میں اور الجھ گیا۔

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں راج بیٹے---- " انہوں نے کہا پھر رکے اور بولے "حیرانی کی بات ہے۔ تمہیں میری فکر لگ گئی۔"

"اباجی۔ آپ بھی پتہ نہیں کیا ہیں---- " میں نے سر ادھر ادھر ہلایا۔

"تمہارا ابا ہوں۔" وہ بولے۔

"کبھی دوسرے کی بات بھی مان ہی لیا کریں۔ آپ کی طبیعت یقیناً ٹھیک نہیں ہے---- کئی دنوں سے آپ نماز پڑھنے مسجد تک بھی نہیں جا رہے۔"

اباجی چپ ہو گئے۔

"اٹھیے نا۔ ڈاکٹر سے دوائی لے آئیں۔"

"اوہ نہیں میاں۔ میں نہیں جاؤں گا ڈاکٹر کے پاس۔ معمولی سا پیٹ خراب ہے۔ قہوے سے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"دوائی لینے اور ڈاکٹر کو کنسلٹ کرنے میں کیا ہرج ہے۔"

"یہ چونچلے ہم لوگوں کو نہیں بھاتے۔ کہ چھینک آئی اور دوڑے ڈاکٹر کے پاس۔"

"اونہہ---- " میں نے منہ بنا لیا۔

امی اباجی کے لئے چائے کی پیالی لئے اندر آئیں تو اباجی مسکرا کر بولے "صاحبزادہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہ رہا ہے۔"

"چلے جائیں تو اچھا ہی ہے"

"نہیں امی ڈاکٹروں کے پاس تو صرف امیر لوگ جاتے ہیں۔ یہ چونچلے ہم لوگوں کو نہیں بھاتے---- " جانے کیسے میں اباجی کے سامنے بات اس انداز میں کر گیا---- کہ جو اباجی کی بات کا تمسخر تھی شاید یہ بھی اسی تبدیلی کا نتیجہ تھا جو مجھ میں آتی جا رہی تھی---- میں اپنا آپ اپنی انفرادیت اپنی شخصیت منوا رہا تھا۔

میری بات پر اباجی ہولے سے مسکرا دیئے۔ مسکراتے ہوئے وہ کتنے خوبصورت لگتے تھے۔

میں ان کی طرف تکنے لگا۔ احمقوں کی طرح میرے ذہن میں الٹے سیدھے خیال مچلنے لگے۔

"اتنے خوبصورت اور گرانڈیل اباجی کو ایک شاندار بیڈروم کے نئی طرز کے ڈبل بیڈ پر فوم کے تکیوں کے سہارے لیٹے ہونا چاہئے تھا۔ حقے کی جگہ خوشبودار تمباکو والی پائپ اور ایک پیالی چائے کی جگہ ٹرالی میں سجی چائے یہاں رکھی جانی چاہئے تھی۔"

میں اپنے پاؤں ننگے فرش پر یوں پھیرنے لگا جیسے قالین کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

"راجے" امی نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ اباجی پھر رسالہ دیکھنے لگے تھے۔

"جی۔"

"بازار جائے گا۔"

"کیوں۔"

"دو چار چیزیں لانی ہیں۔"

"اف خدایا---- کتنا جہیز تیار کر رہی ہیں امی---- مہینوں سے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ ابھی تک ختم ہی نہیں ہوئی----"

امی جانے جلی بھنی بیٹھی تھیں بولیں "تجھے چیزیں لا کر دینے سے ہی تکلیف ہو رہی ہے۔ کون سا تیری کمائی سے جہیز بن رہا ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ ۔۔۔۔۔"

"پھر تڑاخ سے جواب بھی نہ دیا کر۔"

"میں نے تو یونہی بات کی ہے امی۔"

امی نروس سی ہو رہی تھیں۔ ماتھے پر شکنیں تھیں۔ چہرے پر بے پناہ اداسی بڑبڑانے لگیں "کہیں نوکر ہو گیا ہوتا تو باپ کا بازو بنتا ایک اکیلے کمانے والے کے سر پر ہی سارا بوجھ ہے۔۔۔۔۔"

میں امی کی بات سے برا مان کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر نکل آیا رانی اور قمو تخت پر بیٹھی تھیں۔ دونوں فیروزی اور سبز دوپٹوں پر کرنیں ٹانک رہی تھیں۔

"راجو" رانی نے مجھے بلایا۔

"کیا ہے" میں نے غصے سے کہا۔

"اے ہے کیا ہو گیا ہے" رانی غرائی

"اباجی کے کمرے سے نکلے ہیں راجہ صاحب" قمو نے ہنس کر سر جھکا لیا "ڈانٹ پڑی ہو گی۔"

میں وہیں کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھی جسے میں انگلی پر گھمائے جا رہا تھا۔ مجو چابی دیکھ کر میرے قریب آیا "گاڑی لائے ہیں بھائی جان۔"

زوبی کمرے سے باہر نکل رہی تھی جلدی سے بولی "آج تو میں بھی جاؤں گی گاڑی میں۔۔۔۔"

"پٹ نہ جانا" رانی مجھ سے خفا ہو کر زوبی سے بولی۔

"کیوں۔"

"جناب کا موڈ آف ہے دیکھتی نہیں ہو" اس نے مجھ پر اک قہرانہ نگاہ ڈالی۔

"آپ سے لڑائی ہوئی" زوبی نے رانی سے پوچھا۔

"رانی باجی تو مہمان ہیں چند دنوں کی۔ ان سے لڑ کر کیا ملے گا" قمو نے کہا۔

رانی آج کل بہت پچی ہو رہی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر آنسو بہانے لگتی۔۔۔۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ قمو کی بات پر افسردہ ہونے لگی تھی۔

رانی مجھے بہت پیاری تھی۔۔۔۔ اس کا افسردہ چہرہ مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تیزی سے اس کی طرف آیا اس کے پیچھے تخت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے میں نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

"چل ہٹ" رانی نے گلے سے میری بانہیں نکالنا چاہیں "بڑا آیا غصہ جھاڑنے والا۔"

"رانی۔۔۔ اللہ قسم مجھے تجھ پر غصہ نہیں تھا۔"

"تو کس پر تھا۔"

"کس پر کہوں۔"

"کیوں۔"

"میں نے امی کی بات اس کے سامنے دہرا دی۔"

"ٹھیک کہتی ہیں نا امی۔۔۔۔ اب بھی تو بیکار ہی پھر رہا ہے۔۔۔۔ ایم اے بھی کر لیا۔۔۔۔ اباجی بیچارے کہاں سے لائیں اتنے پیسے کہ گھر کا خرچہ بھی ٹھیک ٹھاک چلے اور شادیوں پر بھی خرچ ہو" رانی بڑی ہمدردی سے بولی۔

"تو میں کیا کروں" میں آہستگی سے بولا۔۔۔۔ "کئی جگہ تو اپلائی کیا ہوا ہے۔"

"راج تمہیں خود احساس ہونا چاہئے۔ ایم اے کی ڈگری ماتھے پر چپکائے پھرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تمہیں جلد از جلد کام چاہئے۔ چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لو۔ گھر کے حالات تم سے چھپے نہیں۔ ماں باپ کی طرف دیکھو بیکار پھرنے سے اچھا نہیں کہ اباجی کے دفتر میں کلرک ہی بھرتی ہو جاؤ۔ چاہے عارضی طور پر سہی۔ اباجی نے پھر ایک آسامی دیکھی ہے۔"

میں چڑ گیا۔ قمو نے رانی کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"میں حیران ہوتا ہوں۔ لوگوں کی اڑان اونچی ہوتی ہے۔ بہتر سے بہترین کی طرف سفر کرنے کے کوشاں ہوتے ہیں۔ ایک ہمارے گھر والے ہیں کہ بد سے بدترین کی طرف مائل" میں غصے میں بھر گیا۔۔۔۔ مجھے اس وقت یہ احساس نہیں تھا کہ گھر میں دو چار سو کے اضافے سے بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں تو اپنے والدین اور بہنوں کی اس سوچ سے چڑ گیا تھا کہ معمولی سی نوکری ہی کر لوں۔

بات شاید بڑھ جاتی۔۔۔۔ کہ بڑی پھپھو اور ان کے دونوں بڑے صاحبزادے آ گئے۔ میں دل ہی دل میں جزبز ہوتا رہا۔

○ ☆ ○

ہمارے ہاں کھانے کا مخصوص کمرہ نہیں تھا۔ باورچی خانہ ہی کھانے کا کمرہ تھا۔ کھانا پک جاتا تو تھالیوں' پلیٹوں اور پیالیوں میں سالن ڈال دیا جاتا روٹیاں چنگیر میں ہوتیں جو کوئی بھی آتا اپنے حصے کا سالن لیتا روٹی اٹھاتا۔ جی چاہتا تو تخت پر صحن میں بیٹھ کر کھالیتا۔ جی چاہتا تو وہیں چوکی پر بیٹھ کر نوالے توڑتا۔

ہاں!

اباجی کے لئے کھانا ٹرے میں رکھ کر ان کے کمرے میں پہنچایا جاتا تھا جہاں پلنگ کے قریب تپائی پڑی ہوتی۔ اباجی اکثر پلنگ پر بیٹھ کر ہی ناشتہ کرتے اور کھانا کھاتے تھے رانی قمو یا زوبی ٹرے میں کھانا لے جاتیں اور ٹرے تپائی پر رکھ دیتیں۔ باقی سب لوگ باورچی خانہ ہی میں اپنا اپنا راشن لیا کرتے تھے۔

میں شکیل اور اس کی وساطت سے اس کے اور دوستوں اور رشتہ داروں سے ملتا رہتا تھا۔ ان کے ڈرائینگ روم دیکھتا تھا اپنے گھر کی اس بے قاعدگی اور بے سلیقہ پن سے چڑنے لگا تھا۔

ان دنوں جانے مجھے کیا ہوتا رہتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے قدم زمین چھوڑتے جا رہے ہیں اور میں غیر محسوس طریق سے اوپر اٹھتا جا رہا ہوں----- اپنی زمین سے چھٹ رہا ہوں' جدا ہو رہا ہوں۔

لیکن ایک بات ضرور تھی میں اپنے ماحول سے بچھڑ رہا تھا۔ اونچا ہونے کی خواہش تھی۔ اچھی طرز زندگی کا متمنی تھا۔ اس کے باوجود یہ سب کچھ صرف اپنی ذات کے لئے نہیں محسوس کرتا تھا۔ میں اپنے سارے خاندان کو اونچا کرنا چاہتا تھا۔ اپنے گھر کا معیار بلند کرنے کی خواہش تھی۔ بیٹھک کی جگہ ڈرائینگ روم چاہتا تھا۔ باورچی خانے کی جگہ ڈائننگ روم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ بہنوں کو جھاڑو دیتے' برتن مانجھتے' کپڑے دھوتے دیکھتا تو نوکروں کی آرزو ہوتی تھی۔ سائیکل کی سواری سے اب جھلانے لگا تھا۔ چمکتی دمکتی کار رینا چاہتا تھا۔ جس میں اپنے اباجی' امی اور بہن بھائیوں کو اڑائے لئے پھروں۔

یہ سب خیالی قلعے تھے۔ میں اپنے ذرائع آمدنی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ میں ان چیزوں

کو پالینے کے لئے شکاری کتے کی طرح دوڑتا پھرتا تھا----- میں نے کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا کہ ہم جیسے مالی حالات سے دوچار رہنے والے لوگ اس طرز زندگی کو اپنانا تو ایک طرف اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

لیکن

میں

جس کے قدم زمین سے اوپر اٹھ رہے تھے۔

جو شکیل اور دوسرے امیرزادوں سے مرعوب تھا۔

یہ تصور کر رہا تھا کئے جا رہا تھا۔

رات اتر آئی تھی میں شکیل کے ہاں سے کھانا کھا کر آیا تھا۔ ان کے چم چم کرتے ڈرائینگ روم میں شاندار کرسیوں اور چمکتی ٹیبل پر چینی کے نفیس برتنوں میں کھانا چنا گیا تھا۔ کلف شدہ نیپکن تھے۔ باہر سے لائی ہوئی خوبصورت کٹلری تھی----- میں تو کھانے سے پہلے ہی آنا چاہتا تھا۔

لیکن رینا اور آفاق آ گئے تھے۔ رینا نے بڑے اصرار سے روک لیا تھا "چلو راج جو دال ساگ ہے۔ اکٹھے ہی مل کر کھاتے ہیں۔ کیوں شکیل-----"

"بالکل" شکیل نے کہا تھا۔

"ویسے آج دال ساگ والی بات ہی ہے" ممی ہنس کر بولی تھیں۔

"کیا پکا ہے مام" رینا نے پوچھا تھا۔

"شلغم گوشت اور خشکہ چاول" ساتھ مسور کی دال بھی ہے اور قیمہ انڈے بھی" وہ بولیں۔

"بس پھر عیش ہو گئی۔ میٹھا تو ضرور ہو گا" شکیل نے کہا۔

"ہاں گاجر کا حلوہ بھی ہے اور گجریلہ بھی-----" وہ بولی تھیں۔

"ممی کے ہاں گجریلہ تو ہمیشہ مل جاتا ہے" رینا نے کہا۔

ہم سب نے کھانا کھایا تھا۔ بات بات پہ قہقہے اڑتے تھے۔ آفاق اور شکیل کے ڈیڈی کے درمیان تو میز پر ہی لطیفوں کا مقابلہ ہو گیا تھا۔ ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔

رینا اور آفاق کے حلقہ دوستی میں اب میں بھی آ گیا تھا۔ ان کے ہاں ایک ڈنر پر گیا تھا----- وہ لوگ تو شکیل وغیرہ سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ امیر ترین اور ماڈرن----- وہیں رینا نے بھی اپنی دوستوں ربیعہ' سعید' مونا' شان اور دوسری لڑکیوں سے تعارف کرایا تھا۔ مونا اور ربیعہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی تھیں----- امیر خاندانوں کی لڑکیاں لڑکوں سے دوستی کرتے شرماتی تھوڑا ہی تھیں=

آج رینا نے کھانے کے بعد مجھے مونا کا پیغام دیا تھا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"کیوں۔"

"ملے گی تو بتا دے گی۔"

رینا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں چپ رہا۔

"وہ تمہارے ہاں کسی دن پہنچ جائے گی" رینا بولی۔

"نہ نہ----نہ" میں بے طرح گھبرا گیا۔

"لڑکیوں سے ڈرتے ہو"

"نہیں رینا باجی----لڑکیوں سے کیا ڈرنا۔"

"پھر۔"

"اپنے والدین سے ڈرتا ہوں۔ کان پکڑ کر گھر سے نکال باہر کریں گے۔"

"اوہو----اتنا ہولڈ ہے ان کا تم پر----۔"

"جی۔"

"تم جوان ہو----کچھ اپنا آپ بھی رکھنا چاہئے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا----مجھے تو دھڑکا سا لگ گیا کہ کہیں مونا میرے گھر سچ مچ ہی نہ آ جائے۔

"رینا باجی۔"

"ہوں۔"

"پلیز اسے میرے گھر کا پتہ نہ بتائیے گا۔"

وہ پھر ہنس پڑی۔

میں بے طرح گھبرا رہا تھا----کہ شکیل میرے پاس آ بیٹھا۔ "کیا بات ہے"

"مونا کو جانتے ہو نا" رینا بولی۔

"مونا شان" شکیل نے کہا۔

"ہاں" وہ انگریزی میں بولی۔ پٹر پٹر انگریزی ملی اردو میں باتیں کرنا رینا کی بھی ہابی تھی۔

"وہ راج کے گھر جانا چاہتی ہے۔"

"کیوں۔"

"بس لٹو ہو گئی تمہارے دوست پر۔"

"گولی مارو اسے باجی۔"

"کیوں۔ بڑی سمارٹ بڑی امیر لڑکی ہے۔"

میں نے شکیل کے کہنی ماری آہستگی سے منت کی "کہیں سچ مچ ہی میرے گھر نہ پہنچ جائے----پھر تم جانتے ہو کہ میں زمیں----"

"اوہ ہاں رینا باجی" شکیل میری بات سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "مونا سے کہو انگور کھٹے ہیں۔"

"کیوں۔"

"یہ صاحب ریزرو ہو چکے ہیں" شکیل نے انگوٹھے سے میری طرف اشارہ کیا۔

"سچ۔"

"ہاں۔"

"جھوٹ کہتے ہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

رینا نے مایوسی سے سر ہلایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "سچ۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کون ہے وہ" رینا نے شوق سے پوچھا۔

"ان کی کزن" شکیل نے جواب دیا۔

"یہ کزنوں والی بات بڑی خراب ہے----میں نے ایک اتنی اچھی لڑکی ڈھونڈی تھی تمہارے لئے----چھ مربعوں کی تنہا مالک ہے اور اتنی بڑی کوٹھی بھی اسی کے نام ہے۔"

"کون----کون باجی" شکیل نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"تمہارے لئے نہیں۔ آرام سے بیٹھے رہوں۔" رینا نے بھائی کے گال پر چٹکی کاٹی۔

دیر تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔

اور اب میں گھر آیا تھا۔ صحن میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ باورچی خانے میں تو اس سے بھی کم روشنی کا بلب تھا جو دھوئیں سے اٹ کر سرخ سرخ روشنی دینے لگا تھا۔

رانی اور قمو باورچی خانے میں ہی بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ غالباً سب گھر والے کھانا کھا چکے تھے۔ کیونکہ صحن میں بچھے تخت پر تھالیاں اور گلاس پڑے تھے کچھ میں بچے ہوئے چاول تھے کچھ میں سالن ملے چاول گلاس اوندھے تھے۔ کوئی سیدھے پانی تخت پر گرا رہا تھا اور ایک طرف سے بہتا ہوا فرش پر ٹپک رہا تھا۔

میرے آنے پر رانی نے باورچی خانے کا ادھ کھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک ہاتھ میں تانبے کی تھالی پکڑے دوسرے ہاتھ سے سالن اور چاول ملا کر نوالہ بنا رہی تھی۔

قمو پیالے میں دال ڈال رہی تھی اور دوپہر کی خمیری روٹی اس میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔

"آ جاؤ راج---- شلغم گوشت اور چاول پکے ہیں" رانی نے کہا۔ آج بہت دیر لگائی تم نے----"

قمو بولی "دال بھی ہے----"

میں باورچی خانے کے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں شکیل کا ڈرائنگ روم لہرا گیا۔ وہاں بھی یہی کچھ تھا۔ شلغم گوشت خشکہ چاول دال اور

"آ جاؤ نا---- ہم نے اتنی دیر انتظار کیا تمہارا---- پھر کھانے بیٹھ گئے----" رانی نے نوالہ منہ میں ڈالا اس کا دایاں ہاتھ چاولوں اور سالن سے لت پت تھا۔

"کوئی تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو کھانا کھانے کی" میں نے غصے سے دونوں کو دیکھا۔ پھر باورچی خانے پر نگاہ ڈالی۔

دونوں ششدر سی مجھے تکنے لگیں۔ رانی نے تھالی فرش پر رکھ کر دایاں ہاتھ اس میں جھاڑا۔ قمو کا لقمہ جیسے حلق میں اٹک گیا وہ اپنی کالی کالی چھلی چھلی آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔

میں باورچی خانے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف آٹے چاول کے کنستر تھے دوسری طرف پرانی سی جالی دار لکڑی کی ڈولی۔ نل کے تلے میلے برتن الٹ پلٹ پڑے تھے۔ تیل کے ٹین کے گول چولہوں پر چاولوں کا دیگچہ اور شلغم گوشت کی ہانڈی تھی۔ لکڑی کی ڈوئی ہانڈی میں ہی پڑی تھی۔ چائے، نمک، مرچ اور مصالحوں کے ڈبے کارنس پر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ ان دنوں کچھ زیادہ ہی اپ سٹ تھا۔ باورچی خانہ۔ رانی کی شادی میں چند دن ہی باقی تھے۔ لڑکیوں کو فرصت نہ ملتی تھی کہ باورچی خانے کی ترتیب صحیح رکھیں----

لیکن

میں تو ڈرائینگ روم چاہتا تھا۔

رانی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی "غصہ کس بات کا ہے۔"

"غصہ تو ناک پر ہی دھرا رہتا ہے۔ آج کل----" قمو نے ہولے سے کہا۔

"غصہ نہ آئے" میں تیز لہجے میں بولا---- "یہ تم لوگ کھانا کھا رہے ہو۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"ارد گرد دیکھو ذرا"

"دیکھا ہوا ہے۔"

رانی کے جوابات پر میں اور بھڑکا تڑ کر بولا "یہ نہیں ہو سکتا کوئی کمرہ ڈرائنگ روم ہی بنا لیا جائے----"

قمو کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔ آج کل نئی نئی تجاویز کو پیش کرتا رہتا تھا۔

لیکن رانی کو غصہ آ گیا۔ وہ بھی تڑاخ سے بولی۔ "اتنا ہی خیال ہے تو ہوا دو تا کرسیاں میز---- کھانے کا کمرہ بناتے ہمیں کون سی دیر لگتی ہے خرید لاؤ ڈائننگ سیٹ۔"

"تمہارے لئے تو خریدا جا چکا ہے نا" میں نے طنز کیا۔

"راجو----" رانی کا پارہ چڑھ گیا۔

"آہستہ بولو رانی باجی۔ پتہ تو ہے آپ کو۔ ابا جی ابھی بمشکل سوئے ہیں کتنی تکلیف رہی ہے انہیں----"

"کیا ہوا ابا جی کو" میں اڑتے اڑتے اچانک دھچکا لگنے سے پھر اپنی زمین پر آ گیا۔ میں قمو اور رانی کے قریب ہی پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور ابا جی کے متعلق پوچھنے لگا۔

"تمہیں کیا" رانی آنسو پونچھنے لگی---- "آج کل تم نے تو طنز کرنا سیکھ لیا ہے۔ کبھی امی سے لڑتے ہو، کبھی مجھ پر طنز کرتے ہو اور کسی بات کی خبر ہی کہاں ہے تمہیں۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ قمو بولی "آج شام ابا جی کے پیٹ میں بہت تکلیف تھی۔"

"مجھے بتایا ہی نہیں" میں بے اختیار بولا۔

"تم تھے کہاں۔ دوستوں کے ساتھ اونچی اڑان ہو گئی ہے تمہاری" رانی گہری سانس لے کر بولی۔

میں نادم ہو گیا۔

قمو ابا جی کی تکلیف کا تفصیل سے بتانے لگی۔ میں اداس اور غمزدہ نظر آنے لگا۔ شادی قریب تھی۔ ابا جی بیمار ہی رہنے لگے تھے۔ میں اپنے آپ سے دور ہو رہا تھا۔ بٹ رہا تھا۔ ذات میں تقسیم ہو رہا تھا۔

یہ یقیناً بڑی بات تھی۔

میں نے رانی کے گلے میں حسب معمول پیار سے بانہیں ڈالی تھیں---- وہ بے اختیارانہ رونے لگی۔ قمو بھی اپنی پیاری پیاری آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھنے لگی۔

میں اپنے اندر ہی اندر کٹ گیا۔ سچائی سے حقیقت کا اعتراف ان لمحوں میں ناگزیر تھا۔ میں نے عہد کر لیا کہ اب سنجیدگی سے نوکری کے لئے دوڑ دھوپ کروں گا۔ مجھے ابا کا بازو بننا ہی تھا۔

اسی رات میں ٹھیک طرح سو بھی نہ سکا۔ پلان بناتا رہا اور حقیقت کو پوری سچائی سے تسلیم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

○ ☆ ○

گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا چاروں پھوپھیاں اور دونوں خا... ... مع بچوں کے تین چار دن سے آئی تھیں۔ رات کھانے کے بعد باقاعدگی سے ڈھولک پیٹی جاتی تھی۔ رشتہ داروں کے علاوہ محلے کی لڑکیاں' بالیاں اور عورتیں بھی آجاتی تھیں---- اور سہاگ کے گانے گاتے ہوئے رانی کی ازدواجی زندگی کی کامرانی کی دعائیں کرتی تھیں۔

ان دنوں میں بے حد مصروف تھا۔

شکیل کی گاڑی میرے پاس تھی اور میں منٹوں میں کام نپٹا رہا تھا چونکہ ہمارے گھر کی یہ پہلی شادی تھی اس لئے اہتمام زیادہ ہی ہو رہا تھا لوگوں پر رعب بھی تو بٹھانا تھا۔ برتری بھی تو حاصل کرنا تھی۔

یہ سوچ میری نہ تھی۔ میرے والدین کی تھی۔ امی نے رکھی رکھائی پونجی دل کھول کر خرچ کر ڈالی تھی۔ ابا نے فنڈ میں سے پیسہ نکلوایا تھا۔

زیور امی کے پاس کافی تھا۔ اسی میں سے رانی کے لئے رکھا گیا تھا۔ کپڑا تو امی جانے کب سے جمع کر رہی تھیں۔

خوب دھوم دھام سے شادی ہو رہی تھی۔ تایا جی تو تھے ہی صاحب حیثیت۔ لیکن ہم نے ان سے ماتھا لگایا تھا۔ تو اسراف کرنا ضروری بھی تھا۔ ہم اپنی ناک اونچی رکھنا چاہتے تھے۔

امی کو باقی دو بیٹیوں کے متعلق اس وقت سوچ تھی نہ فکر۔ صرف رانی کا خیال تھا۔

وہ بیٹی کو لادپھاند کر رخصت کرنے والی تھیں۔

اباجی کے پیٹ کی تکلیف اب مستقل ہی ہو گئی تھی۔ ان کی گلابی رنگت اب سپید پڑتی جا رہی تھی---- آنکھوں کے گرد بھی حلقے سے تھے میں محسوس کر رہا تھا لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتے۔

"رانی کی شادی کا بار ہے سب۔ شادی ہو جائے تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

میں بھی چپ ہو جاتا۔ شادی کی ٹنشن تو تھی ہی---- خود میں بھی ان دنوں بیمار بیمار سا لگتا تھا۔ کام تھوڑا تو نہ تھا۔ گو خاندان اور محلے کے نوجوان لڑکے اور مرد سب ہی ہاتھ بٹا رہے تھے۔ پھر بھی ذمہ داری کا احساس تھا۔

دوڑ دھوپ کے باوجود ان دنوں میں بہت خوش تھا۔

اس خوشی کی وجہ زیبی تھی۔

روزانہ وہ ہمارے گھر آ رہی تھی۔

جب وہ قمو' رضیہ اور بانورانی کے جوڑے ٹانک رہی تھیں۔ تب وہ دو دن اور دو راتیں ہمارے ہاں ہی رہی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد وہ جوڑے ٹانکنے بیٹھ جاتیں۔ میں بھی وہیں براجمان رہتا۔

"لاؤ تاگا ڈالتا جاؤں سوئیوں میں" میں زیبی سے کہتا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ زیادہ لمبا نہ ڈالنا" وہ سوئیاں اور رنگا رنگ دھاگے کی ریلیں میرے سامنے کر دیتی۔

"یہ قمیض تہہ کر دوں" میں پوچھتا۔

"نہیں تم زیادہ ہاتھ نہ ہی بٹاؤ" وہ مسکرا کر مجھے دیکھتی۔

"اچھا اس دوپٹے پر استری کر دوں۔"

"بھئی نہیں۔"

"تو یہ ٹانکا ہوا جوڑا بکس میں رکھ دیتا ہوں۔"

"ضروری ہے کہ لڑکیوں کے کام تم بھی کرو۔"

"ہاں۔"

وہ ہنس پڑتی اور میں اس کے کلیوں ایسے دانت سفید دیکھ کر مسحور ہو جاتا۔

سارا دن یہ لڑکیاں سامنے والے دالان میں دری ڈالے جوڑے ٹانکتی رہتیں اور میں ان کے ساتھ گھسا رہتا---- انہیں لطیفے سناتا ہنساتا اور خوشی سے سرشار ہو جاتا۔

رات فارغ ہو کر یہ ڈھولک لے بیٹھتیں۔ عام طور پر نو عمر لڑکیاں ہی ڈھولک پر گانے گاتیں۔ رشتہ دار لڑکے بھی آجاتے۔ بزرگ نیچے صحن میں جمع ہوتے اور ہم سب چھت پر دری بچھا لیتے۔

موسم رنگین تھا زیادہ سردی تھی نہ گرمی اس لیے چھت پر کھلے آسمان تلے گانا بجانا اور بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ چاندنی بھی نکھرتی جاتی تھی۔ اور خنک سی فضا بڑی رومان پرور تھی۔

کبھی یوں بھی ہوتا۔ کہ ماہیے کے ٹپے گانے کے لیے الگ الگ ٹولیاں بن جاتیں' مقابلہ ہوتا ---- ایک ٹولی ٹپہ گاتی اور اس کے ختم ہوتے ہی دوسری ٹولی جوابی ٹپہ گاتی۔ ذرا سا بھی ٹپہ پڑ جاتا ---- تو جیتنے والی ٹولی شور مچا دیتی۔

''اوئے اوئے اوئے'' کے فلک شگاف نعرے لگتے' تالیوں کی سنگت ہوتی۔

اور

جب شور کچھ زیادہ ہی بڑھتا۔ تو نیچے صحن میں بیٹھے بزرگ زور سے ڈانٹ دیتے۔

''شور مت کرو۔ آرام سے گاؤ بجاؤ.....''

ہم پر بھلا کہاں اثر ہوتا۔ لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر شوخ ہوتی تھیں۔ اور لڑکے لڑکیوں کی قربت سے شرارتی ہو رہے تھے۔

جب بھی ماہئے کے ٹپوں کا مقابلہ ہوتا میں زیبی کی مخالف ٹولی میں شامل ہوتا۔

اور

پھر

دل کی باتیں ہم ٹپوں کے حوالے سے ایک دوسرے کو پہنچاتے۔ رضیہ ڈھولک بہت اچھی بجاتی تھی۔ بانو روڑا ڈھولک پر مارنے کی ماہر تھی۔ جس قسم کا گیت ہوتا..... دونوں اسی طرز کی ڈھولک اور روڑا بجاتی تھیں۔ زیبی رضیہ کے ساتھ بیٹھتی..... اور اپنے سنہری سنہری ہاتھوں سے تالیاں بجاتی تھیں۔

میں اس کے عین سامنے بیٹھ جاتا..... اور دل کی کیفیت کا ترجمان ٹپہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گاتا۔

کبھی تو وہ شوخی سے جواب دیتی۔ کبھی شرما کر کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو جاتی۔

آج رانی کی مایوں کی رسم ہونا تھی۔ سرشام ہی مہمان آگئے تھے۔ گھر لوگوں سے بھرا تھا۔ بچوں کی بھرمار تھی۔ نئے نئے کپڑے پہنے وہ کرکرے لگاتے پھر رہے تھے۔ عورتیں بھڑکیلے لباسوں میں تھیں۔ زیوروں سے لدی تھیں۔ اور آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر لالی جمائی تھی۔ لڑکیاں بالیاں بھی اپنے بہترین لباسوں میں تھیں۔ کسی نے غرارہ پہنا تھا۔ کسی نے سارے سوٹ پر بکھرے ہوئے جال کا دوپٹہ اوڑھا تھا۔ کسی نے گوٹے سے لدا ہوا لباس زیب تن کیا تھا۔

زیبی نے چست پاجامے کے ساتھ کرتا پہن رکھا تھا۔ فیروزی پاجامہ اورنج کرتا اور فیروزی دوپٹہ..... پاجامے پر بھی کامدانی کام تھ [illegible] ٹے پر بھی کرتا سادہ تھا۔ جس پر اس نے سونے کے زنجیروں والے بٹن لگا رکھے تھے۔ میں [illegible] ل سج دھج دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ خوبصورت تو تھی ہی اس لبا [illegible] نے خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

میں کام میں بہت مصروف تھا۔ بار بار اوپر نیچے آ رہا تھا۔ میں سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اور وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ عین درمیان میں ہمارا ٹکراؤ ہوتے ہوتے بچا۔

''دیکھ کر نہیں اتر سکتے'' وہ ادائے ناز سے بولی۔ میں مبہوت سا اسے تک رہا تھا۔ جہاں تھا

وہیں کھڑا رہا۔

''بھئی ہٹو نا راجو اوپر جانے دو.....''

''اگر نہیں ہٹوں تو۔''

''یہ کیا بات ہوئی..... اوپر سب لڑکیاں ہیں۔ میں نے بھی جانا ہے.....''

''تو جاؤ۔''

میں نے بازو پھیلا کر راستہ روک لیا۔ وہ شرما گئی۔

''جاؤ نہ جاتی کیوں نہیں.....

''تم ہٹو تو..... راستے سے۔''

''میں تو راستے سے کبھی ہٹوں گا نہیں۔''

''ہائے راجو۔''

''ہائے زیبی۔''

''دیکھ راجو۔''

''ہوں۔''

''کوئی آجائے گا۔''

''تو کیا ہوا۔''

''کیا کہے گا۔''

''جو جی میں آئے۔''

''ڈھیٹ ہو گئے ہو۔''

''ہاں۔''

''کیوں۔''

''تمہیں دیکھ کر۔''

اس نے شوخی سے نظریں گھمائیں..... میرا جی چاہا اسے بازوؤں میں بھر لوں۔

''زیبی۔''

''ہوں۔''

''بہت اچھی لگ رہی ہو۔''

وہ شرما گئی۔

''جی چاہتا ہے تمہیں دیکھتا ہی چلا جاؤں۔''

''ہائے راجو..... کیا ہو رہا ہے تمہیں۔ ہٹو سامنے سے مجھے راستہ دو.....

میں شاید اب بھی راستہ روکے رہتا۔ لیکن اوپر سے کوئی نیچے آ رہا تھا۔۔۔۔۔

مارے گئے" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں نے بازو ہٹا لیا اور جلدی سے زیبی کو راستہ دے دیا۔

وہ مجھ پر بے اختیارانہ ہنس رہی تھی۔

میں تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اور وہ اوپر چلی گئی۔

رات خوب رونق اور گہما گہمی تھی۔ ڈھولک پر ادھورے ادھورے خوشی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ سہاگ گیتوں کا نشہ البیلی کنواریوں کے ذہنوں پر چھا رہا تھا۔

سہاگنیں ان گیتوں کی عملی صورت سے آگاہ تھیں۔ اس لیے خوب مست ہو رہی تھیں۔ قہقہے تھے شور تھا۔ ہلا گلا تھا۔

قمو اور زیبی مہندی کے تھال اٹھائے آ گئیں۔ لڑکیوں نے تھالوں میں مہندی سجائی تھی۔ رنگ برنگے کاغذ۔ گوٹے کناری اور سنہری لڑیاں مہندی کے تھالوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔ ہر تھال میں موم بتیاں روشن تھیں۔

قمو اور زیبی نے چاروں تھال سہاگنوں کو دے دیئے۔ میراثنیں بھی آئی ہوئیں تھیں۔ وہ تیز تیز اور کھڑکے وار ڈھولک بجانے لگیں۔ میرے رشتے کی بھابیاں شادی شدہ کزنیں، ممانیاں، چچیاں، پھپھیاں سب باری باری تھال اٹھا کر گھیرے کی صورت میں ناچنے لگیں۔ ناچنا کسی کو کیا آتا تھا۔ بس خوشی کا اظہار ہی تھا۔ جب کوئی خاتون مہندی کے تھال لے کر درمیان میں آتی اور مہندی ناچتی ۔۔۔۔۔ تو امی اور دیگر خواتین اس پر سے روپے وار وار کر میراثنوں کو دیتیں۔ میراثنیں اونچی آواز میں ویل دینے والے کا نام لے کر پکارتیں ۔۔۔۔۔ دعائیں دیتیں اور پیسوں کی گرمی میں اور تیزی سے ڈھولک بجانے لگتیں۔

عورتوں کے بعد تھال لڑکیوں کو دے دیئے گئے۔ خاندان کی بہت سی لڑکیاں تھال لے کر لڈی ڈالنے لگتیں۔ ان میں زیبی بھی تھی۔ قمو اور زوبی تھی۔

لڑکوں کو شرارت سوجھی تو وہ بھی میدان میں آ گئے۔ لڈی کا باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ سرور، اعجاز، نسیم، قمر اور احمد تو کمال کی لڈی ڈالتے تھے۔ خوب تالیاں بجنے لگیں۔ داد دی جانے لگی۔ مجھے جوش آیا اور میں بھی لڈی ڈالنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اب تو جوش و خروش بہت بڑھ گیا۔ تالیوں کے ساتھ ساتھ ہو ہا کی چہکار بھی زور پکڑنے لگی۔ دائروں میں گھومتے ہوئے زیبی اور میں بالمقابل آ جاتے۔ وہ مجھے پیار سے مسکرا کر دیکھتی میں اس پر نچھاور ہو جانے کے انداز میں اسے تکتا۔

سب بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔ میری امی تو مجھ پر روپے وار وار کر تھک گئی تھیں۔ میں

نوٹ کر رہا تھا کہ وہ زیبی پر بھی بڑے والہانہ انداز میں روپے وار رہی تھیں۔

مقابلہ کافی دیر تک ہوتا رہا۔

"شاباش۔۔۔۔۔ شابا۔۔۔۔۔ شابا" کی آوازیں تالیوں اور ہو ہا کے ساتھ گونج رہی تھیں۔

پھر شاید میراثنوں کے ہاتھ شل ہونے لگے۔ ڈھولک کی آواز انتہا کو پہنچی۔

اور

پھر ڈھولک تھم گئی۔

لڈی ڈال ڈال کر میرا برا حال ہو رہا تھا۔ سانس پھول رہا تھا۔ ٹانگیں تھک گئی تھیں۔

ڈھولک کی تھاپ رکی تو سب ایک دوسرے کے اوپر گرے۔ لڑکیوں نے چیخیں مار مار کر شور مچا دیا۔ لڑکوں کی ہنسی اور قہقہے اس شور میں اضافہ بن گئے۔

پھر رانی کو مایوں بٹھایا گیا۔ زرد سوتی سادہ کپڑوں میں جھکی جھکی رانی صحن میں عورتوں کے سنگ آئی اور چوکی پر بیٹھ گئی۔

ڈھولک ایک بار پھر گرما گرمی میں بجنے لگی۔ عورتیں سہاگ گیت گاتے ہوئے رانی کے سر میں تیل ڈالنے لگیں۔

شور شرابا بہت تھا۔

مجھے ابا جی نے نیچے سے آواز دی۔

"آیا جی" میں رسم دیکھ رہا تھا۔

ابا جی نے پھر پکارا تو مجھے نیچے آنا پڑا۔ نیچے صحن میں رشتہ دار بیٹھے تھے۔ کوئی تایا تھا کوئی چچا کوئی ماموں کوئی خالو۔۔۔۔۔ محلے کے مرد بھی بیٹھے تھے اور بزرگ عورتیں بھی تھیں۔۔۔۔۔ جو ہلا گلا میں شریک نہ تھیں۔

"جی ابا جی" میں نے ابا جی کی کرسی کے پاس آ کر پوچھا۔

"بھئی سارا انتظام ہو گیا ہے۔"

"جی۔"

"برات کے بٹھانے کا بندوبست۔"

"سب کر لیا ہے۔ خیر چچا اور عمرو چچا کے گھروں میں مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا ہے۔"

"اور عورتیں۔"

"عورتیں یہیں اپنے گھر میں بیٹھیں گی۔"

"کھانے کی دیکھ بھال کس کے ذمہ ہے۔"

"جعفر ماموں اور نفیس بھائی کے۔"

ابا جی مجھ سے انتظام کے متعلق پوچھتے رہے۔ دو تین دنوں سے پھر ان کی طبیعت خراب تھی۔ اس لئے ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر ہی تھی۔

میں نے اس ذمہ داری کو اتنی خوبصورتی سے نبھایا کہ ابا جی دنگ رہ گئے مجھے وہ لاپرواہ اور کھلنڈرا سمجھتے تھے میں نے رانی کے بیاہ پر ان کی امیدوں سے بڑھ کر خوش اسلوبی سے کام کیا اور لاپرواہی اور کھلنڈرے پن کا لیبل میرے ماتھے سے اتر گیا۔ شکیل نے میرا بڑا ہاتھ بٹایا۔ ذمہ داری نبھانے میں اس نے بھی مدد کی۔

رانی کی شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ براتیوں کی اتنی آؤ بھگت اور عزت ہوئی کہ اس بات کے چرچے ہونے لگے۔

جہیز بھی امی نے کافی جمع کیا ہوا تھا جب سامان لد کر گیا تو اہل محلّہ اور رشتہ داروں نے کئی دنوں تک چرچے کئے۔

میں رانی کے جانے سے کئی دن ملول و اداس بھی رہا۔ گھر ایک دم خالی خالی لگنے لگا تھا۔ کتنی رونق تھی رانی کے دم سے میں اس کے جانے کے بعد جان پایا۔

○ ☆ ○

"بھئی کیا ارادہ ہے" میں نے شکیل سے کہا۔

"چائے پئیں گے" وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔

"تو چلو اندر۔"

"نہیں۔"

"کیوں۔"

"میرے دو مہمان اور بھی آ رہے ہیں۔"

"ریناباجی اور آفاق بھائی۔"

"نہیں۔"

"تو اور۔"

"مس رخشی نوید اور مونا شان۔"

"کیا؟۔"

وہ مسکرانے لگا۔ ہم دونوں ہلٹن کے بیرونی برآمدے میں کھڑے تھے شکیل نے گاڑی گیٹ کے قریب ہی پارک کر دی تھی۔ مجھے اس نے کل ہی چائے کے لئے کہہ دیا تھا اور میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا تھا۔ شکیل کی صحبت میں اب میں ایسی جگہوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ خوداعتمادی بھی آ گئی تھی۔ اس خوداعتمادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب شکیل میرے مالی حالات سے آگاہ تھا۔

رخشی سے ان دنوں شکیل فلرٹ کر رہا تھا۔ اسے لئے لئے پھرتا تھا۔ کبھی کلب کبھی ہوٹل، کبھی لمبی ڈرائیو پر نکل جاتا۔ لڑکیوں سے دوستی لگاتا اور اسے دیر تک نہ نبھانا اس کی ہابی تھی۔ یہ لڑکیاں بھی جانے کیسی تھیں کہ دوستی لگاتیں اور جب دوستی ٹوٹتی تو خودبخود الگ ہو جاتیں۔ یوں لگتا وقت گزاری کے لئے یہ مشغلہ اختیار کر لیتی ہیں۔

شکیل کی منگنی اپنی چچا زاد سے ہو چکی تھی۔ وہ لوگ ان دنوں انگلینڈ میں تھے۔

شکیل کے ڈیڈی بھی اپنا ایک آفس انگلینڈ میں کھول رہے تھے۔ بنیادی کام شکیل کے چچا

ہی کر رہے تھے۔ شادی تک شکیل آزاد تھا اور اس آزادی سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"شکیل" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہوں۔"

"رخشی کو تو تم نے مدعو کیا ہے۔ اپنی گرل فرینڈ کے طور پر۔"

"ہوں۔"

"لیکن وہ مونا شان کس زمرے میں آتی ہے۔"

"تمہارے میں۔"

"شکیل۔"

"کیوں بدک گئے۔"

"مجھے یہ بات پسند نہیں۔"

"یار حد کرتے ہو۔ تم سا مرد میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ مونا لڑکی ہے چند گھڑیاں تم اس کے ساتھ گزار لو گے تم۔۔۔۔"

"شکیل۔۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"اس لئے کہ تم اپنی کزن میں انٹرسٹڈ ہو اور ڈرتے ہو کہ کہیں مونا سے انوالو نہ ہو جاؤں۔"

"یہی سمجھ لو۔"

شکیل نے اک قہقہ لگایا۔ شوخی سے بولا۔ "بدھو ہو۔"

میں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ مونا شان آ رہی تھی۔ یہ لڑکی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔۔۔۔ اور میں جانتا تھا کہ یہ میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ حیلے بہانے وہ میرے قریب آنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے تمہیں۔" شکیل نے ہنس کر پوچھا۔

"اجازت دو۔ تو میں چلا جاؤں۔"

"کہاں۔"

"گھر۔"

"کیوں۔۔۔۔ چائے نہیں پیو گے۔"

"پھر کبھی سہی۔"

"مونا سے ڈر کر بھاگنا چاہتے ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔۔۔۔"

"یار اتنی بری تو نہیں ہو۔۔۔۔ اچھی لڑکی ہے بے حد سمارٹ اور مقناطیسی کشش کی حامل۔۔۔۔"

"تو تم کھنچ جاؤ نا اس کی طرف۔"

"میں فی الحال رخشی کی طرف کھنچ رہا ہوں۔"

"شکیل۔ میں حیران ہوں۔۔۔۔ تم پر۔۔۔۔"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور ہوٹل کے اندر جانے والی تین عورتوں اور دو مردوں نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔

"دیکھو راج۔۔۔۔"

"ہوں۔"

"ایسی باتوں سے ڈرا نہ کرو۔ لمحے لمحے سے فائدہ اٹھانا سیکھو۔ مجھے دیکھو میری منگنی ہو چکی ہے۔ میں ریما سے بالکل مخلص ہوں۔ لیکن دوستی اپنی جگہ ہے۔ اس دوستی کا مجھے حق ہے اور یہ حق شادی سے پہلے پہلے استعمال کر لو تو کر لو۔ شادی کے بعد یہ حق بیویاں سلب کر لیتی ہیں۔ سمجھے۔"

میں نے بیزار سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ ہنس دیا۔

"میں واپس جا رہا ہوں" میں نے شکیل سے کہا۔ اس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا "میں نے دو لڑکیوں کا اچار ڈالنا ہے۔"

"مجھے نہیں پتہ۔ نہ ہی مجھے یہ بات پسند ہے۔۔"

"آج تو تمہیں رکنا پڑے گا۔"

"نہیں۔۔۔۔"

وہ کچھ خفا سا ہو گیا۔

میں نے خفت سے سر جھکا لیا۔ شکیل کے مجھ پر اتنے احسان تھے خلوص اور محبت کا اتنا بوجھ تھا کہ میں سر نہ اٹھا سکتا تھا۔

شکیل نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنی طرف کرتے ہوئے بولا "رخشی مونا کی دوست ہے۔ آج وہ آ رہی ہے تو تم میری خاطر رک جاؤ۔ گپ شپ ہی لگانا ہے نا۔۔۔۔"

میں نے شکیل کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

شکیل شہہ پا کر بولا "اتنا بڑا پرابلم تو نہیں دوست۔ پھر تم تو اداکاری میں پرائز یافتہ ہو' بہلا پھسلا لینا تھوڑی دیر۔۔۔۔"

مجھے شکیل کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ بے دلی سے بولا۔

"تمہاری خاطر یہ زہر بھی پی لیتا ہوں۔"

"بولڈ ہونا سیکھو۔ بولڈ۔۔۔۔" اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔۔۔۔

میں اس کے برابر برآمدے کے در میں کھڑا ہو گیا۔ ہماری نگاہیں گیٹ پر تھیں اور ہم دونو انتظار کی گھڑیاں سہل بنانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

لوگ آ جا رہے تھے۔ مرد بھی عورتیں بھی۔ شاید کوئی شادی کا فنکشن بھی تھا۔ ہمارے دیکھ ہی دیکھتے کئی گاڑیاں آئی تھیں۔ جن میں سے سرسراتے چمکیلے لباسوں والی عورتیں اور مرد ا رہے تھے۔

ہم ان لوگوں کو دیکھ کر ہولے ہولے تبصرہ کرنے لگے۔ شکیل کی نگاہیں صرف لڑکیوں تھیں۔ رنگ برنگے لباسوں اور میک اپ زدہ چہروں والی لڑکیاں قریب سے گزرتی تو للچائی نظروں سے انہیں دیکھنے لگتا کبھی کبھی ہائے وائے بھی کر لیتا۔

"شکیل" میں نے ڈر کر اسے جھنکارا۔۔۔۔ "کہیں کوئی لڑکی سن لیتی۔۔۔۔ تو۔۔۔۔"

"تو کیا ہوتا" وہ تمسخر سے ہنسا۔

"جوتے پڑ جاتے"

"تم اسی بات سے ڈرتے ہو۔ بزدل ہو۔"

میں کھسیانہ سا ہو گیا۔۔۔۔ وہ سیٹی میں کوئی دھن بجانے لگا۔

رخشی اور مونا ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

"بہت دیر لگا دی" میں نے کہا۔

"ہوں۔ من ہی من میں انتظار بھی کر رہے ہو" شکیل نے مجھے شوخی سے گھورا۔

"نہیں بھئی۔ انتظار گیا جہنم میں ویسے ہی وقت ضائع کر رہا ہوں۔"

"کوئی کام کرنا ہے۔"

"کام تو شاید قسمت میں ہی نہیں۔"

"او ہاں تمہارے اس انٹرویو کا کیا بنا۔ جواب آیا۔"

میں نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔ "نوکری ملنا مشکل ہی ہے۔"

"مایوس کیوں ہوتے ہو۔ ہاتھ پاؤں مار رہے ہو۔ کہیں نہ کہیں کام بن ہی جائے گا۔"

شکیل نے سگریٹ سلگا کر مجھے دیا۔ دوسرا خود سلگا لیا۔

میں خاموشی سے سگریٹ کے کش لینے لگا۔ میری نوکری کا مسئلہ خاصہ الجھا ہوا تھا۔ کئی جگہ اپلائے کیا تھا اگر کہیں سے جواب نہیں آتا تھا تو کہیں سے جواب آتا۔ انٹرویو کے لئے نہ بلایا جاتا کئی جگہ انٹرویو دیا اس کے بعد جواب نہ ملا تھا۔ میرے لئے شکیل بھی کوشاں تھا اس کے ڈیڈی

نے بھی اپنے صنعت کار دوستوں سے کہہ رکھا تھا لیکن کام ابھی کہیں نہیں بنا تھا۔

شکیل نے سگریٹ کے دو تین کش لئے پھر بولا۔ "مونا کے ڈیڈی بڑے اثر و رسوخ والے آدمی ہیں۔"

"بخدا۔۔۔۔" میں نے بے بسی سے شکیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے "آئندہ اس کا نام نہ لینا۔"

وہ مسکرانے لگا "بڑے الرجک ہو۔"

"مجھے ایسی لڑکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔"

"ضرورت کے وقت گدھے کو باپ کہہ لیا جاتا ہے۔"

"میں ان احمقوں اور موقع پرستوں میں سے نہیں ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ مت ذکر کرنا اس سے اپنی نوکری کا۔ ویسے کام ضرور بنا دیتی تمہارا۔"

"پلیز شکیل کوئی اور بات کرو۔۔۔۔"

"وہ دیکھو۔ کیا طرحدار لڑکی آ رہی ہے۔" شکیل نے ہنس کر کہا۔

اس نے کوئی اور بات ہی کرنا تھی نا

رخشی اور مونا پورا آدھ گھنٹہ لیٹ آئیں۔

ہم دونوں نے برآمدے کے کئی چکر کاٹے۔ باہر لان میں بھی گھومتے رہے۔ کئی موضوع پر گفتگو کی۔ میری نوکری میرے مالی حالات اور اباجی کی بیماری سب پر ہی ہم نے کھل کر بات چیت کر ڈالی۔

دونوں لڑکیوں کو لے کر ہم اندر آ گئے۔

شیشے کے بڑے سے دروازے پر کھڑے مغلیہ دور کے سے دربان نے جھک کر ہمیں تعظیم دی۔ مسکرایا۔۔۔۔ اور ہاتھ سے آگے جانے کا اشارہ کیا۔

ہم لاؤنج میں آ بیٹھے۔ کافی لوگ بیٹھے تھے۔ ہم ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔

رخشی بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں تو گم صم ہی تھا۔ ہاں مونا کی نظریں بار بار میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔۔۔۔

چائے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔

مجبوراً سب کو اٹھنا پڑا۔۔۔۔ میں مونا کی صحبت سے فرار چاہ رہا تھا۔ میں نے اپنی شخصیت اور اپنے وجود کو ایک حصار میں مقید کر لیا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ مونا کی پہنچ مجھ تک ہو سکے۔

○ ☆ ○

اور فاضل بھائی اباجی کی احوال پرسی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اباجی کی طبیعت اب زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ رنگت سپید پڑتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد بڑے واضح حلقے تھے۔ کمزوری بہت محسوس ہوتی تھی۔ پچھلے چند دنوں سے بھوک بھی ٹھیک سے نہ لگ رہی تھی۔

ہم سب بے حد پریشان تھے۔ امی تو ہر وقت کسی آنے والے سانحے سے ڈری سہمی رہتی تھیں۔

میں اباجی کو زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے مکسچر اور گولیاں دے دیں۔ اب تک اباجی گھریلو ٹوٹکوں پر ہی انحصار کئے ہوئے تھے۔ کبھی فروٹ سالٹ پی لیتے کبھی کارمینیٹو مکسچر کی خوراک حلق سے اتار لیتے۔ کبھی پہاڑی پودینے کا قہوہ بنوا لیتے۔

لیکن روگ اندر ہی اندر پل رہا تھا۔

ڈاکٹر کی دوائی سے بھی آفاقہ نہ ہوا۔ تو میں نے اباجی کو چھٹی لے کر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

جانے کیسے وہ میری بات مان گئے۔ ان کی چھٹی کافی بنتی تھی اس لئے مہینہ بھر کی رخصت لے لی۔ شاید وہ اب بھی اندر ہی اندر اتنی کمزوری محسوس کر رہے تھے کہ دفتر جایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ سارا دن اپنے کمرے ہی میں رہتے۔ امی ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں سخت متفکر اور پریشان۔

رانی نے سنا تو فورا آگئی---- اباجی سے لپٹ کر خوب روئی---- بیٹیاں پرائی ہو کر کچھ زیادہ ہی دردمند ہو جاتی ہیں۔

فاضل بھائی اس کا مذاق اڑانے لگے۔ "اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اداس ہو رہی تھیں---- تو پہلے کہا ہوتا---- میں تمہیں لے آتا----"

امی آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں اور اباجی بے طرح اداس ہو گئے----

"آؤ رانی" تھوڑی دیر بعد میں اسے وہاں سے اٹھا لایا۔

ہم سب سامنے والے کمرے میں آ بیٹھے۔ رانی کا جی اب بھی بھرا ہوا تھا۔ قمو کے گلے لگ کر پھر رونے لگی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئیں۔" میں نے پیار سے ڈانٹا حالانکہ ان کی دیکھا دیکھی میری آنکھیں بھی گیلی ہو گئیں۔

"رانی---- یہ کیا حماقت ہے بھئی۔" فاضل بھائی بھی آ گئے۔

"میرے اباجی" رانی نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ قمو نے دوپٹے میں منہ چھپا لیا---- اور میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے کاٹنے لگا۔

"اللہ خیر کرے گا۔ اباجی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تم تو یونہی جی تھوڑا کر رہی ہو" میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

"بالکل معمولی سی تکلیف ہے علاج سے رفع ہو جائے گی۔" فاضل بولے۔

پھر وہ ہم سب کو تسلی و تشفی دینے لگے جانے کیا بات تھی کہ دل بیٹھا ہی جا رہا تھا گھر کی فضا بے طرح مغموم اور اداس لگنے لگی تھی۔

فاضل بھائی ہم سب کو ہنسانے کی کوشش کرنے لگے ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر قمو سے بولے۔

"ہوں---- قمو اب سنا ہے گھرداری کے فرائض تمہارے ذمہ ہیں۔ بالکل اناڑی۔ ایک دم لاپرواہ۔

"کیوں؟" قمو دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ہنس پڑی۔

"بھئی کب سے آئے بیٹھے ہیں چائے نہ پانی آج خاطر داطر نہیں کرو گی۔

قمو اٹھتے ہوئے بولی "ابھی چائے بناتی ہوں۔"

وہ چائے بنانے کے لئے کچن میں گئی اور میں امی سے پیسے لے کر چائے کے لئے لوازمات لینے بازار چلا گیا۔

نمکین اور میٹھی چیزیں لفافوں میں لے کر گھر آیا تو قمو چائے بنا چکی تھی کیک، سموسے، برفی، دال سویاں اور مٹھائی اس نے الگ الگ پلیٹوں میں ڈال دیں۔

زوبی نے دو تپائیاں جوڑ کر رانی اور فاضل کے سامنے بڑی سی میز بنا دی۔ قمو چائے اور دوسری چیزیں لے آئی۔

"اوہ---- اتنا تکلف---- بھئی قمو یہ زیادتی ہے۔ میں نے تو صرف چائے پینا تھی۔"

"خالی چائے دیتی تو آپ کہتے خاطر نہیں کی۔"

"پگلی مذاق سمجھا کرو----"

"کوئی بات نہیں---- کھائیں آپ۔"

"آؤ راج تم بھی بیٹھو" فاضل بھائی نے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

رانی کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی۔

ہم سب نے چائے پی۔ اباجی کو ایک پیالی خالی چائے کی دے آیا اور امی کے لئے قمو چائے اور پلیٹ میں کھانے پینے کی چیزیں ڈال کر لے گئی۔

چائے کے دوران اباجی کی بیماری ہی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

"کسی ڈاکٹر کو دکھایا" فاضل نے پوچھا۔

"ہاں تین چار دن سے ڈاکٹر ہی کی دوائی لے رہے ہیں۔"

"پھر---- کچھ افاقہ----"

"فی الحال تو نظر نہیں آتا----"

"کیا کہا ہے ڈاکٹر نے۔"

میں نے سرہلایا---- میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ڈاکٹر نے اباجی کو دیکھا تھا اور دوائی دے دی تھی۔

"یہ دوائی ختم کر کے پھر دکھانا ہے۔" میں نے کہا "شاید ایکسرے کروانا پڑے۔"

"کیوں" رانی سہم گئی "ڈاکٹر نے کہا تھا؟"

"ہاں اس نے کہا تھا کہ اس دوائی سے افاقہ نہ ہوا تو مکمل چیک اپ کروانا ہو گا۔ ایکسرے بھی اور سٹول ٹسٹ بھی ہو گا"

رانی کسی خطرے کی بو سونگھ چکی تھی۔ بے حد پریشان ہو کر بولی "اباجی کو کافی دیر سے یہ تکلیف ہے۔"

"ہاں---- بس اپنی ہی کرتے تھے۔ سنتے تو تھے نہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کا تو نام ہی نہیں لیتے تھے----"

فاضل چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے "بہتر ہے انہیں کسی سپیشلسٹ کو دکھایا جائے۔"

"ہاں۔" رانی بولی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "میں آج ہی اپنے دوست سے بات کروں گا۔ وہ ٹائم لے لے گا۔ پھر اباجی کو لے جا کر دکھا دیں گے۔"

"بالکل، سستی نہیں کرنی چاہئے---- یہ نہ ہو بیماری بڑھ جائے۔"

میرے دل میں جیسے کسی نے گھونسا مارا---- میں نے آج تک بیماری کے بڑھنے اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کے متعلق سنجیدگی سے سوچا ہی نہ تھا۔

خدانخواستہ اباجی زیادہ بیمار پڑ گئے۔ تو علاج معالجے کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ رکھی رکھائی تو سب رانی کی شادی پر خرچ ہو گئی تھی---- کچھ قرض بھی لیا تھا۔ اباجی کی تنخواہ سے کیا کچھ ہو گا۔

اور خدا نہ کرے---- ابا کو کیا کچھ ہو گیا---- تو---- تو---- سوچنے کی مجھ میں ہمت ہی نہ تھی۔

فاضل بھائی شام چلے گئے۔

میں شکیل سے ملا---- "اباجی کو کسی سپیشلسٹ کو دکھانا ہے۔"

"ضرور----۔"

"تمہیں معلوم ہو گا کس کو دکھائیں۔"

"ڈاکٹر انوار ہیں---- ڈاکٹر غفاری ہیں---- ڈاکٹر منور ہیں----"

"تم کسی سے ٹائم لے لو۔"

"بالکل آج ہی لے لوں گا۔"

شکیل نے ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا۔ کل صبح دس بجے اباجی کو ڈاکٹر غفاری کو دکھانے لے جانا طے پایا۔

"میں گاڑی لے آؤں گا" شکیل نے کہا۔

"اچھا۔"

"یار فکر نہ کرو" ٹھیک ہو جائیں گے انکل غفاری بہت اچھے ہیں بڑے آرام سے دیکھتے ہیں---- خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی رکھی ہے۔"

میں واپس گھر آ گیا۔

رات میں اور رانی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھوڑی دیر کے لئے امی بھی آئیں اور قمو بھی۔

امی کو ہم نے بہت تسلی دی۔ وہ تو بے طرح گھبرائی ہوئی تھیں۔

وہ اٹھ گئیں تو میں نے مسکرا کر رانی سے کہا "ہماری امی بھی اتنے سے دل کی ہیں۔"

"کیا کریں" رانی بولی "ایک فکر تو نہیں انہیں---- میرے منہ میں خاک۔ اباجی کو کچھ ہو گیا تو---- تو----"

"رانی خدا سے خیر مانگو علاج ہو گا تو ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"راجو علاج معالجے کے لئے بھی پیسہ چاہئے نا---- تم شاید اس پہلو کو تو دیکھتے ہی نہیں۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

وہ بولی "تمہارا کام ابھی تک کہیں نہیں بنا---- دو تین سو کی نوکری بھی ہوتی تو فکر نہ تھا----"

"میں اپنی طرف سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔"
"کچھ امید نظر آتی ہے۔"
"فی الحال تو نہیں۔"
"پھر کیا بنے گا۔"
"میں کیا بتاؤں رانی---- ہر روز اشتہار دیکھتا ہوں۔ درخواستیں لکھتا ہوں۔ ریمائنڈر دیتا ہوں---- کہیں سے کام بننے کی امید ہی نہیں بندھتی۔"
رانی نے ایک طویل سانس لی---- "گھر کے اخراجات ہی کم کر دو۔ آج فاضل کے لئے اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ چائے پر بھی اور کھانے پر بھی۔"
"چھوڑو رانی----"
"یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اب دھیان میں رکھنا ہوں گی راجو۔"
وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر آبدیدہ ہو کر بولی "مجھے اپنے گھر میں خدا نے ہر خوشی دی ہے۔ فاضل جیسا شوہر ملا ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ لیکن راجے جب میں تم سب کے متعلق سوچتی ہوں۔ تو یوں لگتا ہے۔ ساری خوشیاں ہیچ ہیں۔"
میں چپ رہا۔
وہ پھر بولی "قمو جوان ہے---- اس کی شادی کا پہاڑ سر پہ پڑا ہے----"
"خدا مالک ہے" میں نے ہولے سے کہا۔
وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی "راجو تجھے نوکری نہ ملی---- تو----" وہ ہچکچائی۔
میں نے اس کی طرف دیکھا۔
پھر وہ خود ہی بولی "مشتاق کا پتہ ہے نا تمہیں۔"
"کون---- وہ شاکا----"
"ہاں جو دوبئی میں ہے"
"ہوں۔"
"ان کے گھر والوں کا بہت آنا جانا ہو رہا ہے۔ زیبی کے ہاں۔"
میں نے سپاٹ نگاہوں سے رانی کو دیکھا۔ میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔
رانی بولی "اس نے جو زمین خریدی تھی۔ اس پر سنا ہے کوٹھی بنوانا شروع کر دی ہے۔

بہت پیسہ کما رہا ہے وہ----"
رانی نے میری طرف دکھ سے دیکھا---- وہ میرے اک اک جذبے سے واقف تھی۔ پریشان ہو کر بولی "تمہاری نوکری لگ گئی ہوتی۔ تو ہم زیبی کو مانگ بھی لیتے۔ ان حالات میں تو سوال لے کر جا ہی نہیں سکتے----"
میں بے حد پریشان ہوا---- زیبی کو تو میں نے اپنی سمجھ رکھا تھا اتنی اپنی کہ اس پر کسی کا حق تھا نہ واسطہ---- وہ میری تھی۔ ازل سے میری تھی اور اسے میری ہی رہنا تھا۔
لیکن رانی کی باتیں بھی اک سچائی تھیں۔ ایسی سچائی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

○ ☆ ○

میں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا تو شرڑ شرڑ فرش دھونے کی آواز آئی۔ میں صحن کی طرف بڑھا۔ جیراں پانی کی نالی لئے فرش دھو رہی تھی۔

"جیراں-----" میں نے اسے پکارا۔

آواز سن کر وہ سیدھی کھڑی ہو گئی پانی نل سے تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس کی شلوار کے پائینچے بھیگے تھے اور کالے کالے پیروں پر جمی میل پانی پڑنے سے ابھر آئی تھی۔

"جی-----" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"زیبی کہاں ہے۔"

"اوپر۔"

"پھپھو۔"

"پتہ نہیں وہ بھی اوپر ہی ہوں گی-----"

وہ پھر سے جھک کر فرش پر جھاڑو چلانے اور نالی سے پانی ڈالنے لگی۔

میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

دوسری منزل کا صحن جیراں شاید پہلے دھو چکی تھی۔ اینٹیں خوب سرخ ہو رہی تھیں اور نچلی منزل میں روشنی اور ہوا کی خاطر چھوڑا ہوا جنگلہ بھی دھل دھلا کر ٹھنڈا ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ تینوں کمروں کے دروازے، کھڑکیاں کھلے تھے۔ صاف ستھرے کمرے تھے۔ ہر کمرے میں نواڑی پلنگ تھے دو دو کرسیاں تھیں۔ ایک ایک میز تھی۔ پلنگوں پر پلنگ پوش پڑے تھے۔ صاف ستھرے کمرے تھے کرسیوں پر کشن تھے اور کونے والی میزوں پر گلدانوں میں پھول سجے تھے۔

میں چند لمحے کھڑا رہا۔ اوپر سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے جیراں کو مغالطہ لگا ہے۔ اوپر کوئی بھی نہ ہو گا۔

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ گیا۔

اس منزل پر دو کمرے باورچی خانہ اور غسلخانہ تھا۔ سامنے کی جگہ کھلی تھی۔ جو بڑے سے صحن کا کام دیتی تھی۔ اس صحن کے ایک کونے میں لکڑی کا تخت بچھا رہتا تھا اور گلی کی طرف کی

دیوار کے ساتھ موتیے اور گلاب کے پودے گملوں میں رکھے رہتے تھے۔

زیبی کو پھول لگانے کا بہت شوق تھا۔ یہ گملے اسی نے منگوائے تھے اور ان میں لگے پودوں کی دیکھ بھال اور نگرانی خود ہی کرتی تھی ایف اے کے بعد تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی تھی----- اس لئے زیادہ وقت گھر کو سجانے بنانے میں گزارتی تھی۔

ہمارے گھر سے زیبی کا گھر بہت اچھا تھا۔ بہت سجا ہوا تھا اور نت نئی چیزوں کا اس میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

باورچی خانے کے سامنے بچھی چارپائی پر زیبی پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس نے سلیٹی رنگ کے پھولدار کپڑے پہن رکھے تھے۔ سلیٹی دوپٹہ کندھے سے ہوتا ہوا گود میں گرا تھا۔ سنہری رنگت کچھ ماند تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا----- لگتا تھا وہ تھوڑی دیر پہلے رو رہی تھی۔

میں پریشان پہلے ہی تھا۔ رانی کے وسوسوں نے ذہن کو ڈس لیا تھا۔ ایک اباجی کی بیماری دوسرے یہ وسوسے ذہن ماؤف سا ہونے لگتا تھا میں اس وقت زیبی سے ان وسوسوں کی یقین دہانی ہی کے لئے آیا تھا لیکن زیبی جس حال میں بیٹھی تھی----- میں اور پریشان ہو گیا۔

"زیبی" میں نے سیڑھیوں سے صحن میں آتے ہوئے اسے پکارا-----

اس نے بیٹھے بیٹھے سر اٹھایا میری طرف دیکھا وہ واقعی روئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ کومل سی ناک کی پھنک بھی سرخ تھی اور سنہری گالوں پر بھی سرخی پھیلی تھی۔

کچھ کہے بغیر اس نے سر جھکا لیا۔ پاؤں ہلاتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگی اور لمبی نیل پالش لگی انگلیوں پر دوپٹہ لپیٹنے اور کھولنے لگی۔

"زیبی-----" میں اس کے بالکل قریب آ گیا۔ بالکل احساس و خیال نہ رہا کہ پھپھو کبھی کہیں اوپر ہی ہیں اور مجھے زیبی کے اتنا قریب نہیں آنا چاہئے۔

اس نے پھر پہلے کی طرح میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"کیا ہوا زیبی" میں اس کے قریب ہی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

"ناراض ہو" میں نے پھر کہا۔

اس نے اک بے چین نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"پھپھو کہاں ہیں" میں نے پوچھا۔

اس نے صحن کی دیوار میں کھلنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا یہ دروازہ ساتھ والے گھر میں کھلتا تھا۔ اس گھر میں بھی ہمارے دور پار کے عزیز رہتے تھے۔

"شمو کے ہاں" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

خیریت۔"

"شمو کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ خبرگیری کو گئی ہیں" وہ اسی انداز سے دوپٹہ انگلیوں پر لپیٹتے ہوئی بولی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے" میں نے گردن جھکا کر اس کا چہرہ دیکھا

"کچھ نہیں۔"

"لگتا ہے روتی رہی ہو۔"

وہ چپ ہو گئی۔

میں نے مذاق میں طنز کیا "کہیں وہ دوبئی والے صاحب تو یاد نہیں آ رہے۔"

"راجو" وہ زور سے بولی اسے سخت طیش آ گیا تھا۔

میں پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "سنا ہے آج کل ان لوگوں سے خوب گاڑی چھن رہی ہے۔۔۔۔"

وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے تکنے لگی۔

میں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھے بغیر پھر طنز سے بولا۔ شاکا ٹڈا بڑا آدمی بن گیا ہے نا۔ سنا ہے کوٹھی بھی بنوا رہا ہے۔"

وہ جل کر بولی "تم طنز ہی کرتے رہنا۔۔۔۔"

میں ٹھٹک گیا۔

زبی کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح بہنے لگے۔ اس نے دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔

میں بت بن گیا۔ کچھ سمجھ نہ پایا کیا کہوں۔

وہ سسکیوں کے درمیان بولی "تمہیں بس باتیں بنانا آتی ہیں کر کچھ نہیں سکتے۔"

"میں۔ میں کیا کروں زبی" طنز و تمسخر جانے کہاں غائب ہو گئے میں بڑی بیچارگی سے بولا۔

"نوکری کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔ کتنی مدت سے بیکار پھر رہے ہو" اس نے دوپٹہ ہٹا کر بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا

اف اس کی بھیگی بھیگی سرخ سرخ آنسوؤں بھری آنکھیں۔ جی چاہا ان آنکھوں پر اپنے پیاسے ہونٹ رکھ دوں۔۔۔ پوری کی پوری زبی کو اپنے سینے میں اتار لوں۔

لیکن

میں نے ایسی جرات کبھی کی نہ تھی۔ میں نے تو کبھی اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ میرے جذبے بڑے شدید لیکن انتہائی پاکیزہ تھے۔

میں نے اپنے گھٹنوں پر کہنیاں ٹکا کر سر ہاتھوں پر گرا لیا۔ کچھ دیر میں یونہی بیٹھا رہا۔

زبی بڑبڑائی۔ "تمہیں پتہ بھی ہے کہ شاکے کے گھر والے ہمارے ساتھ مراسم بڑھا رہے ہیں۔ امی اور ابو بھی اس پر مفتوں ہیں۔۔۔۔ پھر بھی۔۔۔۔ تم کچھ نہیں کرتے اتنا طنز کرتے ہو۔۔۔۔ اس سے تو کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے سر اٹھایا۔ میں بے طرح اداس ہو رہا تھا۔ میرے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ رہا تھا۔۔۔۔ کرچیاں اندر ہی اندر چبھ رہی تھیں اور لہولہان کر رہی تھیں۔

"میں نے بہت جگہ درخواستیں دی ہوئی ہیں زبی۔۔۔۔ قسمت ہی خراب ہے کہیں کام ہی نہیں بنتا۔۔۔۔ دو ایک جگہ پہ جاب ملی بھی تو تنخواہ اتنی کم ہے کہ میں جاب کر ہی نہ سکا۔۔۔۔"

وہ بولی "تنخواہ کم ہے تو کیا ہوا۔ نوکری تو ہو گی نا۔۔۔۔"

"اتنی معمولی تنخواہ پر نوکری کر لوں۔"

"بیکاری کا لیبل تو اتر جائے گا نا۔"

میں نے زبی کی طرف دیکھا۔۔۔۔ میری نظروں کا دکھ اسے گھائل کر گیا۔۔۔۔

"لگتا ہے تمہارے گھر والے میری بیکاری۔۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ ہاں" اس نے میری بات کاٹ کر تیزی سے کہا

"کیا تم بیکار نہیں ہو۔۔۔۔ راجو۔۔۔۔ کوئی کس طرح۔۔۔۔ کوئی کس طرح۔۔۔۔"

غالباً وہ کہنا چاہ رہی تھی "کوئی کس طرح اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک بیکار آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دے گا۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔

میں بددل سا ہو کر بولا "زبی۔۔۔۔ تم بھی مجھ جیسے بیکار آدمی کو رد کر دو گی۔"

"راجو" وہ اپنی مٹھی منہ تک لے جاتے ہوئے بولی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔

میں نے ایک طویل گہری سانس لیتے ہوئے کہا "خوشیاں جب منہ موڑتی ہیں تو شاید ہر طرف سے موڑ لیتی ہیں۔"

وہ پھر رونے لگی۔

میں دل میں سوچ رہا تھا۔

وہ خود ہی بولی "آج امی پھر شاکے کے ہاں جا رہی ہیں۔۔۔۔ مٹھائی لے کر اس کی کوٹھی بننے

کی مبارک دینے۔۔۔۔"

میں کچھ نہیں بولا۔

"اس کا مطلب سمجھتے ہو نا" وہ دکھ سے بولی

میں کیا کرتا کیا کہتا۔

"میں نے امی سے اسی بات پر جھڑپ بھی لی ہے۔ میں نے انہیں سختی سے منع کیا۔ تو ڈانٹ پڑی۔۔۔۔"

"جبھی رو رہی تھیں۔"

"ڈانٹ پر نہیں۔۔۔۔ تمہارے ڈھکے چھپے حوالے پر۔۔۔۔ یقیناً میرے گھر والے اس ٹڈے کو تم پر ترجیح دینے کے حق میں ہو رہے ہیں۔"

مجھے بے حد دکھ اور افسوس ہوا۔۔۔۔ پھپھو تو اچھی طرح جانتی تھیں کہ زیبی میری بچپن کی پسند ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں اور وہ جذبے جو ننھے ننھے پودے تھے اب وقت کے ساتھ تن آور درخت بن چکے ہیں۔

"میں نے بھی امی کو ڈھکے چھپے الفاظ میں بتا دیا ہے" وہ جوش جذبات میں بہہ گئی۔

"کیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

میری سادگی پر وہ روتے روتے مسکرائی۔ پھر روٹھتے ہوئے بولی۔ "راجو سمجھا بھی کرو۔۔۔۔"

"میری تو عقل سمجھ پر پردے پڑتے جا رہے ہیں زیبی۔۔۔۔ کرتا کچھ ہوں ہوتا کچھ ہے۔ ادھر ابا جی بیمار ہیں۔۔۔۔ تمہیں پتہ ہے نا ان کی بیماری۔۔۔۔"

"بڑے ڈاکٹر کو دکھایا ہے نا۔"

"تین سپیشلسٹوں کو دکھایا ہے۔ ایک ہی بیماری سب نے بتائی ہے۔"

"انتڑیاں خراب ہیں۔"

"انتڑیوں کا کینسر ہے۔"

"ہائے اللہ۔"

زیبی نے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا۔ میں روہانسا ہو رہا تھا۔

"زیبی۔۔۔۔ میں بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لئے میری پریشانیوں میں اور اضافہ نہ کرنا۔۔۔۔"

میں نے پھر سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

زیبی ہراساں سی ہاتھ ملتی رہی۔

"راج" کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے مجھے پکارا اس کی آواز میں دکھ اور درد کا امتزاج بڑا واضح تھا۔

"ہوں" میں نے اپنی جلتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"ماما جی ٹھیک ہو جائیں گے نا۔"

میں جذبوں کی تڑپ سے بے تاب ہو کر بولا "کینسر لاعلاج ہے ز۔۔۔"

اس کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ میرا جی چیخیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے حالات کا شکنجہ چاروں طرف سے مجھے قابو میں کر رہا ہے۔ ابا جی بھی بچھڑ رہے تھے اور زیبی بھی چھنی جا رہی تھی۔

مجھے تو کسی وقت اپنا ذہنی توازن بگڑتا محسوس ہوتا تھا۔ رانی کے وسوسوں کی زیبی کی باتوں سے تصدیق ہو گئی تھی۔۔۔۔ میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہا تھا۔

"زیبی" میری آواز بھرا گئی۔

زیبی گیلی آنکھوں سے میری طرف تکنے لگی۔

"زیبی۔۔۔۔ تو نے۔۔۔۔ تو نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔۔۔۔ تا۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔۔۔۔"

دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی راجو۔۔۔۔" زیبی نے بھی بلا جھجک دل کی بات کہہ دی "چاہے کچھ ہو جائے۔"

میں نے تشکرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس نے بھی میری طرف دیکھا۔

ہم دونوں کی نگاہیں ایک تھیں اور مضبوط و مستحکم عہد کا اقرار کر رہی تھیں۔

○ ☆ ○

میں تکان سے چور چور تھا۔ دوپہر کا کھانا زہر مار کرتے ہی سامنے والے دالان کے ایک طرف بچھے پلنگ پر لیٹ گیا۔ صبح سے اس وقت تک ایک منٹ آرام نہ کیا تھا۔ آج گتے کی ایک فیکٹری میں ملازمت کے لئے انٹرویو تھا۔ سات بجے وہاں جا پہنچا تھا۔ امیدواروں کی قطار دیکھ کر جی چاہا تھا بھاگ نکلوں۔ کوئی امید نہ تھی۔ پھر بھی برآمدے میں بچھی کرسیوں میں سے ایک کو پرے ہٹا کر بیٹھ گیا تھا۔ میری باری پورے بارہ بج کر دس منٹ پر آئی تھی۔

مجھے پتہ ہوتا کہ انٹرویو برائے نام ہی لیا جا رہا ہے تو پانچ گھنٹے مسلسل کوفت میں نہ گزارتا---- بورڈ کے ڈائریکٹر جس انداز میں انٹرویو لے رہے تھے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ خانہ پری کر رہے ہیں۔

مجھ سے ایک صاحب نے جب یہ سوال کیا کہ یہ نوکری کیوں کرنا چاہتے ہو۔

تو

میں جو پہلے ہی دل جلا تھا پریشانیوں نے عقل و ہوش ٹھکانے لگائی ہوئی تھی۔ تڑاخ سے جواب دیا "پیسے کے لئے---- میں ضرورت مند ہوں اور آپ جیسے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوں----"

ان کی پیشانی پر میرے اس بے دھڑک جواب پر بل پڑ گئے بولے "بیکاری کا غصہ بورڈ کے ڈائریکٹر پر اتارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ نوکری کے لئے قابلیت دیکھی جاتی ہے۔ ضرورت نہیں۔"

میرا جی چاہا تھا کرسی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں۔

"شکریہ۔" میں نے بڑے گستاخانہ انداز میں کہا اور بغیر کوئی اور بات کئے کمرے سے نکل آیا۔

جلا بھنا شکیل کے ہاں آیا۔

"کیا بات ہے" اس نے ہمدردی سے پوچھا "اباجی کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں۔"

"اوہو۔"

"شکیل میں کیا کروں گا۔

"ہمت سے کام لو دوست۔ خدا کرے گا کہیں نہ کہیں کام بن ہی جائے گا۔"

"زیادہ تشویش تو اباجی کی ہے۔"

"شکیل ایک کینسر انہیں کھا رہا ہے۔ دوسرا کینسر مجھے---- مجھے یوں لگتا ہے کینسر کا منہ کھلا ہے اور وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو نگل جانے کے لئے بڑھ رہا ہے۔"

شکیل میری باتوں سے پریشان ہو گیا۔

میں نے صوفے کی پشت پر گردن ڈال کر آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ گاہے گاہے میں مایوسی سے سر ادھر ادھر جھٹک رہا تھا۔

شکیل میرے لئے کوک لے آیا۔

"راج" اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہوں"

"تو یہ پی لو۔"

"کیا۔"

"کوک۔"

"رہنے دو یار۔ کچھ جی نہیں چاہ رہا کھانے پینے کو۔"

"ہمت سے کام لو میرے دوست---- اس طرح کرو گے۔ [illegible] بنے گا۔"

"بن تو اب بھی کچھ نہیں رہا۔ نوکری مل رہی ہے۔ اباجی [illegible] ہو رہے ہیں۔ زمبی کا دھڑکا الگ ہے۔"

شکیل ایک دم کچھ نہ کہہ سکا۔ میری پوزیشن کو خوب [illegible]۔ بچارے نے خلوص و محبت کے بیشتر تقاضے پورے کرتے ہوئے میری مدد بھی کی تھی۔ اباجی کو ڈاکٹروں کے پاس لئے لئے پھرا تھا۔ کئی دفعہ فیس بھی خود ہی ادا کر دی تھی۔

لیکن

میری مصیبتیں یہاں تک محدود نہ تھیں۔ اباجی کی بیماری پر پیسہ پانی کی طرح لگ رہا تھا۔ اندر سے مالی طور پر ہم تو رانی کی شادی ہی پر خالی ہو گئے تھے۔ امی کے پاس کچھ زیور ہی کی صورت میں تھا تو تھا اور وہ بھی میں جانتا تھا کہ امی مجھ سے چوری چوری جعفر ماموں کی معرفت ایک آدھ زیور بکوا رہی تھی۔ ورنہ اخراجات کہاں سے پورا ہونا تھے۔

ہم لوگوں کے رسم و رواج بھی تو عجیب تھے ناں بیماری پر تو خرچہ اٹھ ہی رہا تھا آئے گئے نے

ناک میں دم کر دیا تھا۔ گھر میں ہر فرد پریشان تھا۔ اوپر سے مہمان ٹوٹ پڑتے تھے۔ کوئی بھائی کی خبرگیری کو آ رہا ہے۔ کوئی ماموں کا حال پوچھنے کوئی دیور کی خیریت دریافت کرنے......

پھر.....

آنے والے صرف خیریت دریافت ہی کرنے نہ آتے تھے دن گزارنے آتے تھے۔

بال بچوں سمیت آتے تھے۔ اپنے حالات سے ہم لوگ تنگ آئے تھے اوپر سے ان مہمانوں کی خاطرمدارت کرنا پڑتی تھیں۔

میں اور قمو کسی وقت جھنجھلا جاتے۔ بچوں کے شور شرابے سے تنگ آتے یا آؤ بھگت سے تھک کر منہ بنا لیتے تو امی ناراض ہوتیں "کیوں کئے دھرے پر پانی پھیرنا ہے۔ کوئی دل میں درد رکھتا ہے۔ تو دیکھنے چلا آتا ہے۔ اس طرح کرو گے تو کوئی قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ آخر کو یہی رشتہ دار عزیز سہارا ہوتے ہیں۔"

ہم دونوں چپ ہو جاتے۔ امی کی اپنی سوچ تھی انہوں نے اپنی زندگی کے جو رویے اپنائے ہوئے تھے ان حالات میں بھی وہ ان سے الگ ہونا نہ چاہتی تھیں۔

رانی تو خیر بیٹی تھی جب سے اباجی کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تھی وہ یہیں تھی۔ راحیلہ پھپھو بھی کئی دنوں سے آئی بیٹھی تھیں وہ ہم سب سے بہت پیار کرتی تھیں۔ گھر کے کام کاج میں بھی پوری طرح حصہ لے رہی تھیں پھر بھی ہمارے مالی حالات تو ان کے خرچے اٹھانے کے متحمل نہ تھے۔

شکیل نے مجھے تسلی و دلاسے دیئے۔ اس کی امی نے بھی شفقت سے سمجھایا۔ "ہمت سے کام لو سارے گھربار کی ذمہ داری اب تم پر ہے۔ تمہیں اس انداز سے نہیں سوچنا چاہئے۔"

"آنٹی مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا میں کیا کروں" میں بیچارگی سے بولا۔

"اس طرح تو تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا" وہ حسب عادت انگریزی میں تشویش ظاہر کرنے لگیں۔

شکیل چند لمحے سوچتا رہا پھر آہستگی سے بولا "ڈیڈی بھی اپنا بزنس وائنڈ اپ کر رہے ہیں۔ ورنہ....."

"میں جانتا ہوں" میں بولا "میں تمہیں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ مجھے نوکری دے دو....."

شکیل معذرت خواہ تھا بولا "یونہی بات کی ہے کاش نوکری دینا میرے بس میں ہوتا۔"

اس کی ممی بھی کچھ دیر چپ رہیں پھر پوچھنے لگیں "تمہارے اباجی کی نوکری کے سوا تمہارا ذریعہ آمدنی اور کچھ نہیں....."

"نہیں۔"

"سیڈ۔"

"کاش میں نے اباجی کی بات مان لی ہوتی اور بی اے کے بعد ہی کلرک بھی بھرتی ہو گیا ہوتا۔ اب تک کچھ تو پاؤں جما لئے ہوتے۔"

"ہوں" شکیل کی ممی بولیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں "میں آج شام ناصر اجمل سے ملوں گی"

"وہ کون ممی" شکیل نے پوچھا۔

"ان کی ٹیکسٹائل مل ہے۔ شاید کوئی جاب نکل آئے۔"

"ضرور ممی۔ ضرور کوشش کیجئے گا....."

"بھئی ریتا اور آفاق سے کہو۔ ان کے بہت سے ملنے والے ہیں بڑے بڑے صنعت کار۔"

"کہا تھا ان سے میں نے۔"

"پھر۔"

"کہتی تھیں کوشش کروں گی۔"

"بھئی اس سے کہو نا سنجیدگی سے کوشش کرے۔ راج کو بھائی کہتی ہے۔ تو اس کے لئے کچھ کرے بھی نا....."

میں ان دونوں کی ہمدردیوں سے مرعوب ہوتا رہا۔

شکیل نے زبردستی مجھے کوک پلائی۔

اب موسم خاصا بدل گیا تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی کسی دن بارش ہو جاتی جس سے موسم چند دن اور خوشگوار ہو جاتا..... مجھے تو ان دنوں موسم کا ہوش تھا نہ دنوں کا بس وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا چلا جا رہا تھا اور مصائب کم ہونے کی بجائے بڑھ رہے تھے۔

میں نے گھنٹہ بھر بیٹھنے کے بعد اجازت چاہی۔

"کھانا کھا کر جانا" ممی نے جیسے حکم دیا۔

"جی نہیں۔ دل بالکل نہیں چاہ رہا۔"

"تھوڑا سا سہی..... شکیل کے ڈیڈی آنے والے ہی ہیں کھانا ابھی لگ جائے گا۔"

"ہاں راج تکلف کی تو بات نہیں۔"

لیکن

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دل میں سکون نہیں تھا۔ ذہن درہم برہم تھا میں ان کے اصرار کے باوجود رکا نہیں۔

گھر جانے کو بھی کس کم بخت کا جی چاہ رہا تھا۔ اتنی ڈپریشن تھی ان دنوں کہ جی ہی نہ چاہتا

تھا۔۔۔۔ میرا چھوٹا سا پرسکون گھر جس میں ہر وقت ہم بہن بھائیوں کی ہنسی کی پھوار پھوٹا کرتی تھی اب سہم ڈر اور خوف کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

میں گھر پہنچا

سیدھا اباجی کے کمرے میں گیا وہ بستر میں آنکھیں بند کئے پڑے تھے امی ان کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ حمیدہ اور راحیلہ پھپھو پائینتی کی طرف بیٹھی ان کے پاؤں ہولے ہولے دبا رہی تھیں۔

اباجی

میرے اباجی

بستر سے لگ گئے تھے۔

چہرے پر زردی کھنڈی تھی اور گالوں کی ہڈیاں بڑی نمایاں تھیں۔ ان کی کشادہ پیشانی پر بے شمار سلوٹیں تھیں۔

میں جانتا تھا۔ یہ سلوٹیں تفکرات کے نشان ہیں۔

اباجی کو ان کی بیماری کے متعلق لاعلم رکھا گیا تھا۔ کسی نے نہیں بتایا تھا کہ انہیں کینسر آہستہ آہستہ چاٹ رہا ہے۔

لیکن

وہ خود اپنی حالت دیکھ رہے تھے۔

آگاہ تھے کہ عنقریب کچھ ہو جانے والا ہے۔ پھر بھی بڑا حوصلہ تھا۔ کبھی مایوسی کی بات نہ کرتے تھے۔۔۔۔ ایسا کوئی خیال آتا تو چپ ہو جاتے۔

یہ چپ بڑی اذیت دہ ہوتی تھی۔

میری امی نے میری مایوسی کو شاید میرے چہرے سے ہی بھانپ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اباجی کے سامنے انٹرویو اور اس میں ناکامی کا ذکر ہو۔ اس لئے جلدی سے بولیں۔

"کھانا کھا لیا ہے۔"

"نہیں۔"

میرا دل حلق میں آ رہا تھا۔ اباجی کو دیکھ کر چیخیں مار مار کر رونے کو جی کر رہا تھا۔

میری آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے۔ میرے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔

امی جلدی سے بولیں "جا جمیلہ اسے کھانا دے دے۔ صبح ہلکا سا ناشتہ کر کے گیا تھا۔ بھوک لگ رہی ہو گی۔

جمیلہ، امی نے آنکھ سے اشارہ بھی کیا

اباجی نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

"کیا حال ہے اباجی" میں ان پر جھک گیا۔ انہوں نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور ہولے سے بولے "جاؤ کھانا کھا کر آرام کرو۔ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"

میں آنسو حلق میں اتارتا سیدھا ہوا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

کھانا کھا کر میں دالان میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں ذہنی اور جسمانی طور پر تھک چکا تھا۔

○ ☆ ○

میں بڑے دالان میں کونے میں رکھے پرانی طرز کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ بجو اور ناجا دونوں بیٹھے سکول کا کام کر رہے تھے چھت سے لگا پنکھا کھر کھر کی آواز سے گھوم رہا تھا۔

ساتھ والے کمرے میں راحیلہ، جمیلہ اور قمو بیٹھی تھیں۔ رانی بھی ان کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ سب اباجی کی بیماری کی باتیں کر رہی تھیں۔

پھپھو راحیلہ نے قرآن پاک ختم کیا تھا اور جمیلہ پھپھو نے ان کی صحت یابی کے لئے سورہ یسین بہتر دفعہ پڑھی تھی۔

وہ سب باتیں کر رہی تھیں کبھی اونچی آواز میں کبھی دھیمی میں۔ میں کافی دیر سے اس دالان میں پلنگ پر بیٹھا سوچوں میں الجھا بیٹھا تھا۔ بجو کو حساب کے سوال بھی سمجھائے تھے اور ناجے کو تھوڑی سی اردو پڑھائی تھی۔ لیکن طبیعت پریشان تھی۔ نہ تو بجو کو حساب سمجھا کر دھیان بٹا نہ ہی ناجے کو پڑھائی کرا کے۔

آج کل مجھ پر دوہرے غم بلہ بول رہے تھے۔ اباجی کی بیماری اور گرتی ہوئی صحت ان کے سفر کی روانگی کی مظہر تھی۔ جب سوچتا تھا۔ تو دل بیٹھنے لگتا تھا۔ کینسر کے مریض تو جرمن، لندن اور نیویارک جا کر بھی صحت یاب نہ ہوتے تھے۔ گھر میں پڑے اباجی کے ٹھیک ہونے کا امکان کہاں تھا۔

دل ڈوبنے لگتا تھا اور گھبراہٹ سی حواس پر چھا جاتی۔ بچھڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

اور

پھر ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانا۔

میں اباجی کی صورت جب وہ سوئے ہوتے تو بڑی بڑی دیر تکتا رہتا اس سے تسکین ملنے کی بجائے طبیعت اور پریشان ہو جاتی۔

دوسری پریشانی زیبی کی طرف سے تھی۔ پھپھو پر جانے شاکے نے کیا جادو کر دیا تھا۔ دن رات اسی کے گن گاتی تھیں۔ اباجی کی احوال پرسی کو باقاعدگی سے آتی تھیں۔ لیکن کسی نہ کسی

حیلے شاکے کی امارت اس کی کمائی کا ذکر ضرور کرتیں۔

ان دنوں وہ اپنی دوسری بہن کے جہیز کی چیزیں شاید اکٹھی کر رہا تھا پھپھو ایک ایک چیز کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کرتیں۔

جو ہم ستم رسیدوں کو اچھا بھی نہ لگتا۔ میں تو سن ہی نہ سکتا تھا۔ اس دن زیبی نے میرا ساتھ دینے کا اقرار تو کیا تھا لیکن دھڑکا لگا ہی رہتا تھا گو اباجی کی حالت ہی ان دنوں دل و دماغ پر حاوی تھی۔

پھر

بھی

دل میں بسنے والے اس دھڑکے سے بھی مجھے انکار نہ تھا۔ یوں مت تھا ناکامیاں چاروں اور مجھے گھیر رہی ہیں۔

بددل ہو کر میں اٹھا۔ ململ کا کرتہ اور لٹھے کی شلوار پہنے تھا۔ کپڑے سلوٹ زدہ تھے لیکن میں نے پرواہ نہ کی شکیل کے ہاں گئے کئی دن ہو گئے تھے میں نے اس کے ہاں جانے کا سوچا۔

وہاں مجھے کچھ سکون ضرور ملتا تھا۔

یہ شکیل اور اس کے گھر والوں کا خلوص تھا۔ محبت تھی۔ مجھے جس طرح وہ دلاسہ دیتے تھے۔ پیار کرتے تھے۔ میں چند گھڑیوں کے لئے آلام بھول جاتا تھا۔

میں بالوں میں کنگھا کرتے رک گیا۔

جمیلہ پھپھو نے زیبی کی امی کا نام لیا تھا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں کواڑ سے لگ کر ان کی باتیں سننے لگا۔

جمیلہ، راحیلہ، رانی اور قمو اب اباجی کی بیماری سے ہٹ کر زیبی کی امی کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

جمیلہ نے جانے کیا کہا

راحیلہ بولی "بہت اچھا کیا تو نے۔"

رانی کی آواز آئی "بھئی ٹھیک ہے شاکا کافی کما رہا ہے لیکن پھپھو کو کچھ احساس کرنا چاہئے---- راجہ اور زیبی بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔"

"میں نے تو خوب لتے لئے فہمیدہ آپا کے" جمیلہ بولی "میں نے کہا آپا صرف دولت ہی نہیں دیکھنی چاہئے۔ شاکے کی تعلیم کیا ہے؟ چند سال پہلے ان کے گھر کی حالت کیا تھی---- آج پیسہ جڑ گیا ہے تو بڑے معتبر بن بیٹھے ہیں۔ صورت نہ شکل۔ بس پیسہ ہی پیسہ۔"

"پھر کیا کیا فہمیدہ آپا نے" راحیلہ پھپھو کی آواز میں تجسس تھا۔

"کہتی کیا---- میں نے کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ دل میرا بھی جلا ہوا تھا۔ غضب خدا ہمارے بھائی کی یہ حالت اور وہ ہیں کہ شاکے کی جینزوں شاکے کے پیسوں کا تذکرہ ہی کئے جاتی ہیں۔"

"بھئی جمیلہ پھپھو ہمیں سناتی ہیں" رانی نے کہا "ہمارا بھائی بیکار جو ہے بیچارہ۔"

"بیکار ہے تو کیا سدا بیکار ہی رہے گا۔ ایم اے پاس بھی تو ہے ماشاء اللہ بیچارے کو باپ کی وجہ سے کچھ سوجھ بوجھ ہی نہیں رہا۔ ورنہ کیا نوکری نہ ملتی اسے اب تک۔"

"ہاں" رانی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"یہ رشتہ کہیں نہیں ہو سکتا" جمیلہ بولی "ہم بھلا زیبی کو کسی اور گھر کی بہو بننے دیں گے۔"

رانی نے دکھ بھری آواز میں کہا "ہمارے حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ اللہ جانے کیا ہو گا----"

"خدا بہتر کرے گا" راحیلہ روہانسی تھی۔

"فہمیدہ آپا کو میں قائل کر کے رہوں گی۔ ایک دو دفعہ اور جھڑپ لی نا تو سیدھی راہ پہ آ جائیں گی۔"

قمو آہستگی سے بولی "زبردستی چھین لیں گی زیبی کو۔"

"زبردستی کیوں۔ آپا کو قائل کروں گی۔ تھوڑی تھوڑی تو قائل ہوئی ہیں آج۔" جمیلہ نے کہا۔

"ہمارا راجہ ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔ صورت سیرت تعلیم کس میں کم ہے نوکری بھی لگ ہی جائے گی۔ جمیلہ پھپھو میری خوب تعریفیں کرنے لگیں۔

رانی مایوس تھی دکھ سے بولی "نوکری لگ گئی ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔ قسمت کی بات ہے نا۔ ڈگری ہاتھ میں ہے اور نوکری نہیں مل رہی۔"

قمو کو رانی سے اتفاق نہ تھا بولی "نوکری ملتی تو ہے۔ پر کرتے نہیں نا۔ چھوٹی موٹی نوکری کو تو راجہ خاطر ہی میں نہیں لاتے۔"

راحیلہ پھپھو کی آواز آئی "چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لینی چاہئے۔ ہاتھ میں کچھ تو ہو۔ بہتر کی جستجو کرتا رہے۔ جب مرضی کی نوکری مل جائے تو چھوڑ دے۔"

"پھپھو اب تو راج بیچارہ معمولی نوکری پر بھی آمادہ ہے۔ قمو تو جانے کس وقت کی بات کر رہی ہے۔ اباجی کے دفتر میں کلرک کی آسامی خالی تھی جب وہ کلرکی پر آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا----"

"کلرکی اس کے ساتھ جچتی بھی تو نہیں" جمیلہ پھپھو نے کہا "پھر اتنا پڑھ لکھ کر بھی کلرکی

کرنا تھی تو پڑھنے کا فائدہ۔ میٹرک کے بعد ہی کہیں نہ کہیں پاؤں اڑ سکتا تھا۔"

"لیکن اب تو----" رانی کی آواز رندھ گئی "اباجی بیمار پڑ گئے ہیں۔ راجے کو معمولی سی نوکری بھی مل جائے تو غنیمت ہے کہیں پاؤں تو جم جائیں۔"

"وہ خود بھی سمجھتا ہے۔ مارا مارا پھر رہا ہے۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ ایک باپ کا غم دوسرے روزگار کی فکر----" پھپھو جمیلہ ہمدردی سے بولیں۔

"ساتھ یہ بھی دھڑکا کہ پھپھو فہمیدہ زیبی کا رشتہ شاکے----" رانی نے کہا تو جمیلہ پھپھو نے اس کی بات کاٹ لی "شاکا گیا جہنم میں تو دیکھتی رہ رانی۔ میں نے فہمیدہ آپا کو قائل نہ کر لیا تو---- دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ میں نے تو آپا کے خوب کان کھولے ہیں۔ ایک ہی ایک بیٹی ہے۔ اب سوچ میں ضرور پڑ گئی ہیں۔ بھلا شاکے کی ماں کا کس کو پتہ نہیں؟"

"توبہ توبہ" راحیلہ نے کہا "جہاں کی لڑاکا---- کسی کو دیکھ نہیں سکتی۔ پر اب تو پیسے والی ہو گئی ہے نا----"

"پیسے سے عادتیں تو نہیں بدل جاتیں۔ زیادہ ہی چھچھوری ہو جائے گی۔ میں نے یہی باتیں تو فہمیدہ آپا کو سمجھائی ہیں---- پھر شاکا خدا جانے دوبئ میں کیا کرتا ہے۔ تعلیم تو ہے نہیں محنت مزدوری ہی کرتا ہو گا۔ کون جاتا ہے وہاں دیکھنے۔ روڑی کوٹتا ہے کہ نوکری ڈھوتا ہے وہاں عام لوگ یہی کام کرتے ہیں یہاں آ جاتے ہیں اونچی ہیلوں کے جوتے پہن کر چمڑے کی جیکٹیں چڑھا کر اور ریڈی میڈ پتلونیں پہن کر شو دکھانے۔ ہونہہ----"

پھپھو جمیلہ نے شاید شکل بنائی ہو گی جو سب ہنس پڑیں۔ نقلیں اتارنے اور شکلیں مضحکہ خیز بنانے میں وہ ماہر تھیں۔

ویسے کہتی وہ ٹھیک ہی تھیں۔ دوبئ جانے والوں کا ہمارے ملک میں اک نیا طبقہ پیدا ہو رہا تھا---- جاہل اور ان پڑھ لوگ باہر بھاگ رہے تھے۔ ظاہر ہے وہاں محنت مزدوری ہی کرتے ہوں گے میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا تھا جو یہاں بالکل نکمے اور بیکار تھے۔ دوبئ سال بھر ہی گزار کے آئے تو بقول پھپھو اونچی ہیلوں کے جوتے' جیکٹیں آنکھوں پر گاگلز۔ کندھوں پر ٹرانسسٹر اور کیمروں کی ڈوریاں ہاتھوں میں ولائتی سگریٹ کی ڈبیہ لئے اس ٹھاٹھ سے آتے کہ یوں محسوس ہوتا دوبئ میں منسٹر جا لگے ہیں۔ لیکن انہی لوگوں کا پول انہی کے ساتھیوں نے کھولا۔ وہاں یہ لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ سڑکوں فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں یا ایک ایک کمرے میں دس دس آدمی گھس کر گزارہ کرتے ہیں لیکن جب واپس آتے ہیں تو ٹھاٹھ باٹھ سے۔

محنت مزدوری عیب نہیں۔ یقیناً وہاں جا کر یہ لوگ کمائی کرتے تھے خوب پیسہ بناتے تھے اور یہ پیسہ ملک ہی میں واپس آ رہا تھا۔ جس سے ملکی معیشت مستحکم ہو سکتی تھی۔

لیکن

اپنی جانوں پر سختی جھیل کر کمایا ہوا پیسہ جب یہ لوگ یہاں لے کر آتے۔ تو بقول جمیلہ پھپھو شو مارنے کے لئے بڑھ چڑھ کر خرچ کرتے۔ شادیوں پر اسراف ہوتا۔ کپڑے لتے اور غیر ملکی الیکٹرک کی چیزوں کی ان کے گھروں میں بھرمار ہوتی---- ان باہر جانے والوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ دیار غیر میں اپنی جانوں پر بے شمار سختیاں جھیل کر بنائے ہوئے پیسے کا مصرف کوئی تعمیری کریں اور نہ ہی ان لوگوں کے گھر والوں کو کبھی احساس ہوا تھا کہ خون پسینے کی کمائی سنبھال کر رکھیں جو بھی دوبئی گیا جس گھر کا ایک فرد بھی دوبئی گیا ان کے دنوں میں معیار زندگی بدل گئے۔ ذہن بدل گئے سوچیں بدل گئیں اور وہ ایک ہی جست میں متوسط طبقے کو پھلانگ گئے۔

○ ☆ ○

"راج کل رینا باجی کی بیٹی کی برتھ ڈے ہے" شکیل نے مجھے گلی کے سرے پر ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"آؤ گے نا۔"

میں نے معذوری ظاہر کرنا چاہی لیکن وہ میری بات زبان سے نکلنے سے پہلے ہی اچک کر بولا "ضرور آنا۔ آفاق بھائی کے ملنے والے آئیں گے۔ تمہارا تعارف ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہیں تمہارا کام ہی بن جائے۔ رینا باجی نے دو ایک سے کہہ بھی رکھا ہے۔"

میں نے سرد آہ بھر کر کہا "یار شکیل میری تو وہ بات ہے کہ خود تو ڈوبا ہوں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبوں گا----"

"بکو نہیں----"

"سچ---- تمہیں کیا تمہارے ممی ڈیڈی اور بہن کو بھی مصیبت ڈال رکھی ہے میں نے۔"

"اپنا نہیں سمجھتے نا----"

"نہیں۔ نہیں شکیل---- اپنا نہ سمجھتا۔ تو تم لوگوں پر بار نہ بنتا۔"

"چلو بڑے بوڑھوں والی باتیں مت کرو۔ کل چار بجے پہنچ جانا۔ ساڑھے چار بجے تک سہی۔"

"اچھا۔"

"بے دلی سے مت کہو۔"

"شکیل میری حالت تم سے چھپی نہیں۔"

"کبھی کبھی خدا پر بھی بھروسہ کر لیا کرو۔"

میں تلخی سے ہنسا---- "تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"خیر یہ کہنا سراسر زیادتی ہے۔ میں سب جانتا ہوں سمجھتا ہوں لیکن تمہیں زندگی سے بیزار ہوتا نہیں چاہتا---- ہاں تو کل ساڑھے چار بجے تک پہنچ جانا۔ خدا کرے تمہارا کہیں کام بھی بن

جائے۔"

"اب تو مجھے دعاؤں کی تاثیر پر یقین ہی نہیں رہا۔"

"ازلی بزدل ہو۔"

"شاید۔"

میں نے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ گنجان آباد بازار میں زیادہ دیر گاڑی روکی نہیں جا سکتی تھی۔ ٹریفک اک مسئلہ بن جاتی تھی۔

"خدا حافظ" میں نے کہا۔ شکیل نے گاڑی سٹارٹ کی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا۔

میں سوچوں میں ڈوبا وہیں کھڑا رہا۔ اس امیرزادے کو جانے مجھ میں کیا چیز نظر آئی تھی کہ دوستی کے نام پر اپنا چین و سکون بھی حرام کر لیا تھا۔ کہاں کہاں کوشش کر رہا تھا میرے لئے مجھے تو انگلینڈ ساتھ لے جانے کی بھی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ لوگ وہاں کام شروع کر رہے تھے یہاں سے وائنڈ اپ کر کے وہاں جا رہے تھے۔ ان دنوں شکیل اپنے ڈیڈی کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ لیکن مصروفیت میں بھی وہ میرے مسائل نہیں بھولا تھا۔

میرے روزگار کی تلاش کے ساتھ ساتھ وہ اباجی کے لئے بھی بہت کچھ کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اباجی کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر دیا جائے اباجی رضامند نہیں تھے---- جب بھی میں اصرار کرتا۔ نحیف سی آواز میں کہتے۔ "میرے لئے کیوں پریشان ہوتے ہو۔ گھر میں ہی ٹھیک ہوں۔ ہسپتال داخل ہوا تو سارے گھر کو مصیبت پڑ جائے گی۔ فائدہ بھی کوئی نہیں چھوڑو میاں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔"

میں اندر ہی اندر تڑپ جاتا۔ ہسپتال کے اخراجات بھی تو بہت تھے۔

لیکن

شکیل ڈاکٹروں سے مل رہا تھا۔ ہوسپٹل میں الگ کمرہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں نے دبی زبان میں خرچ کی بات کی تھی تو اس نے میرا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا تھا "تمہارے اباجی کا اس بیٹے پر بھی کوئی حق ہے۔"

میں بے سدھ سا کھڑا تھا۔

"راج بیٹے اباجی کا کیا حال ہے" سلیم احمد میرے قریب کھڑے پوچھ رہے تھے۔

"جی۔"

"بھئی کچھ افاقہ ہوا۔"

میں نے نفی میں سرہلا دیا۔

"تکلیف کیا ہے۔"

"کینسر۔"

"اوہ میرے خدا۔"

"چاچا جی۔ بس دعا ہی کریں۔"

"اللہ رحم کرے۔ اللہ رحم کرے۔ میں آؤں گا انہیں دیکھنے----" سلیم احمد آگے بڑھ گئے۔ یہ بڑی گلی کے آخری مکان میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی علیک سلیک ہو جاتی تھی۔

اباجی کی بیماری کی خبر اپنی گلی سے نکل کر بڑی گلی اور بازار تک پھیل گئی تھی۔ لوگ احوال پرسی کو آتے تھے اور یوں راہ چلتے بھی خیریت دریافت کر لیتے تھے۔

میں سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنے وجود کو گھسیٹتا گلی میں آ گیا۔ چچا خیرالدین مل گئے۔ اباجی کی صحت کے لئے دعائیں کرتے تھے۔

تھڑے پر بیٹھی اماں جیناں نے بھی اباجی کی خیریت پوچھی۔

میں مایوس کے عالم میں سب کو جواب دیتے اپنے گلی میں آ گیا۔ میں اباجی کے کیپسول لایا تھا۔ ٹانک کی شیشی بھی تھی۔

گھر میں آتے ہی میں نے دوائیاں جیب سے نکالیں اور اباجی کے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں راحیلہ اور جمیلہ پھپھو کے علاوہ نمیدہ پھپھو بھی تھیں اور زیبی بھی پھپھو جمیلہ کے پاس پلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

امی نماز پڑھ کر آئیں اور اباجی پر پھونک ماری---- پھر مجھے دیکھا "لے آئے ہو دوائی۔"

"جی۔" میں نے کیپسول اور شیشی انہیں پکڑا دی۔

"کیوں پیسے ضائع کرتے ہو تم لوگ" اباجی کمزور سی آواز میں بولے----

"بھائی جی---- علاج ہو گا۔ تو آرام آئے گا نا----" پھپھو نمیدہ جو پائینتی کی طرف مونڈھے پر بیٹھی تھیں بولیں۔

میں نے زیبی پر اک نگاہ ڈالی۔ میں بے حد اپ سیٹ تھا۔ زیبی کا چہرہ بھی پریشان تھا۔ اباجی کی حالت دیکھ کر وہ افسردہ تھی۔

میں اباجی کے سرہانے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ان کا سر دبانے لگا۔

اباجی نے چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں لگ رہا تھا میرے ہاتھوں کے لمس سے انہیں سکون مل رہا ہے۔ میں نے دیکھا امی کی آنکھوں کے سرخ سرخ گوشے گیلے ہونے لگے ہیں۔

فضا بڑی اداس اور سوگوار محسوس ہونے لگی۔ جمیلہ پھپھو ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہمت سے

کام لیتی تھیں اور کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتیں جس سے فضا کا سوگوار تاثر تو ختم بے شک نہ ہوتا لیکن اپنی شدت ضرور کھو دیتا۔

"آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے" وہ بولیں

"ہاں۔ گرمی تو اب ہو گی ہی" امی نے کہا "گرمی کے مہینے یہی تو ہیں۔"

"آپ نے کیا بڈھا پنکھا لگا رکھا ہے۔ گھرر گھرر کرتا ہے ہوا دیتا نہیں" جمیلہ پھپھو نے چھت سے لگے پرانے پنکھے کی طرف دیکھ کر جس انداز میں بات کی۔ سب مسکرانے لگے۔ حتیٰ کہ اباجی کے سوکھے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

انہوں نے میرے سہارے سے کروٹ بدلی اور جمیلہ پھپھو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جانتی ہو اس کے پنکھے کی عمر کتنی ہے۔"

"ہو گی کوئی ہماری دادی اماں جتنی۔"

اباجی پھر مسکرا دیئے۔ اور انہیں مسکراتے دیکھ کر ہم سب بھی مسکرانے لگے۔ اباجی کمزور سی آواز میں باتیں کرنے لگے۔

"یہ پنکھا میں نے اکیس برس پہلے خریدا تھا" اباجی نے پنکھے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔ اللہ بخشے تائی جی کا آپریشن ہوا تھا۔ گرمی بہت تھی اور آپ پنکھا خرید لائے تھے۔" پھپھو فہمیدہ نے کہا۔

اباجی کے پپڑیوں جمے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ پھیل گئی۔

مسکراہٹ

جسے

دیکھ دیکھ

مجھے رونا آ رہا تھا۔

"تمہاری یادداشت اچھی ہے فہمیدہ" اباجی نے چت لیٹتے ہوئے کہا۔

پھپھو بولیں "بات اتنی پرانی بھی تو نہیں---- اور پھر یاد کے قابل بھی کہ خاندان میں پہلی دفعہ پنکھا آیا تھا----"

"ہوں۔"

پھر یادداشت کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ اباجی نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ بے چینی سے ہاتھوں کی مٹھیاں کھولیں بند کیں۔

سب باتیں کر رہے تھے اور میں انہیں تکے جا رہا تھا اس وقت تو میں زیبی پر بھی کوئی نگاہ شوق نہیں ڈال رہا تھا۔

زیبی جو سامنے ہی پلنگ کے چوبی تکئے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور افسردہ نظر آ رہی تھی۔

"فہمیدہ" اباجی نے ایک دم پھپھو کو پکارا۔

"جی" وہ جلدی سے بولیں۔

"کچھ نہیں" اباجی پھر آنکھیں بند کر کے پڑ گئے۔

امی نے اباجی کو باتیں کرتے مسکراتے اور یوں آرام سے پڑے دیکھا تو جمیلہ پھپھو سے کہنے لگیں۔ "یخنی لے آؤ---- شاید دو چار چمچ اس وقت پی ہی لیں۔"

"اچھا" جمیلہ پھپھو پلنگ سے اترنے کو تھیں کہ زیبی بولی "خالہ میں لے آتی ہوں" وہ باہر نکل گئی۔

سب باتیں کرنے لگے۔ اباجی ویسے ہی پڑے رہے۔ جانے کیا سوچ رہے تھے۔ کیا کیا باتیں من میں تھیں---- اور کس کس خواہش سے نپٹ رہے تھے۔ میں تو صرف اباجی کو دیکھ رہا تھا۔

زیبی یخنی کا پیالہ اور چمچ لے آئی۔

امی نے اباجی کا کندھا آہستگی سے ہلایا۔

"ہوں" اباجی چونکے

"تھوڑی سی یخنی پی لیں۔"

"نہیں۔ جی نہیں چاہ رہا۔"

"تھوڑی سی پی لیں اباجی" میں نے کہا

اباجی نے سر قدرے اونچا کر کے میری طرف دیکھا اور بیزاری سے بولے "بھوک نہیں ہے۔"

"تھوڑا تھوڑا---- کھا لیا کریں بھائی جی" راحیلہ پھپھو نے کہا۔

"اس طرح تو کمزوری زیادہ ہوتی جا رہی ہے" جمیلہ نے کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں کھا پی رہے" امی تشویش سے بولیں۔

"زبردستی کھلا دیتی ہو۔ تو قے ہو جاتی ہے" اباجی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یخنی پی لیں ماما جی" زیبی پلنگ کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "کبھی بھی قے نہیں ہو گی---- میں پلاؤں گی--"

اباجی نے زیبی کی طرف دیکھا۔ ہولے سے مسکرائے۔ اپنا کمزور سا ہاتھ اوپر اٹھایا اور زیبی کے سر پر رکھ دیا۔

زیبی کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ وہ اباجی کے قریب پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

"دو چار چمچ پی لیں ماما جی۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا" زیبی رندھی آواز میں

بولی۔

ابا جی چپ ہو گئے۔ چہرے سے لگتا تھا کہ ان کا جی مطلقاً کھانے پینے کو نہیں چاہ رہا لیکن زیبی کے پیار بھرے اصرار کو رد نہ کر سکے۔

"لو بھئی---- تمہاری بات مان لیتے ہیں---- " ابا جی نے کہا۔ میں نے اپنا بازو ان کی گردن کے نیچے لے جاتے ہوئے انہیں قدرے اونچا کیا----

زیبی نے یخنی کا چمچ ان کے منہ میں ڈالا۔

دو تین چمچ پی کر بولے "بس----"

"ماما جی اتنی ہی پی لیں" زیبی نے کہا

"بس بچی---- تمہاری خاطر میں نے پی لی۔ ورنہ دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ تم میری بیٹی ہو نا۔"

ابا جی نے شفقت سے اس کے خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

زیبی کی آنکھیں بھر آئیں۔

"بیٹی ہو نا میری---- " ابا جی نڈھال ہو گئے انہوں نے گردن میرے بازو پر ڈال دی۔

"ہاں ماما جی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ ہی کی ہوں" زیبی گھبرا کر رو پڑی۔

"فہمیدہ---- " ابا جی اسی طرح نڈھال نڈھال تھے۔

"جی بھائی جی" زیبی کی امی کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

"تمہاری---- یادداشت---- بہت اچھی ہے" ابا جی اذیت سے مسکرائے۔

"آپ کی دعا ہے بھائی جی----" وہ انکساری سے بولیں۔

ابا جی چند لمحے چپ رہے۔

پھر میرے سینے کے ساتھ پشت ٹکا کر ذرا سیدھے ہوتے ہوئے بولے "زیبی میری بیٹی ہے فہمیدہ---- میں نے یاد ہے کوئی پندرہ برس پہلے تم سے کہا تھا----"

میرا دل رک جانے کو تھا۔ زیبی نے سر جھکا لیا۔ پھپھو چپ ہو گئیں۔

ابا جی تھکے تھکے مضمحل انداز میں رک کر بولے "فہمیدہ---- تمہاری یاد---- داشت بہت اچھی ہے---- تم---- بھولی---- تو نہیں ہو۔ بھولنا بھی نہیں---- میں نے اسے بیٹی بنایا تھا----"

سب کے دل جیسے اٹک گئے۔ خاموشی بڑے پُراسرار طریق سے وجودوں میں اتر رہی تھی۔

میرا تو دل تھم گیا جیسے ابا جی جو کہہ رہے تھے میں سمجھ رہا تھا۔

ابا جی رک رک کر بولے "بھولنا نہیں فہمیدہ---- میں رہوں---- یا نہ رہوں---- یہ بات

بھولنا---- نہیں---- کہ زیبی میری----"

ابا جی کی آواز تھرا گئی---- امی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکیں جمیلہ اور راحیلہ پھپھو رونے لگیں۔

میں نے ابا جی کا سر آہستگی سے تکیئے پر رکھ دیا۔

زیبی ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

میں جلدی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ سیدھا دالان میں گیا---- اور پلنگ پر اوندھے منہ گر کر اس بے اختیاری سے رویا---- کہ قمو اور رانی باورچی خانے سے بھاگی آئیں۔

جانے کیا سمجھ کر وہ ابا جی کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

○ ☆ ○

"یہ شکیل کے بہت عزیز دوست ہیں سراج----" ریتا نے مسکراتے ہوئے میرا تعارف ادھیڑ عمر کے مدبر سے آدمی سے کروایا۔

"اوہ---- اچھا اچھا" انہوں نے ہنستے ہوئے میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"انکل۔ انہیں کے بارے میں میں نے آپ کو کہا تھا نا----" ریتا نے یاددہانی کرائی۔

"ہوں---- اچھا اچھا" انہوں نے میرا ہاتھ دبا کر چھوڑتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔

میں نے لبوں پر زبردستی مسکراہٹ بکھیری۔ ہنسنے کو کس کافر کا جی چاہ رہا تھا لیکن ایٹی کیٹ متقاضی تھے۔

"انکل ان کے لئے جاب کا ضرور کچھ کریں۔" ریتا نے پھر کہا۔

"اچھا اچھا---- " وہ بولے "ہاں تو صاحبزادے آپ کی کوالیفیکیشن؟"

"انکل" ریتا بولی "آپ تشریف رکھئے اور راج سے ساری باتیں آرام سے پوچھ یں۔"

"آؤ بھئی" وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ برابر میں میرے لئے جگہ بنا دی۔

ریتا کی بیٹی ماہو کی برتھ ڈے تھی۔ میں شکیل کے اصرار پر آ گیا تھا ماہو کے لئے چھوٹا سا پریذنٹ لایا تھا۔ جسے ریتا نے بڑی خوشی سے ماہو کو دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

"تھینک یو بونو ماہو انکل کتنا پیارا کھلونا لائے ہیں۔"

ماہو نے تھینک یو کہہ کر ڈبہ لے لیا تھا۔

مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ ریتا کے خوبصورتی سے آراستہ ڈرائینگ روم میں کافی نشستوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ آفاق اور ریتا کے ملنے والے لوگ کافی تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے بھی آنا تھا۔ اچھا خاصا فنکشن تھا۔ ریتا نے سلور گرے رنگ کے چوڑے بارڈروں والی ساڑھی پہنی تھی۔ بالوں کا سٹائل بھی بہت خوبصورت تھا اور میک اپ کرنے میں تو اسے اچھی خاصی مہارت تھی۔

وہ بڑی گریس فل لگ رہی تھی۔ دو بچوں کی ماں تھی لیکن بے حد سمارٹ اور دلکش۔

مجھ سے بھائیوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ میں بھی اسے بڑی بہن سمجھتا تھا۔ پیار کے ناطے بھی خوب ہوتے ہیں۔ مالی اونچ نیچ راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ کم از کم اس فیملی سے تعلقات رکھنے میں میرا تجربہ یہی تھا۔ شکیل کی طرح ریتا بھی میرے خاندانی حالات سے آگاہ تھی۔ میری بیکاری سے میری فیملی کو جو نقصان پہنچ رہا تھا اس سے بھی لاعلم نہ تھی اسی لئے بیچاری نے میری نوکری کے لئے اپنے طور پر کئی لوگوں سے کہہ رکھا تھا۔

آج مجھے شکیل نے آنے کی سختی سے تاکید بھی اسی لئے کی تھی کہ کافی بڑے بڑے انڈسٹریلسٹ مدعو تھے ان میں سے کچھ ریتا نے اور کچھ کو آفاق نے میرے لئے کہہ رکھا تھا۔

ریتا نے مجھے گلاس فیکٹری کے مالک سے ملایا تھا۔

ادھیڑ عمر کے مدبر سے مختار اعوان مجھے صوفے پر اپنے قریب بٹھا کر باتیں کرنے لگے۔ ریتا دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہاں تو کیا نام ہے آپ کا" مختار اعوان نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

"سراج میرڈار۔"

"ہوں۔"

انہوں نے سگریٹ نکالا۔ میری طرف ڈبیہ بڑھائی۔

"شکریہ۔" میں نے معمر آدمی کے سامنے سگریٹ پینے کو معیوب سمجھا ویسے بھی عادی نہیں تھا۔ کبھی کبھی شکیل کے اصرار پر پی لیتا تھا۔

"نہیں پیتے" انہوں نے خود سگریٹ سلگایا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھی بات ہے۔ مفت کا روگ ہے---- پیسے کا ضیاع---- پر کیا کریں---- عادت پڑ گئی ہے۔"

"جی۔"

"ہاں تو آپ کی کوالیفیکیشن۔"

"ایم اے اکنامکس۔"

"کب کیا۔"

"پچھلے سال۔"

"تب سے اب تک کیا کرتے رہے ہیں----"

مجھے اس بیہودہ سوال پر غصہ آ گیا۔ آج کل جانے کیوں میں بات بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔ بمشکل میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور تحمل سے بولا "نوکری کی تلاش۔"

انہوں نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ پھر آنکھیں گھماتے اور ہونٹ پھیلاتے ہوئے بولے۔ "تلاش ہی میں اتنا وقت ضائع کر دیا۔"

"کیا کرتا" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

انہوں نے میری طرف چونک کر دیکھا۔ پھر مسکرائے اور سرہلاتے ہوئے بولے۔

"بے روزگاری کے ستائے ہوئے لگتے ہو۔ ریتا نے تمہارے متعلق مجھے بتایا تھا۔"

جانے کیوں مجھے سبکی سی محسوس ہوئی---- مختار اعوان شاید میرے حالات سے آگاہ تھے۔ ترس کھانا چاہ رہے تھے۔

میں شکیل کو دیکھتے ہی ان سے بولا "معذرت خواہ ہوں۔ مجھے شکیل سے بات کرنا ہے۔"

"اچھا اچھا" یہ شاید ان کا تکیہ کلام تھا۔ "جاؤ---- میں غور کروں گا----"

"شکریہ----"

میں اٹھ کر شکیل کی طرف آ گیا جو چند نوجوان دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ دو ایک سے تو میں متعارف تھا۔ علیک سلیک ہوئی۔ باقیوں سے شکیل نے میرا تعارف کروایا۔

چند منٹ ہم یونہی کھڑے رسمی سی باتیں کرتے رہے۔ پھر کچھ خواتین آ گئیں۔ بہترین لباسوں میں ملبوس پیارے پیارے بچوں کے ساتھ۔ بڑے بڑے تحائف کے پیکٹ اٹھائے۔

ہم ادھر ادھر بکھر گئے۔ ڈرائینگ روم میں اب کافی لوگ تھے۔ گپ شپ لگنے لگی۔ قہقہے برسنے لگے۔ مسز اعجاز اور مسز درانی تو جیسے جان محفل تھیں۔ ان کی کھنک دار ہنسی اور پرلطف باتوں سے ڈرائنگ روم کی فضا زعفران زار بن گئی۔

اس گہما گہمی میں ریتا نے مجھے متوجہ کیا "راج۔"

"جی۔"

"ادھر آؤ۔"

میں ریتا کی طرف بڑھا۔

"ان سے ملو---- مسز نسیمہ گھمن----"

میں نے سر قدرے جھکا کر انہیں تعظیم دی۔ پینتالیس پچاس برس کی بڑی طرحدار خاتون تھیں وہ۔

ریتا نے یہاں بھی میرا تعارف اسی انداز میں کروایا "شکیل کے جگری دوست ہیں سراج---- مسز گھمن میں نے ان کی جاب کے لئے آپ کو کہا تھا۔ گھمن صاحب نے کچھ کہا----"

وہ اپنی قیمتی ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ "گھمن صاحب منڈے کو واپس آ رہے

ہیں---- ضرور کوشش کروں گی---- وہ ان کا کام کریں گے اور ضرور کریں گے----"

"گھمن صاحب کاروباری ٹور پر مڈل ایسٹ کے ملکوں میں گئے ہوئے تھے انہیں محنتی اور ایماندار آدمی کی ضرورت ہے" وہ بولیں۔

"اس کی ایمانداری اور محنت کی میں ضامن ہوں" ریتا نے مسکرا کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

ریتا کو کسی صاحب نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کچھ بچے اس سے لپٹ گئے وہ ان کی طرف پلٹ گئی۔

"آپ بیٹھئے" مسز گھمن نے برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مسز گھمن نے میرے سراپا کا جائزہ لیا۔

"آپ پہلے کسی جاب پر رہے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں----" میں نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"تبھی بہت پریشان لگ رہے ہو" وہ میرا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

"جی---- یہ بات نہیں----" میں دل ہی دل میں جھلا گیا۔

"ہوں۔"

"میرے والد سخت بیمار ہیں" پریشانی ان کی ہے۔ ماہو کی برتھ ڈے میں شمولیت بھی ضروری تھی---- ورنہ---- والد صاحب----"

مسز گھمن بھی مجھ پر ترس کھانے کے موڈ میں تھیں۔ میں ان کے پاس بھی نہ بیٹھا۔ سامنے کے صوفے پر ایک نشست خالی تھی۔ میں وہاں جا بیٹھا۔ نوکری کے معاملے میں کچھ بدقسمت ہی تھا۔ بار بار ناکامی کا سامنا کرتے کرتے میں اب اس کے نام سے ہی الرجک ہو گیا تھا۔ ان لوگوں سے جو ان داتا بنے ہوئے تھے مل کر یہی احساس ہوتا کہ وہ مجھے انتہائی حقیر شے سمجھ کر ترس کھانا چاہتے ہیں۔ ترس کھانے سے ہی تو میں دور بھاگتا تھا۔

اسی محفل میں میری ملاقات ریتا نے ظہیر اکرم سے کروائی۔ اچھے معقول آدمی تھے۔ ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس تھا۔

مجھ سے متعارف ہوئے۔

"ٹائپ شارٹ ہینڈ جانتے ہیں۔ چند سوال پوچھنے کے بعد وہ بولے۔

"نہیں" میں نے کہا۔

"پھر کلیریکل جاب ہی ہے۔"

میں خاموش رہا۔

"آپ کل میرے آفس آ جایئے----" انہوں نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر مجھے دیا۔

ان کے رویے میں ترس کھانے والی کوئی بات نہ تھی۔ کام دیکھ کر جاب دینے کی بات کی تھی۔ میں ان سے مطمئن ہوا۔

کارڈ لے کر میں نے شکریہ ادا کیا۔

"کل کس وقت آؤں۔"

"نو ایک بجے کے قریب میں اپنے آفس میں رہتا ہوں میں کوشش کروں گا کہ آپ کے لئے آفس میں گنجائش نکال دوں۔ مجھے تو نوجوان کی ہمت محنت اور لگن پر بڑا اعتماد ہے۔"

"میں آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"دیکھو میاں-----"

"جی-----"

"ایک دم سے چاہو کہ اونچی فضاؤں میں اڑنے لگو۔ تو بے شک آنے کی زحمت نہ کرنا----- ہاں جو جاب دوں گا اس میں محنت کی اور کچھ کر کے دکھایا----- تو ترقی کا میدان وسیع ہو گا۔"

ان کی بات انتہائی معقول تھی دل کو لگتی تھی۔ اس لئے میں نے انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا "پرواز طاقت بازو پر منحصر ہوتی ہے۔ میں انشاء اللہ پورے خلوص سے محنت کروں گا۔"

"کل آ جانا۔"

"بہت اچھا۔"

وہ پھر تاکید کر کے اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے آس لگی دل نے گواہی دی کہ کام بن گیا۔

چائے کے لئے رینا نے سب لوگوں کو ڈرائینگ روم میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے ظہیر اکرم سے کی ہوئی بات چیت شکیل کو بتائی۔

چائے کے دوران ہم دونوں ظہیر اکرم ہی کی باتیں کرتے رہے۔

کیک کاٹنے چائے پینے اور بچوں کی ہلاگلا کے بعد کچھ لوگ چل دیئے کچھ پھر ڈرائینگ روم میں آ بیٹھے۔

یہاں بیٹھنے والے آفاق اور رینا کے بہت قریبی دوست تھے شکیل کے ممی ڈیڈی نے کہیں اور جانا تھا وہ بھی چلے گئے اور معمر لوگ بھی سدھارے یہاں بے تکلف لوگوں کی نشست جمی۔

"میرے عزیز ترین دوست" شکیل نے کہا۔

"سراج ڈار" میں نے اپنا نام بتایا۔

"اوہ----- سراج----- راج کہتے ہیں نا آپ کو۔"

"جی۔"

"رینا نے بتایا تھا تمہارے متعلق----- بھئی تم ان دونوں بھائی بہن پر بڑے چھائے ہوئے ہو" وہ کھنک دار ہنسی ہنستے ہوئے بولیں۔

"نوازش ہے ان کی" میں نے کہا۔

"جاب ملی" اس نے پوچھا۔

"آپ کو بھی میری بیکاری کی اطلاع ہے۔"

"رینا میری عزیز ترین دوست ہے سمجھے-----"

"تبھی-----"

وہ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ رینا دوسرے مہمانوں سے باتیں کر رہی تھی میں اور شکیل حمیرا عثمان کے پاس بیٹھے تھے۔ بڑی زندہ دل تھی وہ----- ہنسی مذاق طبیعت کا خاصہ تھا۔

جاب اور بے کاری بے روزگاری کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کا میاں انجینئر تھا۔ وہ اپنے قصے سنانے لگی۔ جاب حاصل کرنے میں اس کے میاں کو جو جو دشواریاں پیش آئی تھیں سب بتا دیں۔

"اب تو اچھی جاب مل گئی ہے نا۔"

"اچھی ہے یا بری اب تو ہم اس سے اس طرح چمٹے ہیں کہ یاد کرے گی۔ کسی سے پالا پڑا تھا۔" وہ ہنسی

"ہیں تو ہم بھی ایسے ہی لیکن کیا کریں ابھی واسطہ ہی نہیں پڑ رہا بی جاب صاحب سے" میں نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

"خیر کبھی تو ہاتھ آئے گی" وہ پھر ہنسی "ہماری طرح چمٹ جانا چھوڑنا نہیں کبھی اسے-----"

"ایک بار ہاتھ تو لگے" میں نے کہا۔ ہم تینوں مسکرانے لگے۔

"اے شکیل----- "اسے جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔

"جی" شکیل بولا۔

"ایک جاب ہے" وہ بولی وہ اپنی گال پر انگلی مارتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

"کہاں" میں نے پوچھا۔ شکیل نے بھی یہی لفظ کہا۔

"رحمان ڈوگر کے ہاں"

"رحمان ڈوگر" شکیل نے ماتھے پر شکنیں ڈالتے ہوئے ذہن پر زور ڈالا۔

"اے بھئی----- جس کی سریے کی مل ہے۔"

شکیل اب بھی یاد نہ کر پایا۔

"حد ہو گئی۔ رحمان ڈوگر----- کلب میں کئی دفعہ دیکھا ہو گا بھئی جس کی مرار سی بیٹی

ہے---- بدشکل سی----" وہ ہنستے ہوئے شوخی سے بولی۔

"اوہ۔ ہاں" شکیل کو یاد آ گیا "رحمان ڈوگر---- سریے کی مل ہے۔ ہاں---- ان کی بیٹی---- کیا نام ہے----"

"چھپکلی----" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ شکیل بھی ہنس پڑا۔

"رحمان ڈوگر کو ایک پڑھے لکھے ایماندار اور محنتی آدمی کی ضرورت ہے ان دنوں---- کیوں نہ راج اپلائے کریں----"

"اپلائے تو بہت لوگوں نے کیا ہو گا۔"

"ہاں ایڈ دیا تھا انہوں نے ظاہر ہے بڑے ضرورت مند آئے ہوں گے----"

"لے بھی لیا ہو گا کسی کو۔"

"نہیں میرا خیال ہے ابھی نہیں لیا----"

"آپ کی واقفیت ہے ان سے۔"

"کوئی خاص نہیں---- ویسے کامیابی کی ایک صورت ہے۔"

"کیا۔"

"رحمان ڈوگر اپنی بیٹی کی بات مانتا ہے وہ دن کو رات کہے اور رات کو دن۔ تو بھی وہ مانے گا بیٹی کی بات۔"

"گویا جاب کے لئے بیٹی تک رسائی ضروری ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔"

"اسے کہاں ملیں۔"

"کلب آتی ہے ہفتے میں ایک دن۔ ٹکر جاؤ کسی دن۔"

وہ ہنس رہی تھی۔ میں خاموشی سے شکیل اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"بھئی اللہ قسم---- بڑی اچھی جاب ملے گی---- بیٹی سفارش کر دے تو نہ ملنے کا سوال ہی نہیں----" وہ شوخی سے بولی۔

میں چپ رہا---- اس عورت کے متعلق میں نے اچھی رائے قائم کی تھی۔ لیکن وہ جس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اپنی رائے بدل رہا تھا۔

وہ شکیل سے باتیں کر رہی تھی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ رحمان ڈوگر کی بیٹی بے حد بدصورت ہے۔ بہت زبردست انفیریریٹی کمپلکس ہے۔ اسے بیٹی کے اس دکھ کی وجہ سے وہ اسے بہت پیار کرتا ہے اور اس کی ہر بات مانتا ہے۔ یہ پکی بات ہے----" وہ بولی۔

"بیٹی کی بات مانتا ہے۔ ٹھیک ہے" شکیل وکیلوں کی طرح جرح کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن بیٹی راج کی سفارش کیوں کرے گی جب کہ وہ اسے جانتی ہے نہ پہچانتی----"

"تت---- بدھو ہی رہو گے شکیل" وہ اب ذرا سنجیدہ تھی---- "یہی تو بات ہے کہ بیٹی سے جان پہچان بناؤ۔"

"کیونکر۔"

"کلب جاؤ---- راہ و رسم خود ہی پیدا ہو جائے گی۔ کمپلیکس کی ماری لڑکی ہے۔ تھوڑی سی تعریف کر دینا---- بس---- کام بن جائے گا۔"

شکیل نے میری طرف دیکھا---- میں نے شکیل کی طرف۔

"کیا خیال ہے" حمیرا اٹھ کر مسز واحد کے پاس جا بیٹھی۔ تو شکیل نے ذو معنی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دم بے ہودہ۔" میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں کچل دیا۔

○ ☆ ○

انجکشن اور دوائیاں زیبی کے ہاں فرج میں رکھنے گیا تو زیبی دوسری منزل کے سامنے والے کمرے میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی صحن میں آ گئی۔۔۔۔ اس کے ہاتھ میں کنگھی تھی اور اپنے کھلے چمکتے بالوں میں پھیر رہی تھی۔ شاید نہا دھو کر نکلی تھی۔ بڑی تر و تازہ لگ رہی تھی۔ اس نے وائیل کے آسمانی رنگ کے گلابی پھولوں والے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کمرے کا پنکھا چل رہا تھا اور گھرر گھرر کی آواز آ رہی تھی۔ پلنگ کے قریب میز پر پڑا کوئی رسالہ پنکھے کی ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔

آج گرمی کافی تھی۔ دس گیارہ بجے ہی دھوپ میں اتنی حدت تھی کہ جسم میں چبھنے لگتی تھی۔ مجھے ویسے بھی گرمی بہت لگتی تھی۔ اب تو بازار سے سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا۔ شرٹ پسینے سے بھیگ رہی تھی۔

زیبی نے مجھے پسینے پسینے دیکھ کر کہا "اندر آ جاؤ۔ پنکھے کے نیچے تم تو پسینہ پسینہ ہو رہے ہو۔"

میں نے برفانی ہوا کی سی ٹھنڈک دینے والی زیبی کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑے انجکشن اور دوائی کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی "یہ ذرا فرج میں رکھ دو۔۔۔۔"

اس نے دونوں چیزوں کے لفافے پکڑ لئے۔ وہ میرے اتنے قریب تھی کہ اس کے وجود سے اٹھتی ٹھنڈی ٹھنڈی مہک میرے جسم میں اترنے لگی۔

"آؤ نا۔ پنکھے کے نیچے بیٹھو" وہ میرے لئے راستہ بنانے کو پرے ہٹ گئی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا سامنے والے کمرے میں چلا گیا اور بش شرٹ کا اوپر والا بٹن کھول کر گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پرے ہٹاتے ہوئے پنکھے کی ہوا اندر اتارنے لگا۔

"تم آج دفتر نہیں گئے" زیبی نے صحن کے جنگلے پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

"گیا تھا۔"

"چھٹی ہو گئی"

"ہو تو نہیں گئی البتہ ہو جائے گی۔"

"کیا مطلب۔"

"دفتر سے بھاگ آیا ہوں۔"

"دیکھ راجو۔۔۔۔" زیبی کچھ کچھ پریشان ہو کر دروازے کے قریب آ گئی۔ میں نے اک نگاہ اس پر ڈالی۔۔۔۔ اور پھر پسینہ سکھانے لگا۔

"ہوں۔"

"تو روز بھاگ آتا ہے دفتر سے۔"

"پھر۔"

"نئی نئی نوکری لگی ہے۔ اس طرح ٹھیک تو نہیں۔۔۔۔"

"میں ظہیر اکرم کا غلام نہیں۔۔۔۔ میرا باپ بیمار ہے اور وہ مجھے چھٹی نہیں دیتا۔"

زیبی چپ ہو گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر شاید ویرانی تھی اور میری آنکھوں میں تکان۔ وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔ لیکن چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی "ماما جی بیمار ہیں اسی لئے تو تجھے دفتر سے یوں بھاگنا نہیں چاہئے۔ نوکری چھوٹ گئی۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ انہیں۔۔۔۔"

"تجھے فکر پڑ گئی نا اپنی۔۔۔۔" میں جبراً مسکرایا۔

"کیوں۔"

"نوکری لگنے سے میرے ماتھے سے بے کاری کا لیبل جو اتر گیا۔"

"ہے تو ٹھیک بات۔"

"ہونہہ۔۔۔۔ یہ کوئی نوکری ہے زیبی۔۔۔۔ غلامی ہے غلامی۔ چند پیسوں کے لئے۔ ظہیر اکرم ایسا بیہودہ آدمی ہو گا۔ مجھے پتہ ہوتا۔ تو جاتا ہی نہ اس کے پاس۔"

"بیہودہ۔"

"ہاں۔۔۔۔ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ آج تو اس سے جھڑپ بھی ہو گئی۔ کہتا ہے روز روز چھٹی نہیں مل سکتی۔"

"ہائے راج۔۔۔۔ اگر اس نے جواب دے دیا تو۔۔۔۔ پرائیویٹ فرم ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"پھر بھی تجھے اس سے بنا کر رکھنی چاہئے۔ دیکھتا نہیں اس نوکری سے ہی ماماجی کو کتنی تسکین ملی ہے۔۔۔۔ کم از کم اپنے پاؤں پر تو کھڑے ہو گئے ہو۔۔۔۔ انہیں تمہاری فکر تو نہیں رہی۔۔۔۔"

"سب ٹھیک ہے۔۔۔۔ زیبی۔۔۔۔" میں رک رک کر بولا۔۔۔۔ "لیکن میں کیا کرتا۔ ابا جی کے انجکشن لانے تھے۔ یہ دوائی ڈھونڈتا تھا۔"

"کسی اور سے کہہ دیتے----- آخر اتنے لوگ اور بھی تو ہیں۔ جعفر ماموں دن میں تین چار دفعہ آتے ہیں۔ یہ اپنا امجد بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ اس کو دے جاتے نسخہ۔"

"ہوں۔"

"تنخواہ چاہے تھوڑی ہے لیکن شکر ہے کہ جگہ مل گئی۔ اس آدمی سے بگاڑ نہ لو۔ راجو کہیں اور بندوبست ہو گیا تو بے شک چھوڑ دینا لیکن اب تو----- کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔"

میں نے حیرانگی سے زیبی کی طرف دیکھا وہ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے باتیں کر رہی تھی۔ میں ہولے سے مسکرایا۔ "یہ تو اتنی عقل مند کب سے ہو گئی ہے۔"

وہ

بھی

دھیرے سے مسکرائی اور رخ موڑتے ہوئے بولی "جب سے تجھ سے ناطہ جوڑا ہے۔"

میں من ہی من میں کھل اٹھا---- کچھ کہنے کو تھا کہ زیبی بولی "شربت لاؤں۔"

"نہیں۔"

"پی لو۔"

"پیونگا۔"

"لاؤں۔"

"شربت نہیں۔"

"پانی؟۔"

"چائے۔"

"ہائے اللہ اتنی گرمی اور چائے۔"

"بنا کر لا سکتی ہو۔ تو ایک کپ خوب تیز سی چائے بنا کر لا دو۔"

"راجو اتنی گرمی ہے۔"

"چائے گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ تجھے معلوم نہیں۔"

"توبہ---- میں تو ناشتے کے ساتھ بھی چائے نہیں پیتی۔"

"میرے ساتھ تو پیا کرے گی" میں نے شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ نظروں کی تپش سے لجا گئی۔

جلدی جلدی قدم اٹھاتی وہ سیڑھیوں کی طرف گئی "ابھی بنا کر لاتی ہوں----"

"شاباش" میں نے کہا۔

وہ اوپر چلی گئی۔

میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ پنکھے کی ہوا بھی گرم لگنے لگی تھی۔ جب تک پسینہ نہیں سوکھا تھا۔ ہوا ٹھنڈی لگ رہی تھی۔

میں میز پر سے رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

چند منٹ ورق گردانی کی۔ پھر رسالہ میز پر ہی رکھ دیا۔

رات میں کوئی تین بجے سویا تھا۔ اباجی کے پاس اب رات کو میں سوتا تھا۔ تین بجے تک وہ بہت بے چین رہے تھے۔ درد بھی شدید تھا گو اظہار نہ کرتے تھے لیکن شدت اپنا احساس دلا دیتی ہے۔ وقفوں کے بعد رانی اور جعفر ماموں بھی آ آ کر دیکھتے تھے۔ یہ لوگ جا کر تھوڑی دیر کے لئے سو بھی جاتے۔

لیکن

میں آنکھ نہ جھپک سکتا تھا۔ امی کو تو ان دنوں ہم ویلیم کی گولی کھلا کر سلاتے تھے۔ پریشانی اور تفکر نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ امی کی خاطر میں اباجی کے کمرے میں سوتا تھا۔

لیکن

سوتا کون تھا۔

اباجی کی آنکھ لگ بھی جاتی۔ جب بھی میری آنکھ ان پر لگی ہوتی لیکن تین بجے جعفر ماموں نے آ کر زبردستی مجھے دوسرے کمرے میں سونے کے لئے بھیجا۔

میں نے صبح سات بجے دفتر بھی پہنچنا ہوتا تھا۔ اس لئے دو تین گھنٹے کی نیند ضروری تھی۔

ظہیر اکرم نے ازراہ نوازش کہہ لیں یا میری قابلیت مجھے نوکری تو دے دی تھی لیکن کام کے معاملے میں آدمی بہت سخت واقع ہوا تھا۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ خود کرتا تھا نہ ہی کرنے دیتا تھا۔

میرے اباجی ٹھیک ٹھاک ہوتے تو شاید میں ظہیر اکرم کی توقعات سے کہیں زیادہ کام کرتا۔ اپنی صلاحیتیں منواتا اور اس کے اعتماد کو گزند نہ پہنچاتا۔

لیکن

میرے حالات سے وہ باخبر ہونے کے باوجود سخت رویہ اختیار کئے تھا پہلے دو چار دن تو اس نے دو دو گھنٹے کی چھٹی مجھے دے دی۔

لیکن میں تو روزانہ ہی اباجی کے لئے دفتر سے بھاگتا تھا۔ ہر وقت دھیان ادھر ہی رہتا۔ دھڑکا سا دل کو لگ گیا تھا۔ نہ جانے کس آن کسی لمحے کچھ ہو جائے---- یہ خدشہ کھائے جاتا ہے۔

میں جلدی جلدی کام نپٹا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس کمرے میں پہنچ کر کہتا۔ "سر میں نے کام ختم کر لیا ہے۔ اب میں جاؤں۔"

"یہ بات آفس ڈسپلن کے خلاف ہے" دو چار بار چھوٹ دینے کے بعد اس نے سختی سے کہا۔

"میں مجبور ہوں سر۔"

"تمہیں دفتر میں رہنا ہو گا۔"

"سر میرے والد سخت بیمار ہیں----- پلیز----- "

"نہیں۔"

میں جھلا جاتا۔ دل میں بڑی بڑی گالیاں اسے دیتا کبھی اس کا حکم مانتا اور کبھی باہر نکل آتا۔ سائیکل پکڑتا اور گھر آ جاتا۔

جمعہ جمعہ آٹھ دن والی بات تھی۔ ظہیر اکرم شاید اپنی جگہ ٹھیک ہی تھا وہ مجھے کئی دفعہ سٹاف کے سامنے ڈانٹ چکا تھا اور میں زہر کے گھونٹ پی کر بھی چپ رہا تھا۔

پر آج تو اس سے خاصی جھڑپ ہو گئی تھی۔ میں نے دفتری ضوابط کی پرواہ نہیں کی تھی باس کی برتری کو بھی نہیں جانا تھا۔ فائلیں پھینک کر دفتر سے بھاگ آیا تھا۔ اباجی کے انجکشن شہر کی ساری کیمسٹوں کی دکانیں کھنگال کر لانا تھے۔ ملتے جو نہیں تھے اور چار بجے انجکشن اباجی کو لگ جانا چاہئے تھا۔

میں سوچتے سوچتے شاید اونگھ گیا۔ اسی طرح پاؤں لٹکائے پلنگ پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔

جب کروٹ بدلی تو آنکھ کھل گئی۔ ہڑبڑا کر گھڑی دیکھی۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ میز پر چائے کی پیالی پرچ سے ڈھکی پڑی تھی اور اوپر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید پھوپھا جی شاہد واجد اور امجد سبھی کھانا کھا رہے تھے۔ برتن کھنکنے کی آواز جو آ رہی تھی۔

میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ چائے بالکل ٹھنڈی اور بدمزہ ہو چکی تھی۔ میں چند لمحے بیٹھا رہا۔ بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا۔ سوچا گھر چلا جاؤں۔ کھانے کا وقت ہے۔

لیکن یوں اٹھ کر چلے جانا بھی مناسب نہ لگا۔ پیالی اٹھائی اور اوپر پہنچ گیا۔ واقعی سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے پھوپھا جی کو سلام کیا۔ انہوں نے محبت سے اپنے قریب تخت پر بٹھا لیا۔

"کچھ نیند نکال ہی لی" انہوں نے کہا پھپھو پیڑھی پر جنگلے کے قریب بیٹھی تھیں۔ ہمدردی سے بولیں "بیچارہ بچہ----- رات کو جاگنا پڑتا ہے صبح دفتر کی ڈیوٹی۔"

شاہد نے کہا "بہتر ہے دفتر سے چھٹی لے لو۔"

اس کی بات کا جواب میری بجائے واجد نے دیا "چھٹی؟ بھائی جان چند دن تو ہوئے ہیں نوکری لگے۔ چھٹی کیسے مل سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" شاہد نے کہا "لیکن مجبوری بھی تو ہے۔"

"کون دیکھتا ہے بھائی جان مجبوری" میں نے کہا اور پھر انہیں باس کے متعلق بتانے لگا۔

"اباجی بیمار نہ ہوتے تو" میں نے کہا "تو میں کام میں دن دیکھتا نہ رات۔ محنت سے جی تو نہیں چراتا۔ پر کیا کروں۔ دو گھنٹے بھی دفتر میں رہوں تو دھیان ادھر ہی رہتا ہے۔"

"اللہ تمہاری مشکلیں آسان کرے" پھوپھا جی نے کہا اور پھر پیار سے بولے "کھانا کھاؤ۔"

"نہیں پھوپھا جی بھوک نہیں لگی۔"

"بھئی تھوڑا سا کھا لو۔ لا زہی پلیٹ میں سالن ڈال کر لے آ۔ روٹی ہے" انہوں نے سرخ دستر خوان میں لپٹی روٹیاں دیکھیں۔ توری گرم گرم روٹیوں پر دیسی گھی چپڑا ہوا تھا۔ ساتھ کریلے گوشت پکے تھے۔ دہی کی لسی بھی تھی----- میری مرغوب غذا تھی----- پھپھو نے بھی اصرار کیا۔

تو میں نے کہا "تھوڑا سا سالن لے آؤ زہی----- زیادہ نہیں۔"

وہ پلیٹ میں سالن ڈال لائی۔

میں پھوپھا جی کے ساتھ تپائی پر پلیٹ رکھ کر کھانا کھانے لگا صبح ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا۔ بھوک زوروں کی لگ اٹھی۔ میں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

پھوپھا جی تو سدا سے ہی پیار کرنے والے آدمی تھے۔ پھپھو بھی اچھی تھیں۔ شاکے نے درمیان میں آ کر پھپھو کے رویے میں کچھ سرد مہری بھر دی تھی۔

لیکن

آج میں نے پھر وہی گرمجوشی ان کے پیار میں دیکھی

شاید

اس دن اباجی نے جو باتیں کی تھیں ان کا اثر تھا یا پھپھو جمیلہ نے جو ان سے جھڑپیں لی تھیں ان کا ردعمل تھا۔

میں پرسکون ہو گیا۔ کم از کم ایک طرف سے تو کچھ تسکین ملی۔

○ ☆ ○

گھر میں ڈھیر سارے مہمان آئے ہوئے تھے۔ تایا جی اور تائی جی گجرات سے آئی تھیں---- رشتے کے ماموں اور ممانیاں تھیں۔ رحیلہ پھپھو کے سسرال والے تھے۔ گھر میں بیماری اوپر سے بلا کی گرمی اور مہمانوں کی بہتات گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔

میں دو اڑھائی بجے کے قریب کھانا کھا کر چھوٹے کمرے میں چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ شاید تھوڑی دیر کے لئے آنکھ بھی لگی۔

لیکن آنکھ کھل گئی۔

امی' قمو اور رانی چارپائی کے قریب فرش پر دری ڈالے بیٹھی تھیں۔ شاید مجھے سوتا سمجھ رہی تھیں۔

میں سوتا ہی بن گیا اور سرگوشیوں کو کانوں میں اتارنے لگا۔

امی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بولیں "کیا کروں---- سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"امی" رانی بولی "خدا کے لئے کچھ ہاتھ کھینچیں۔ اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا۔ ٹھیک ہے لوگ احوال پرسی کو آ رہے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں۔ کہ ان کی خاطریں کی جائیں۔"

"میں تو کہتی ہوں لیموں کی سکنجبین بنا لیا کریں۔ کوکا کولا سے پوری پڑتی ہے بھلا۔" قمو بولی "ابھی تو میں یوں کرتی ہوں کہ دو بوتلوں کے تین گلاس بنا لیتی ہوں کبھی کبھی برف زیادہ ڈال کر اور تھوڑا سا پانی ملا کر چار بھی بنا لیتی ہوں۔"

"پر میں کہتی ہوں کوک پلانا ضروری ہوتا ہے؟ ہمیں اپنے حالات بھی تو دیکھنے ہیں---- کہاں سے آئے گا پیسہ---- کوک شربت تو ایک طرف---- میں تو دہل جاتی ہوں گوشت سبزی لے کر----"

"رانی بیٹی" امی نے کہا "حوصلہ رکھو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ برادری میں ناک کٹوانی ہے کسی کو روٹی بھی نہ پوچھو---- پانی بھی نہ پلاؤ----"

"لیکن امی----"

"تیرے باپ نے ساری عمر اپنا وقار قائم رکھا---- اب---- اب میں----" امی رونے

لگیں۔

رانی تحمل سے بولی "امی خدا کے لئے حالات کو سمجھیں۔ نہیں ہے ہمارے پاس کچھ بھی---- ابا جی کی بیماری کا خرچہ بھی دیکھیں۔ کہاں سے آئے گا اتنا پیسہ---- ہسپتال لے جانا پڑا انہیں تو پیسہ اڑتا پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

امی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "اسی لئے تو وہ جانے کا نام نہیں لیتے۔"

رانی چپ ہو گئی۔

قمو بولی "راجے کے دوست نے تو کمرہ بھی لے لیا تھا ہسپتال میں----"

"کمرہ لے کر ہسپتال میں رہنا کوئی آسان ہے" رانی نے کہا

"پھر بیماری بھی تو ایسی ہے کہ گھر رہیں یا ہسپتال" امی پھر رونے لگیں۔ اب رانی اور قمو بھی امی کے ساتھ رو رہی تھیں۔

میرا دل بھی بھر آیا۔ لیکن میں ضبط کئے پڑا رہا۔

امی رانی اور قمو کو پیار سے دلاسہ دینے لگیں---- پھر قمو سے بولیں "جا ذرا جعفر کو بلا لا۔"

"کیوں" رانی نے پوچھا۔

"زمین کا پوچھوں اسے۔"

"وہ پلاٹ۔"

"ہاں۔ کیا کروں پھر اسے رجسٹری اور کاغذ دیئے ہوئے ہیں۔ جتنے کی بھی بکے بیچ دے۔"

میرا دل دہل گیا۔

رانی بولی "اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں۔ لیکن امی خدا کے واسطے مہمانداری کے خرچے کم کر دیں۔ اللہ جانے ابھی کتنا عرصہ لگے۔"

رانی کی آواز رندھ گئی۔

امی بولیں "اچھے وقت میں تیرے ابا نے یہ پلاٹ خرید چھوڑا تھا۔"

"آپ کے نام ہے نا رجسٹری۔"

"ہاں۔"

قمو کو امی نے جعفر ماموں کو بلانے بھیجا۔ وہ اباجی کے پاس بیٹھے تھے اور بزرگ بھی وہاں تھے۔

جعفر ماموں آئے "کیوں آپا۔"

"ادھر بیٹھ۔ میرے پاس" وہ بولیں۔

"کیا بنایا اس پلاٹ کا۔"

"بس دو ایک دن میں سودا ہو جائے گا---- بڑی معقول قیمت مل رہی ہے۔"

"جتنے کا بھی بکے دے دو۔"

"آپا۔ مٹی کے مول تو نہیں پھینکنا۔"

"ماموں---- آپ حالات جانتے ہی ہیں---- بیماری اور آیا گیا" رانی بولی۔

"ہاں---- یہ تو لگا رہتا ہے---- جو کوئی سنتا ہے رہ تو نہیں سکتا۔ بھائی جی نے ساری عمر سب سے لگا کر رکھی ہے۔ سب سے ہمیشہ پیار و محبت ہی سے ملے۔ دکھ درد بانٹے---- خوشی غمی میں سب کا ساتھ دیا---- اب لوگ بھول تو نہیں سکتے---- پیار کے ناطوں سے کھنچے چلے آتے ہیں----" جعفر ماموں نے جواب دیا۔

"پیسے کی ضرورت ہے جعفر---- جانتا بھی سب کچھ ہے----" امی نے کہا۔

"بس دو تین دن میں طے ہو جائے گا سودا۔ اچھے پیسے ملیں گے آپ فکر نہ کریں۔ زیادہ ہی ضرورت ہے تو میں----"

"نہیں" امی جلدی سے بولی "اللہ کا فضل ہے۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ماشاء اللہ اب تو راج کی تنخواہ بھی آ رہی ہے۔ ہمیں پلاٹ بیچنا ہے۔ بس تو جتنی جلدی ہو سکے بیچ دے۔ ہاتھ میں رقم ہونی چاہئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"بس پھر جلدی سے بیچ دے۔"

"اچھا۔"

"اور ہاں سن۔"

"جی آپا۔"

"کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ پلاٹ بکا ہے۔ سمجھے۔ میں نہیں چاہتی لوگ سمجھیں ہم کنگال ہو گئے۔ ایک شادی اور ایک بیماری سے نپٹ کر کسی کو پتہ چلا تو میں تجھ سے سمجھوں گی۔"

جعفر ماموں نے آہستگی "پتہ چل بھی گیا تو کیا ہو گا آپ کی اپنی زمین ہے۔ رکھیں یا بیچیں۔"

"اے ہے۔ تو کب سمجھے گا۔ بدنامی کروانی ہے خاندان میں لوگ باتیں بنائیں گے۔"

امی نے پورا لیکچر جعفر ماموں کو دے ڈالا۔ جعفر ماموں مجھ سے کوئی تین چار سال ہی بڑے تھے۔ اپنا لکڑی کا کاروبار تھا۔ لوگوں سے واقفیت کا دائرہ وسیع تھا۔ کچھ زمینوں کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ امی نے اس لئے انہیں اعتماد میں لے کر زمین بیچنے کو کہا تھا۔

امی کے نظریات اپنے ہی تھے۔ ان حالات میں بھی وہ اپنا بھرم رکھے ہوئے تھیں---- گھر کا خرچہ بھی چل رہا تھا۔ علاج معالجے پر بھی خرچہ ہو رہا تھا۔ مہمانوں کی خاطرداری بھی ہوتی تھی۔ امی جان کیسے یہ سب کچھ نباہ رہی تھیں---- اپنے بھرم پر کوئی حرف آئے---- یہ انہیں گوارا نہ تھا۔

میرے دل میں امی کے لئے محبت و عقیدت کے جذبات بے چین ہو گئے کتنا دکھ جھیل رہی تھیں وہ۔

جعفر ماموں اٹھ کر گئے تو میں چارپائی پر اٹھ بیٹھا---- قمو سے میں نے پانی مانگا۔

رانی نے میری طرف دیکھا---- قمو پانی لینے چلی گئی۔ صحن میں بچوں نے شور مچایا ہوا تھا۔

"امی" میں نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد کہا۔

"ہوں۔"

"آپ زمین بیچ رہی ہیں۔"

امی نے میری طرف دیکھا---- رانی بولی "تم جاگ رہے تھے۔"

"کون سو سکتا ہے" میں بولا---- پھر صحن میں بچوں کے شور کی طرف رانی کو متوجہ کرتے ہوئے بولا "خدا کے لئے ان کا کچھ کرو۔ یہ تو اباجی کو چند لمحوں کا چین بھی نہیں لینے دیتے۔"

"میں کیا کروں" وہ بولی

"میرا خیال ہے اباجی کو ہسپتال داخل کروا دوں---- یہاں تو یہی کچھ ہوتا رہے گا۔"

"بات تو ٹھیک ہے راجو۔"

"لیکن وہ کب مانتے ہیں" امی بولیں۔

"میں منوا لوں گا---- اس طرح تو وہ----"

میں چپ ہو گیا۔ آواز میرے حلق میں گھٹ گئی۔ اباجی کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی---- درد بے چین رکھتی تھی اور گھبراہٹ کے دورے پڑتے تھے۔

امی اور رانی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

چند لمحے سوگوار سی خاموشی طاری رہی۔ قمو پانی لے آئی۔ میرا جی برف والا پانی پینے کو چاہ رہا تھا لیکن قمو پانی لائی تو جیسے حلق میں گھونٹ پھنسنے لگے۔

میں نے چند گھونٹ لے کر گلاس قمو کو پکڑا دیا۔ پھر چارپائی سے اٹھ کر امی کے پاس دری پر آ گیا۔ امی کی گود میں سر رکھ کر میں وہیں لیٹ گیا۔ امی میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

روہانسی آواز میں بولا "امی---- کیا بنے گا---- کیا ہو گا----"

امی کا دل ٹکڑے ہو رہا تھا لیکن ماں تھیں اپنا دکھ سینے میں اتار کر بڑے تحمل سے بولیں۔

"راج بیٹے۔ اللہ پر بھروسہ رکھ۔ شکر ہے زمین کا یہ ٹکڑا کسی اچھے وقت خرید لیا تھا۔ کسی سے بات نہ کرنا بیچنے کی---- وقت گزارنا ہے ہمیں----"

رانی ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی "اباجی نے یہ ٹکڑا تیرے لئے خریدا تھا راجے۔ کہتے تھے میرا راج اس زمین پر بنگلہ بنائے گا۔"

امی آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے رانی کو چپ کرانے لگیں میں ان کی گود میں منہ چھپائے سسکنے لگا۔

شاید ہم تینوں سیلابی صورت میں آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے والے تھے کہ مجو مجھے ڈھونڈتا آ گیا۔

"اوہ بھائی جان۔ آپ ادھر ہیں میں اوپر آپ کو ڈھونڈنے گیا تھا" وہ بولا۔

"کیوں" میں نے سر اٹھایا۔

مجو ہمیں روتا دیکھ کر گھبرا کر بولا "کیا ہوا امی----"

"کچھ نہیں" میں نے کہا "کیوں ڈھونڈ رہا تھا مجھے۔"

"آپ کے دوست آئے ہیں۔"

"کون۔"

"شکیل صاحب۔"

"کہاں ہیں۔"

"بیٹھک میں بٹھایا ہے۔"

"چلو آتا ہوں۔"

میں اٹھا---- امی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں "مجو بوتل لے آ ان کے لئے۔"

"رہنے دیں امی" میں نے کہا "ضرورت نہیں۔"

"ہائے ہائے---- اتنا کچھ وہ بیچارہ ہمارے لئے کر رہا ہے اور تو اسے پانی کا گھونٹ نہیں پلا سکتا----" وہ بولیں پھر مجو سے کہا "جا لے آ بوتل۔ ٹھنڈی دیکھ کر لانا۔"

میں اٹھ کر سامنے غسل خانے میں گیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ بال ٹھیک کئے۔ صحن میں شور کرتے بچوں کو ڈانٹا---- اور بیٹھک میں آ گیا۔

شکیل میری سرخ آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ جلدی سے بولا "اباجی کا کیا حال ہے۔"

"بس خراب ہی ہے یار" میں کرسی میں گر گیا۔

"دوائی لے رہے ہیں۔"

"کبھی لے لیتے ہیں۔ کبھی نہیں لیتے۔"

"ہوسپٹل میں یہ بات تو نہیں ہوتی نا---- تم لوگوں نے غلطی کی۔ میں تو کہتا ہوں۔ اب بھی ایڈمٹ کرا دو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ گھر میں تو مچھلی بازار لگا ہوا ہے۔ سن رہے ہو نا شور۔"

"ایسے نہیں ہونا چاہئے۔"

"ان رشتہ داروں کو سمجھانا مشکل ہے شکیل۔ ذرا کچھ کہیں تو ناراض ہو بیٹھتے ہیں----"

"خود احساس نہیں انہیں----"

"اوں ہوں۔ رواج ہے ہم لوگوں میں۔ کوئی بات ہو تو پوری برادری اکٹھی ہو بیٹھتی ہے۔"

شکیل چپ ہو گیا۔

مجو کوک لے آیا۔ شکیل نے اس کے گال پر چپت لگاتے ہوئے پیار سے کہا "تجھے کوک لانا نہیں بھولتا---- میرے لئے تکلف نہ کیا کرو----"

"امی نے کہا تھا" مجو سادگی سے بولا۔

شکیل نے کوک اس سے لے لی۔ ہم دونوں اباجی کی باتیں کرنے لگے۔ ڈاکٹری رپورٹ کا تذکرہ ہونے لگا---- میں بے حد اداس اور بے چین تھا۔

شکیل اباجی کے پاس بھی چند منٹوں کے لئے گیا۔ وہ جب بھی آتا تھا۔ انہیں دیکھ کر جاتا تھا۔ اباجی نقاہت کے باوجود اس سے مسکرا کر ملتے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے۔ شکیل ان سے بے حد مرعوب تھا۔

واپس آ کر ہم پھر بیٹھک میں بیٹھ گئے۔

باتیں ہونے لگیں۔

"ڈیڈی کا خط آیا" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہوں---- آج ہی آیا ہے ایک---- دو دن پہلے فون آیا تھا۔"

"ہو گیا کام۔"

"بس ہو ہی جائے گا۔"

"آفس تو لے لیا ہے نا۔"

"ہاں----"

"تم لوگ کب تک جاؤ گے۔"

"ابھی ٹھیک پتہ نہیں۔ دو چار ماہ تو اور لگیں گے ہی۔"

میں نے کرسی کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شکیل کے ڈیڈی لندن جا چکے

تھے۔ وہاں بزنس سیٹ کر رہے تھے۔

"راج" شکیل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ڈبی میری طرف بڑھا دی۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "کیوں مروانا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں گھر میں میری سگریٹ نوشی کا۔"

وہ مسکرا دیا ڈبیہ اور لائٹر واپس جیب میں ڈال لیا۔

"ظہیر اکرم سے ٹھیک نبھ رہی ہے" وہ چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولا۔

"یار بڑا سخت آدمی ہے۔

کام کے معاملے میں۔"

میں مجبور نہ ہوتا۔ تو ایک دن اس کے ساتھ کام نہ کرتا۔"

"اوہ ہاں راج-----" شکیل کو جیسے اچانک ہی کچھ یاد آگیا۔

"کیا-----"

میں اس سے ملا تھا۔" وہ بڑا ایکسائیٹڈ تھا۔

"کس سے۔"

"وہ----- مس ڈوگر۔"

"کون۔"

"ارے یار یاد نہیں۔ ماہو کی برتھ ڈے پر مسز اعجاز نے رحمان ڈوگر کی بیٹی کے متعلق بتایا تھا۔

میں نے ذہن پر زور دیا۔ میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ کچھ یاد نہ کر پایا۔

"بھئی انہوں نے بتایا نہیں تھا---- رحمان ڈوگر کے متعلق۔ سریے کی مل ہے جن کی-----

جو اپنی بیٹی کی بات بہت مانتا ہے۔ اوہ خدایا تمہارا حافظہ اتنا کمزور ہے۔"

وہ مجھے یاد دلانے لگا۔

مجھے یاد آگیا۔

"ہاں وہ بتا رہی تھیں۔ بدصورت لڑکی ہے شاید-----"

"توبہ توبہ" شکیل نے کانوں کو ہاتھ لگایا "بھئی میں نے اپنی زندگی میں ایسی لڑکی نہیں دیکھی-----"

"تم کہاں جا ملے اسے۔"

"کلب میں اتفاق سے اس دن مسز اعجاز بھی آئی تھیں۔ ٹکرا دیا" وہ ہنسا

"پھر-----"

"پتہ چلا ہے کہ واقعی رحمان ڈوگر اس کی ہر بات----- غلط ہو صحیح بلا چوں و چراں مان لیتا ہے۔"

"ہوں۔"

"کسی دن تمہیں ملاؤں گا اس سے۔"

"کیوں۔"

"شاید کوئی اچھی جاب مل جائے اس کے توسط سے۔"

"ہونہہ----" میں نے تمسخر اڑایا۔

"نہیں راج---- واقعی بہت سے لوگوں نے سنا ہے۔ بس اس تک رسائی ہو جائے تو-----"

"فضول باتیں ہیں۔"

"فرق کیا پڑتا۔ اس سے علیک سلیک ہو جائے۔ کامیابی کا زینہ ہے سمجھے زینہ-----"

میں نے شکیل پر ایک نگاہ ڈالی---- پھر بولا "ابھی یہ حالت نہیں ہوئی کہ اس قسم کے زینوں کا سہارا لوں دوست-----"

"ہرج کیا ہے۔ اچھی جاب مل جائے تھوڑی سی دوستی-----"

"شکیل پلیز کوئی اور بات کرو

میں اس وقت ایسی باتوں کے موڈ میں نہیں تھا۔ شکیل سمجھ گیا اس بارے میں پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھتے ہوئے بولا "باہر چلو گے۔"

"کہاں۔"

"کہیں۔"

"نہیں یار----- مجھے بہت سے کام ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم باتیں کرتے باہر نکل آئے۔ میں اسے بڑی سڑک تک جہاں اس نے گاڑی کھڑی کی تھی چھوڑنے گیا۔

○ ☆ ○

پہلے ڈاکٹر اور پھر نرس تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ میں ہسپتال کے کمروں کے سامنے طویل برآمدے کے ایک در میں جنگلے کا سہارا لئے کب سے کھڑا تھا----

ڈاکٹر اور نرس کے اس طرح اندر جانے سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ اباجی کی حالت تین دن سے نازک تھی۔ کینسر کی تباہ کاری کی آخری سٹیج تھی۔ اب تو خون بھی پیٹ سے آنا شروع ہو گیا تھا۔ غشی کے دورے بھی پڑتے تھے اور درد میں بھی شدت آ گئی تھی۔

صبح سے میں یہاں کھڑا تھا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ اباجی کو جا کر دیکھوں بہت سارے مرد اور عورتیں کمرے کے اندر اور باہر کھڑے تھے۔ وزیٹنگ آورز نہیں تھے۔ لیکن مریض کی حالت کے پیش نظر ڈاکٹروں نے بھی ڈھیل دے دی تھی۔ امی کی حالت بری تھی۔ جمیلہ پھپھو اور رفیہ خالہ انہیں سہارا دے کر کبھی اندر لے جاتی تھیں کبھی باہر لے آتی تھیں۔ رانی باہر آ کر جی بھر کر رو لیتی اور پھر ہمت کر کے اندر چلی جاتی۔ قمو کو تو جعفر ماموں گھر چھوڑ آئے تھے۔ رو رو کر اس نے برا حال کر لیا تھا۔ زوبی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ مجو اور ناجا کو امجد ساتھ لے گیا تھا۔

میں سب سے ہٹ کر الگ کھڑا تھا۔

وسیم خالو میرے پاس آئے تھے "بیٹا چل کر ابا کے پاس بیٹھو۔"

"نہیں" میں نے خوفزدہ ہو کر کہا

ایسا ہی جواب میں نے فاضل بھائی کو بھی دیا تھا۔

میرا سارا وجود کانپنے لگتا تھا اور دل ڈوب ڈوب جاتا میں تو یوں کھڑا تھا جیسے سکتہ ہو گیا ہو---- جو کچھ ہونے والا تھا اس کا اثر میرے اعصاب پر پڑ رہا تھا---- اور اسی دباؤ میں ایک زندہ حقیقت سے فرار کی کوشش کر رہا تھا۔

نرس دروازہ کھول کر باہر دوڑی۔ کئی عزیز اس کی طرف لپکے شکیل بھی آیا ہوا تھا۔ اس کی طرف گیا۔

لیکن

وہ بے حد عجلت میں تھی۔

کسی کی بات کا جواب دیا نہ کسی کی طرف دیکھا۔ شفاف برآمدے کے چکنے فرش پر اس کی جوتیوں سے نکلتی آواز بتا رہی تھی کہ وہ تیزی سے کہیں جا رہی ہے۔

کمرے کا دروازہ پھر کھلا۔ رحیلہ دوپٹہ میں منہ چھپائے سسکیاں لیتی باہر آ گئی----

عورتیں مرد اس کے گرد اکٹھے ہو گئے وہ مایوسی میں سر منفی انداز میں ہلا ہلا کر باتیں کرتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔

میری آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا۔

آج گرمی بے انتہا تھی۔ صبح سے نہایا دھویا بھی نہیں تھا۔ رات بھر جاگتا رہا تھا۔ میرے ساتھ شاہد اور رفیق چچا بھی تھے۔ فاضل بھائی بھی کچھ گھنٹے جاگے تھے۔

لیکن

صبح سب گھر چلے گئے تھے کسی نے گھنٹہ آدھ گھنٹہ نیند نکالی تھی۔ کوئی نہا دھو کر آیا تھا ناشتہ بھی سبھی نے کیا تھا۔

مجھے بھی جعفر ماموں نے گھر جانے کے لئے کہا تھا "شیو کر کے نہا دھو لو۔ گرمی بہت ہے۔ کچھ کھا پی بھی آنا----۔"

لیکن

میرا جی نہیں مانا تھا۔

میں برآمدے ہی میں گھومتا پھرتا رہا تھا۔ ساتھ والے کمروں کے مریضوں کی ہائے وائے سنتا رہا تھا۔

میری عجیب حالت تھی۔ اباجی کے قریب بھی رہنا چاہتا تھا۔

اور

انہیں بچھڑتے دیکھنے کی سکت بھی نہ تھی۔

تیزی سے جانے والی نرس سٹین لیس سٹیل کی ٹرے میں انجکشن کا سامان اٹھائے نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ دو ڈاکٹر بھی تھے۔ سب جیسے بدحواسی کے عالم میں کمرے کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

میرا سارا وجود انتہائی گرمی کے باوجود برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ شکیل میری طرف لپک کر آیا "راج---- چلو اندر چلو----"

"کیوں" میں نے پاگلوں کی طرح پوچھا۔

شکیل کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

شکیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس وقت فاضل بھائی میری طرف تیزی سے آئے۔

"سراج ---- سراج اندر آؤ ---- چچا جی ----" ان کا لہجہ ٹوٹ گیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مجھے اندر لے گئے۔

اباجی کے بیڈ پر تینوں ڈاکٹر جھکے ہوئے تھے۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بے اختیارانہ باہر دوڑا۔

وہ دن کتنا خوفناک تھا۔ مشرقی سمت سے آسمان کا رنگ بے حد مٹیالا ہو رہا تھا۔ جھکڑ اور آندھی آنے والی تھی۔ فضا بالکل ساکن تھی۔ پرندے بھی کہیں درختوں میں دبکے بیٹھے تھے۔

آندھی اور جھکڑ تیزی سے امنڈ رہے تھے۔ آسمان کا رنگ لال لال ہو رہا تھا---- مٹی اور گرد و غبار چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر ڈھل چکی تھی---- سورج غبار کی تہوں میں چھپ گیا تھا۔ عجیب سا بے نور گولا لگ رہا تھا۔

مجھے پھر کسی نے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا

اب چچا رفیق تھے۔

"اندر چلو---- باپ کو رخصت کرو----" وہ رو دیئے

جعفر ماموں دروازے کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ ان کا رنگ فق تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔

دو چار آدمیوں نے مجھے اندر آنے کے لئے کہا۔ شکیل نے میرا بازو پکڑا اور پھر اندر لے گیا۔

ہسپتال کا یہ چھوٹا سا کمرہ لوگوں سے بھرا تھا۔ اباجی بیڈ پر پڑے تھے ڈاکٹر نے انجکشن دیا تھا۔ دوسرا نبض پکڑے تھا۔ تیسرے کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں ان کے چہروں پر مایوسی کی چھاپ تھی۔ نرسیں خاموش کھڑی تھیں۔

"میرے بچوں کو لے آؤ جا کر۔ باپ سے مل تو لیں" امی نے سینے پر دوہتڑ مار کر بے اختیار ہوتے ہوئے کہا---- رانی بھی بے اختیارانہ رونے لگی۔

ڈاکٹروں نے پلٹ کر دیکھا اور دوسری عورتوں کو اشارہ کیا کہ انہیں باہر لے جائیں۔ زیبی رانی کو باہر لے گئی۔ امی وہیں ہولے ہولے سینہ کوبی کرتی رہیں۔

پھر جانے کون قمو، مجو اور ناجے کو لینے دوڑا۔

میں بیڈ کے قریب آ کر اباجی کو بے معنی خیز نظروں سے تکنے لگا۔ بیڈ کے سرہانے ہمارے محلے کے چچا خیرالدین دھیمی آواز سے سورہ یسین پڑھ رہے تھے دوسری جانب ماسی رحمت بی بی قرآن پاک کھولے دردناک آواز میں تلاوت کر رہی تھیں۔

اباجی جیسے دم سادھے پڑے تھے۔

ڈاکٹروں نے نرسوں سے کچھ کہا۔ پھر تینوں باتیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

میں اسی انداز میں بت بنا کھڑا رہا۔

اباجی کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"سراج ہے" سلطان خالو نے مجھے ان کی طرف جھکاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے ہولے ہولے سر ہلایا۔

اباجی نے بمشکل اپنا ہاتھ اونچا کیا۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"اباجی----" میں نے اپنا چہرہ ان کے چہرے سے لگا دیا۔

وہ کچھ کہہ رہے تھے۔

میں سمجھ نہ پایا۔

کسی کو بھی سمجھ نہ آیا۔ کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔

پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا اور میں پلنگ کے قریب جھکا کھڑا تھا۔

کافی وقت یونہی گزر گیا۔

پھر اباجی کے ہونٹ ہلے۔

غالباً انہوں نے سراج کہا تھا۔

"جی" میں نے کہا---- اور بھی لوگ بیڈ کے اردگرد آ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ رک رک کر کچھ کہہ رہے تھے۔

ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو جوڑ پایا۔ تو دل خون ہو گیا---- اباجی عالم نزع میں بھی میرے لئے فکر مند تھے۔ وہ کہہ رہے تھے---- "تم---- پر---- بڑی---- ذمہ داریاں---- ڈالے---- جا رہا ہوں---- حوصلہ---- نہ---- ہارنا----"

میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔

اباجی پھر خاموش ہو گئے----

وہ وقفوں سے ہوش میں آتے تھے---- نقاہت بہت تھی۔ لیکن لگتا تھا ان کے حواس بجا ہیں۔

انہوں نے ایسی ہی حالت میں قمو کو بھی سینے سے لگایا تھا---- اور زوبی کو بھی---- ناجے اور مجو کو دیکھ کر تو ان کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ اذیت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

امی کو بھی وہ حسرت بھری نگاہ سے چند لمحے تکتے رہے تھے۔

لمحہ لمحہ صدیوں پر محیط ہو کر گزر رہا تھا۔

مشرقی سمت سے اٹھنے والا جھکڑ اور آندھی ساری فضا میں پھیل گئی تھی۔ درختوں کی شائیں شائیں ہولناک تھیں۔ گرد و غبار سے قریبی چیزیں بھی نظر نہ آ رہی تھیں۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ جو نرس کے بتیاں جلا دینے کے باوجود یوں لگتا تھا۔ دبیز ہوتا جا رہا ہے۔

اس وقت سورج غروب ہو گیا تھا۔

اور

ہسپتال کی مسجد میں موذن نے اذان دی تھی۔

اباجی جو گھنٹوں سے نزع کے عالم میں تھے اذان کے خاتمے کے ساتھ ہی آخری ہچکی لے کر یوں چپ سادھ گئے جیسے اذان ہی کا انتظار تھا۔ اباجی نے جان جان دینے والے کے حوالے کر دی۔

ہم سب بہن بھائی ان سے لپٹ گئے۔ کمرہ چیخوں سے گونج اٹھا امی نے سینہ پیٹ لیا اور عزیز و اقارب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اک کہرام مچ گیا۔

ڈاکٹر دوڑے آئے۔ نبض دیکھی آنکھوں میں ٹارچ سے روشنی ڈالی اور پھر سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

پتہ نہیں کس نے ایمبولینس کا بندوبست کیا اور کون ہمارے لئے سواری لایا۔ ہم اباجی کی میت کو گھر لے آئے تو لوگ ٹوٹ کر آئے۔ گھر لوگوں سے بھر گیا گلی میں لوگ جمع ہو گئے۔

برادری اور محلے کے لوگوں نے پورے خلوص سے کام کیا۔ میت کو رات گھر پہ ہی رکھنا تھا۔ گرمی شدید تھی۔ برف کی سلیں لائی گئیں۔ پیڈسٹلوں کا بندوبست کیا۔ چھت پر صحن میں اور گلی میں بڑے بڑے بلب روشنی کے لئے لگائے گئے۔ یہ سب کچھ کون کر رہا تھا مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔

میں تو صحن میں رکھی میت کے سرہانے جا بیٹھتا تھا۔ کبھی پائینتی۔ کبھی چپ ہو جاتا۔ کبھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ قمو کی چیخیں سب کا دل دہلا دیتی تھیں۔

رات آنکھوں ہی آنکھوں میں بیت گئی۔ روتے دھوتے نالہ و شیون کرتے۔ ایک دوسرے کو چپ کراتے---- رات گزر گئی۔

جنازہ دس بجے اٹھنا تھا---- دور دور کے عزیزوں کو بھی اطلاع دی گئی تھی لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ عورتیں آتیں تو کچھ دیر کے لئے کہرام مچ جاتا۔

محلے کے دو تین گھروں کی بیٹھکیں خالی کروا کے دریاں بچھا دی گئی تھیں---- جہاں مرد بیٹھے

تھے۔ عورتیں اپنے ہی گھر میں تھیں۔

اباجی کو غسل دے کر کفنایا گیا---- موتیے کے بے شمار ہار ڈالے گئے۔ عطر و لوبان کی ماتمی خوشبو سے گھر بھر گیا---- اباجی کے چہرے پر نور ہی نور تھا۔ چہرہ اس طرح بھر گیا تھا کہ لگتا ہی نہ تھا کہ اتنا عرصہ بیمار رہے ہیں۔

میں جی بھر کر اس مشفق چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد یہ چہرہ منوں مٹی تلے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپ جانے والا ہے۔

گرمی کے پیش نظر جنازہ دس بجے اٹھا لیا گیا۔

بہت سارے مرد اندر آئے---- اور میت کو بڑے احترام سے کندھوں پر اٹھا لیا۔

اک قیامت بپا ہو گئی۔

میری امی نے بچھاڑیں کھائیں۔

رانی اور قمو اور زوبی میت کے پیچھے چیخیں مار مار کر بھاگیں۔ میں نے مجو اور تاج کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ میں پاگلوں کی طرح انہیں پیار کرتے ہوئے رو رہا تھا---- ہم سب کی حالت ایسے قافلے کی سی تھی جو سرِ راہ کٹ گیا ہو۔

اباجی کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھا تھا۔

اتنے لوگ شریک ہوئے تھے---- کہ میت کو کندھا دینے کی باری ہی نہ آتی تھی۔

اپ طور تو مجھ سے قدم بھی نہ اٹھایا جا رہا تھا۔ شاہد اور فاضل بھائی باری باری سہارا دے رہے تھے۔

دفن کر کے سب واپس ہوئے

میں گھر میں داخل ہوا---- تو یوں لگا جیسے گھر بے چھت کے ہے اور میری سب سے بڑی پناہ گاہ غیر محفوظ ہو گئی ہے۔

شفقتوں محبتوں اور چاہتوں کے سائے اٹھ گئے تھے۔

میں

کتنا تنہا رہ گیا تھا۔

○ ☆ ○

آج موسلادھار بارش ہوئی تھی۔ مطلع اب بھی ابر آلود تھا۔ گہرے نیلے سرمئی اور سفید سفید بادل ہواؤں کے دوش پر اڑتے پھر رہے تھے۔ کبھی کبھی پھوار پڑنے لگتی----- سارا دن خوب لگ رہا تھا۔ روز ہی بادل آ جاتے ٹھنڈی نم آلود ہوائیں چلتیں۔ بارش ہوتی۔ پھر مطلع صاف ہو جاتا چمچماتا' سورج نکلتا۔ ہوا بالکل بند ہو جاتی۔ حبس اور گھٹن شدید ترین صورت اختیار کر لیتے۔ پھر کمروں میں پناہ ملتی نہ باہر۔ پسینہ ندیوں کی صورت بہنے لگتا اور دم گھٹتا محسوس ہوتا۔

یہ معمول ہی بن گیا تھا۔ رات بڑا حبس تھا۔ گرمی بلا کی تھی۔ پنکھوں کے آگے بھی آرام نہ ملا تھا۔

لیکن علی الصبح ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی چلنے لگی تھیں اور جھومتے سیاہ بادل گھر آئے تھے۔

پھر

جو بارش ہوئی اور ہوائیں چلیں تو یوں لگا لاہور مری بن گیا ہے۔ آج موسم کی شدید ترین بارش ہوئی تھی۔ گلیوں میں پانی بھر گیا تھا۔ ہمارا علاقہ نشیبی نہیں تھا۔ اس لئے بارش ختم ہونے کے بعد پانی اتر گیا تھا۔ ہوائیں اب بھی چل رہی تھیں۔ نمی پر دوش ہوائیں موسم کو بے حد خوبصورت بنا رہی تھیں۔

میں زیبی کے ہاں اوپر والی منزل کے صحن میں بیٹھا تھا۔ امجد اور زیبی ہی گھر پر تھے۔ واجد دوبئی چلا گیا تھا۔ شاہد اور پھوپھا جی کام پر تھے اور فہمیدہ پھپھو اپنی نند کی احوال پرسی کو گئی ہوئی تھیں۔

باورچی خانے میں جیراں برتن مانجھ رہی تھی۔

زیبی پلاسٹک کی ٹوکری میں بہت سارے آم لے آئی۔ میں کرسی پر تھا۔ امجد چارپائی پر----- درمیان میں پرانی سی میز جو بارش میں دھل دھل کر اپنا رنگ چھوڑ چکی تھی رکھی تھی۔

زیبی نے ٹوکری میز پر رکھ دی۔ پلیٹیں اور چھری بھی لے آئی۔ امجد کے قریب چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کھاؤ راجو----- بڑے میٹھے آم ہیں۔"

"ٹھنڈے بھی-----" امجد نے کہا اور آم اٹھا لیا۔

"امجد" زیبی نے ڈانٹا "تمہارا پیٹ نہیں بھرا ابھی۔"

"آموں سے پیٹ بھرتا ہے۔ وہ ہنسا اور آم کو دونوں ہاتھوں میں مسل مسل کر نرم کرنے لگا۔

"کاٹ کر کھاؤ" زیبی نے کہا۔

"یہ تکلف تم ہی کرو۔ ہمیں اس طرح طرح اچھا لگتا ہے" اس نے آم منہ سے لگا کر چوسا۔

"بدتمیز" زیبی نے اسے گھورا----- ہلکے پیازی پھولدار وائیل کے کپڑوں میں زیبی کی سنہری رنگت بھی گلابی گلابی عکس دے رہی تھی۔ اس لئے سیاہ بال کھلے تھے۔ پشت پر پھیلے تھے۔ کچھ کندھوں پر آ گئے تھے اس کی آنکھوں میں بڑی جاندار چمک تھی۔

"لو نا" اس نے مجھے آم لینے کے لئے کہا۔

"اگر میں بھی امجد کی طرح کھانا چاہوں۔ تو خلاف آداب تو نہ ہوگا" میں نے مسکرا کر زیبی سے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگی "دونوں ہی ایک جیسے ہو۔"

"بھائی بھائی ہیں" امجد نے مزے سے آم چوستے ہوئے کہا۔

"کاٹنے والے آم ہیں۔ انہیں کھانے کا سلیقہ بھی ہونا چاہئے" وہ خوش دلی سے بولی۔

"اس طرح مزہ نہیں آتا" امجد بولا۔

"واقعی" میں نے بھی آم اٹھا لیا۔

زیبی اپنا آم کاٹ کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولی "اس طرح کھا کر بھی دیکھا ہو تب نا۔"

"تم ہی کھاؤ" امجد بولا----- اب وہ گٹھلی نکال کر چوس رہا تھا۔

"کیسے بیہودہ لگ رہے ہو" زیبی نے کہا۔ امجد اسے چڑانے کے لئے کچھ زیادہ ہی بدتمیزی کر رہا تھا۔

میں ہنسنے لگا----- آم مسل کر میں نے بھی ڈھیلا کر لیا۔

زیبی آم کی قاش اٹھا کر کھانے لگی۔ امجد ہنس کر بولا "اتنا بننے کی کیا ضرورت ہے۔"

"کیوں" وہ غرائی

"بڑی نفاست سے کھا رہی ہو۔"

"تمہیں کیا۔"

"نفاست سے کھانا ہے تو چمچ لے آؤ----- آم کو کمر سے کاٹو اور پیالہ سا بنا کر چمچ سے کھاؤ۔"

"بہو نہ ----

بہن بھائی کی چھیڑ چھاڑ میں لڑائی ہو گئی---- میں محظوظ ہو رہا تھا۔ یہ خوبصورت لڑائیاں ہم بھی تو لڑتے تھے۔

میں نے دو اور امجد نے تین آم چوسے۔ زیبی نے ایک ہی آم کھایا۔

"اور کھاؤ" زیبی نے مجھ سے کہا۔ امجد نے آم کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ زیبی نے اس کے ہاتھ پر چھری کا دستہ مارا "مرنا ہے اتنے آم کھا کے۔"

"موسم جو ہے آموں کا" میں نے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے صبح سے کتنے آم کھا چکا ہے۔"

"بس نظر نہ لگانا----" امجد نے باورچی خانے میں جا کر ہاتھ دھوئے میرے لئے بھی وہ مگ میں پانی لے آیا۔ میں نے دیوار کے قریب جا کر ہاتھ دھوئے

زیبی برتن اور آم اٹھا کر لے گئی۔

"اب؟" امجد نے اس کے واپس آ کر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"اب کیا" وہ بولی۔

"بھئی موسم تو دیکھو کیا کہتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے۔"

"میٹھے پورے-----"

"واہ واہ-----" میں نے کہا۔

امجد شہہ پا کر بولا "زیبی بہت اچھے بناتی ہے۔ بھائی جان۔ فرمائش ہو جائے۔"

"تم کر دو۔"

"مجھے تو جوتے مارے گی آپ کہیں۔"

زیبی اس کی شوخی پر مسکرائے جا رہی تھی۔ موسم واقعی بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔ ایسے موسم میں پکوڑے یا پوڑے دونوں ہی بہت لطف دیتے تھے۔

"کھاؤ گے" زیبی نے مجھ سے پوچھا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ" میں ہنسا

"ابھی بناتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

باورچی خانے میں جا کر وہ ڈبے دیکھنے لگی---- سوجی شاید تھوڑی تھی وہ آئی تو ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ تھا۔

"امجد۔"

"ہاں۔"

"بھاگ کے سوجی لے آؤ۔"

"گھر میں نہیں ہے۔"

"یہ ذرا سی ہے۔"

"کافی ہے۔"

"اس کا تو ایک پوڑہ بھی نہیں بنے گا۔"

"میں لے آتا ہوں" میں نے کہا۔ تو امجد ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "نہیں بھائی جان میں لے آتا ہوں۔"

اس نے زیبی سے پیسے لئے اور سوجی لینے چلا گیا۔ زیبی نے ڈبہ میز پر رکھ دیا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میری نگاہیں بے تابی شوق سے زیبی کے بدن میں گڑنے لگیں وہ نگاہوں کی تپش سے لجا گئی میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

ان دنوں قمو کے رشتہ کی بات چل رہی تھی اباجی کی بیماری اور فوتیدگی میں جمیلہ پھپھو کی نند آتی رہی تھیں۔ قمو انہیں بہت پسند آئی تھی چالیسواں ہوتے ہی رشتہ لے کر آ گئی تھیں۔ ان کا بیٹا ایئرفورس میں وارنٹ افسر تھا۔ جمیلہ پھپھو نے ہمارے حالات سے انہیں آگاہ کر دیا تھا وہ نکاح کر کے قمو کو لے جانا چاہتی تھیں---- جہیز کی متقاضی بھی نہ تھیں---- امی راضی تھیں---- اتنا بڑا بار سر سے اس آسانی سے اتر جائے گا کسے یقین تھا-----

میں قمو کے رشتہ ہی کی باتیں کرنے لگا۔

"ہائے راجو---- اتنی جلدی۔ ابھی تو ماما جی کو فوت ہوئے دو مہینے ہی ہوئے ہیں" زیبی بولی۔

"ٹھیک ہے" میں نے گہری سانس لی۔

"اپنے حالات بھی تو دیکھنا پڑتے ہیں---- اتنا اچھا رشتہ چھوڑنا عقلمندی تو نہیں۔"

"ہوں۔"

"لڑکا بڑا ہینڈسم ہے شریف ہے۔ ترقی کے بھی بہت چانس ہیں" میں نے کہا

"تم نے دیکھا لڑکا۔"

"ہاں تحقیق بھی کر لی سبھی نے تعریف کی ہے۔"

"ہاں کر دی۔"

"ابھی نہیں۔ کل رانی کو لینے جاؤں گا۔ امی اس سے صلاح و مشورہ کرنا چاہتی ہیں-----"

میں کل رانی کو لینے جا رہا تھا۔ شکیل سے گاڑی مانگ لی تھی۔ قمو زیبی بھی ساتھ جا رہی

تھیں۔ میں نے زیبی سے پوچھا "چلو گی۔"

"کہاں۔"

"گجرات۔"

"کب۔"

"کل قمو اور زیبی بھی میرے ساتھ جا رہی ہیں۔۔۔۔"

"ٹرین سے جاؤ گے۔"

"کار میں شکیل سے کار مانگوں گا۔ چلنا ہو تو۔۔۔۔"

"جانا تو میں نے بھی ہے۔۔۔۔ پر امی سے پوچھ لوں" وہ بولی "صبو سے ملنے جانا ضرور ہے میں نے۔" صبو تایا کی چھوٹی بیٹی زیبی کی ہم عمر اور دوست تھی۔

"بس پھر تیار ہو جاؤ۔۔۔۔ صبح جا کر شام کو واپس آ جائیں گے۔"

"امی نے جانے دیا تو۔"

"امی کو راضی کر لینا۔"

میں نے شوخی سے زیبی کی آنکھوں میں جھانکا۔ کچھ رکا پھر بولا "پھپھو کو راضی کر لینے میں تو تم ماہر ہو۔"

وہ میری شوخی کو سمجھ کر شرما گئی۔

پچھلے دنوں پھپھو فہمیدہ پھر تذبذب میں پڑی ہوئی تھیں۔ شاکے کی کمائی سے مرعوب تو تھیں ہی۔۔۔۔ اس دفعہ وہ اس طرح لدا پھندا آیا تھا کہ پھپھو کا ارادہ پھر ڈانواڈول ہو گیا۔ جمیلہ پھپھو کی جھڑپوں اور مرنے سے پہلے اباجی کی یاددہانی سے پھپھو قائل ہو گئی ہوئی تھیں لیکن شاکے نے پھر انہیں متزلزل کر دیا تھا۔۔۔۔ زیبی نے پھپھو سے جانے کیا کچھ کہا تھا کہ وہ پھر سے میری طرف مائل ہو گئی تھیں۔ میرے استفسار پر زیبی نے محجوب انداز میں صرف یہی کہا تھا "بس میں نے راضی کر لیا ہے۔"

میں نے زیبی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اف یہ لڑکی کس طرح میرے دل و دماغ پر چھائی تھی۔ اس سے بچھڑ کر جینے کا تو میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

امجد سوجی لے آیا۔

زیبی نے پوڑے بنائے۔ واقعی وہ بہت لذیذ پوڑے بناتی تھیں۔

ہم تینوں نے مل کر خوب کھائے۔

○ ☆ ○

شکیل نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر نکالا۔

"لو۔"

"یار شکیل بڑی لت ڈال دی ہے مجھے۔"

"کیسی۔"

"یہ سگریٹ نوشی کی۔"

"پاگل۔۔۔۔۔"

"سچی۔۔۔۔ میں اپنی آمدنی میں سے اتنے عمدہ برانڈ کا سگریٹ کہاں پی سکتا ہوں۔"

میں نے سگریٹ لے کر سلگایا شکیل نے بھی سگریٹ سلگا لیا۔

ہم دونوں شیزان میں بیٹھے تھے شکیل نے چائے کا آرڈر کیا تھا۔ بیرہ آرڈر لے کر چلا گیا تھا۔

شکیل نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی "کیسے جا رہا ہے کام۔"

"بس۔۔۔۔ نبھائے جا رہا ہوں۔"

"کہیں اور سے جواب نہیں آیا۔ دو تین جگہ اپلائے کیا تھا نا۔"

"ایک جگہ سے کال آئی۔"

"پھر"

"میں گیا ہی نہیں۔"

"کیوں۔"

"ان کی شرائط نامعقول تھیں۔"

اس نے دوبارہ سگریٹ کا کش لیا۔ بولا "کوشش کرتے رہو کہیں نہ کہیں تو بنے گا ہی کام۔"

"گزارہ تو چل رہا ہے لیکن۔۔۔۔"

میں چپ ہو گیا۔ وہ میرا منہ تکنے لگا

"لیکن......"

"لیکن میرے خواب بکھر گئے ہیں شکیل" میں نے چھوٹی موٹی ملازمت کا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا..... خدا بخشے اباجی نے تو میرے لئے بی اے کے بعد ہی اس جاب سے اچھی ملازمت ڈھونڈ لی تھی۔"

"ہوں۔"

"اس وقت دماغ عرش پر تھا نا۔ کلرکی کے نام پر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی" میں نے اک گہرے سانس لی۔

شکیل بولا "ویسے کلرکی کے لئے تم ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ نہیں ہو۔"

میں تلخی سے ہنس دیا۔

"تمہیں اچھی جاب ملنی چاہئے" وہ بولا۔

"چاہتا تو میں بھی ہوں۔ ویسے مایوس نہیں ہوں۔ اب میں نے حالات سے مقابلہ کرنا اور خوب سے خوب تر کے لئے جدوجہد کرنا سیکھ لیا ہے۔"

"شاباش اب تم ضرور اپنا مقام تلاش کر لوگے۔"

بیرا چائے لے آیا۔ سٹینڈ میں پیسٹری اور پلیٹ میں سموسے بھی تھے۔ میں نے دو پیالیوں میں چائے بنائی۔ ایک شکیل کے سامنے کھسکا دی دوسری اپنے سامنے رکھ لی۔

ہم گھونٹ گھونٹ چائے حلق سے اتارتے ہوئے باتیں کرنے لگے ہال میں کچھ میزوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ خالی تھیں۔ چائے کوک اور کافی چل رہی تھی۔

ہال کی فضا بڑی خوشگوار تھی۔ ائرکنڈیشنر چل رہا تھا حبس یا گرمی کا نشان بھی نہیں تھا..... ہلکا پھلکا میوزک بھی فضا کے حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔

باتوں باتوں میں رشتوں کا ذکر آ گیا۔ شکیل قمو کے رشتے کا پوچھنے لگا۔ "بس طے ہی سمجھو" میں نے کہا۔

"بہت اچھا کر گے" وہ بولا

"ہاں..... خوش بختی ہے..... وہ لوگ جہیز کے قطعاً خواہش مند نہیں ہے۔ ہمارے حالات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں....."

"چلو جیسے بھی ہو۔ ایک بڑی ذمہ داری اتر جائے گی۔ تمہارے سر سے۔"

"ہاں۔"

"تمہارا اپنا رشتہ بھی تو پکا ہو گیا۔"

"ہاں..... ہو تو گیا..... لیکن....."

"لیکن کیا....."

"سوچتا ہوں..... اتنی محدود آمدنی میں بھائی بہنوں کو سنبھالوں یا زیبی کو..... یہی فکر اب دن رات کھائے جاتی ہے۔"

"ہے تو مشکل ہی۔"

"بہت مشکل۔ خصوصاً اس لئے زیبی کے ابو کے مالی حالات ہم سے بہت بہتر ہیں۔"

"خدا کرے شادی ہونے تک تمہیں کوئی اچھی جاب مل جائے۔"

ہم نے کافی وقت وہیں گزارا..... شکیل نے بل دیا۔ ہم اس کے بعد بھی کچھ دیر وہیں بیٹھے رہے۔

پھر اٹھے

اور

ریسٹورانٹ سے باہر آ گئے۔

"ہیلو مس ڈوگر" شکیل نے گاڑی سے نکل کر ریسٹورانٹ کی طرف آنے والی اک لڑکی نماشے سے کہا۔

"ہیلو" وہ بولی

میں نے دیکھا۔ سوکھی دھواں کھائی سی لکڑی کی طرح اک لڑکی شکیل کے سامنے رک گئی تھی۔

"کیا حال ہے۔"

"ٹھیک۔ شکریہ۔"

"رحمان انکل۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"میرے دوست سراج" شکیل نے میرا تعارف کرایا۔

"ساجدہ ڈوگر" اس نے مجھ پر اک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ اف اس کی طرح اس کا نام بھی بے حد بھونڈا اور ثقیل سا تھا۔

چند رسمی سے جملوں کے بعد وہ آگے بڑھ گئی۔ میں تو کوئی بات ہی نہ کر سکا۔ صرف اسے تکتا رہ گیا تھا۔ کوئی لڑکی اتنی بدصورت اور کریہہ النظر بھی ہو سکتی تھی..... میں یہی سوچ رہا تھا۔

شکیل مجھے ساتھ لے کر گاڑی کی طرف آیا۔ وہ اندر جا چکی تھی۔

"یہی ہے نار رحمان ڈوگر کی بیٹی" شکیل مسکراتے ہوئے بولا۔

"اسے لڑکی کہا جا سکتا ہے" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

وہ ہنس کر بولا "بیچاری بے حد بدصورت ہے۔ اسی لئے تو باپ اسے کچھ زیادہ ہی پیار کر
ہے۔ بدصورتی کے دکھ کو اپنے پیار میں ڈبو رہا ہے۔"

"ہوں---- توبہ توبہ-----"

ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

شکیل ہنس کر بولا "اچھی جاب چاہتے ہو۔ تو اس سے دوستی کر لو-----"

"بکو نہیں۔"

"عشق تو نہیں کہہ رہا" شکیل بولا "راہ و رسم بڑھالو۔ اداکاری تو تمہیں کرنا آتی ہی ہے۔
بس ذرا سا مسکہ لگا دیا---- اور اپنا کام نکال لیا-----"

"اس بیہودہ مشورے کے لئے شکریہ۔"

شکیل نے کندھے اچکائے منہ بنایا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

"سنو" میں نے کہا

"ہاں۔"

"کل مجھے گاڑی چاہئے۔"

"لے جانا۔"

"صبح لے جاؤں گا۔ رات کو واپس کروں گا۔"

"کیا پروگرام ہے۔"

"رانی کو لینے گجرات جانا ہے۔"

"بخوشی بخوشی۔"

"شکریہ۔"

"اس تکلف سے باز نہیں آؤ گے۔"

"اس محبت کا شکریہ۔"

ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا

صبح ہی صبح میں گاڑی لے آیا۔ قمو اور زوبی تیار تھیں۔

"زیبی بھی جائے گی" میں نے کہا۔

"پھپھو سے پوچھ لیا" قمو بولی۔

"زیبی خود ہی پوچھے گی۔"

"پتہ کروں۔"

"ہاں۔"

قمو اور زوبی دونوں زیبی کو لینے گئیں---- میں شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے بال سنوارنے لگا۔ اپنا خوبصورت چہرہ دیکھ کر مجھے کل والی مس رحمان یاد آ گئی۔

حسن بھی اک دولت ہی ہے---- مجھے آج پہلی بار احساس ہوا میں اس سوکھی لکڑی نما لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔

وہ بے انتہا بدصورت تھی۔ جسم لکڑی کی طرح سوکھا ہوا۔ کوئی نشیب کوئی فراز کوئی کمان کوئی ڈھلان نہ تھی---- لڑکی سے زیادہ وہ مریل قسم کا لم سلما لڑکا لگتی تھی۔ اس کی رنگت گوری نہیں تھی۔ کالی بھی نہ تھی۔ چھپکلی کے پیٹ کا جو رنگ ہوتا ہے نا ویسی تھی---- ہونٹ بالکل باریک اور دہانہ بڑا سا تھا---- ناک پھیلی ہوئی تھی۔ چہرہ تکون سا تھا ماتھا تو بالکل تنگ تھا۔ آنکھیں جیسے گڑھوں میں اتری ہوئی تھیں چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی جو بدصورت ہی نہیں خوفناک بھی لگتی تھیں۔ اس کے بال بھی انتہائی بدزیب تھے۔ خشک اڑے اڑے اور بے ترتیب سے گو تراشیدہ تھے لیکن کوئی سٹائل نہیں تھا---- پھولے پھولے بال سوکھے سوکھے چہرے پر بہت بھدے لگ رہے تھے۔

اس کے ہاتھوں پر بھی میری نظر پڑی تھی۔ ذبح کی ہوئی مرغی کے پنجوں کی طرح لگ رہے تھے اس کے ہاتھ۔

میری نگاہوں میں زیبی کے ہاتھ گھوم گئے۔ سنہری لمبی لمبی انگلیوں والے نرم نرم ہاتھ---- کتنے خوبصورت تھے۔ جب وہ ناخنوں کو نیل پالش سے رنگ لیتی تھی۔ تو غضب ہی ڈھاتے تھے اس کے ہاتھ۔

قمو اور زوبی منہ لٹکائے اندر آ گئیں۔

"کیوں" میں نے بے تابی سے کنگھی پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"پھپھو نے اجازت نہیں دی" قمو نے برا سا منہ بنایا۔

میں بجھ گیا۔ جی چاہا گجرات جانے کا پروگرام ہی ملتوی کر دوں امی مٹھائی کا ڈبہ اٹھا لائیں۔

"یہ بھی رکھ لو" انہوں نے کہا "بہن کے گھر خالی ہاتھ جاؤ گے کیا-----"

میں نے بے دلی سے ڈبہ پکڑا۔

"اور کوئی پیغام" میں نے امی سے بے دلی سے ہی پوچھا۔

"بس دو چار دن کے لئے اجازت لے لینا تائی اماں سے رانی کے یہاں رہنے کے لئے"

"اچھا۔"

"سب کو سلام دعا کہنا۔ تایا جی کو بھی اور تائی اماں کو بھی اور ہاں شام سے پہلے پہلے آ جانا---- دیر نہ کرنا-----"

"اچھا۔ آؤ قمو۔ زوبی---- ویسے ای دیر ہو جائے تو فکر نہ کیجئے گا----"

میں ڈبہ لئے ڈیوڑھی کی طرف بڑھا---- قمو اور زوبی میرے پیچھے پیچھے آئیں۔ دونوں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ہنسی روکنے کی کوشش میں بھی تھیں۔

میں بیرونی دروازے کے قریب آیا تو زیبی پٹ کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ تینوں نے ملا جلا قہقہہ لگایا میں ان کی شرارت سمجھ گیا کھسیانہ سا ہو کر ہنسنے لگا۔

"شریر کہیں کی" میں نے زیبی کو نگاہوں سے نگل لینا چاہا۔ خوب بن ٹھن کر آئی تھی۔ نئے سرسراتے ریشمی کپڑوں میں تھی۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ کانوں میں سونے کی بالیاں بھی پہنی ہوئی تھیں۔

کتنی پیاری، کتنی پرکشش اور کتنی حسین لگ رہی تھیں وہ خوشبودار تو خود ہی تھی۔ خواہ مخواہ پرفیوم لگانے کا تکلف کیا ہوا تھا۔

"میں مامی جی کو سلام کر آؤں" زیبی اندر بھاگی۔

"جلدی آؤ ورنہ چھوڑ جاؤں گا" میں نے کہا۔

"ہائے ہائے بڑے آئے" اس نے ایک لمحہ کو رک کر میرا منہ چڑایا۔

ہم چاروں گاڑی میں بیٹھے---- اور گجرات روانہ ہو گئے۔

رانی کو لانے کا تو اک بہانہ تھا۔ یہ تو زیبی کا ساتھ پانے کی ایک خواہش تھی---- راستہ خوب گپ شپ میں کٹا۔

دو جگہ راستے میں گاڑی روک کر ہم باہر نکلے۔ موسم بڑا رنگین و حسین تھا۔ بادل منڈلاتے پھر رہے تھے اور دھلے دھلائے پودے سبز اور درخت ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ سے مستانہ وار جھوم رہے تھے۔ سورج بادلوں میں گم تھا۔ اسی لئے فضا میں تپش بالکل نہ تھی۔

میں نے سب کو دو جگہ کوک پلائی۔

جرنیلی سڑک کے کنارے جہاں گھنے درختوں کی قطاریں تھیں۔ میں نے گاڑی روکی زوبی اور قمو باہر نکلیں۔ زیبی بھی باہر آ گئی---- جانے قمو اور زوبی ہم دونوں کو تنہائی کا خود موقعہ دے رہی تھیں---- وہ دونوں درختوں تلے ذرا دور چلی گئیں۔

زیبی نے بھی جانا چاہا۔

میں نے کھنکار کر اسے نہ جانے کا اشارہ کیا۔

وہ مسکرا کر مجوب ادا سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی۔ زیبی کے سامنے میں پہلی بار سگریٹ سلگا رہا تھا۔

وہ آنکھیں پھیلاتے پھیلاتے بولی "تم سگریٹ پیتے ہو۔"

"ہاں۔"

"کب سے۔"

"کیوں۔"

"پہلے تو میں نے کبھی تمہیں پیتے نہیں دیکھا۔

"گھر میں نہیں پیتا----"

"باہر پیتے ہو۔"

"ہاں۔"

میں نے سگریٹ کا کش لیا۔ زیبی بڑے شوق سے مجھے تکنے لگی۔

"مرد سگریٹ نہ پئیں تو ادھورے لگتے ہیں" میں نے مذاق میں کہا۔

"ہاں" وہ بولی

میں حیران ہو کر بولا "تمہیں میرا سگریٹ پینا برا تو نہیں لگا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔ میں خوش ہو گیا۔ بڑی مستانہ ادا سے سگریٹ کے کش پہ کش لینے لگا۔

ایک دفعہ تو میں نے سگریٹ کا دھواں زیبی کی طرف اڑا دیا۔

"مجھے سگریٹ کی خوشبو اچھی لگتی ہے" وہ مسکرائی۔

"پہلے بتایا ہوتا۔ میں تمہارے سامنے سگریٹ پیا کرتا۔"

"ہوں---- گھر میں سگریٹ پی سکتے ہیں۔"

"تمہاری اجازت ہو گی تو پیا کروں گا۔"

"ہائے اللہ تم تو بس----"

میں نے دھواں پھر زیبی کی طرف اچھال دیا۔

قمو اور زوبی آہستہ آہستہ ہماری طرف آ رہی تھیں۔ زیبی بولی "قمو کو پتہ ہے کہ تم سگریٹ پیتے ہو۔"

"ہاں۔ امی کے سوا ان سب کو پتہ ہے۔"

ہم سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں مسرور انداز میں گنگناتے ہوئے گاڑی چلانے لگا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے رانی کے گھر کھایا۔ وہ ہمیں دیکھ دیکھ خوش ہو رہی تھی۔

تایا جی اور تائی جی سے رانی کو ساتھ لے جانے کی ہم نے اجازت لی فاضل بھائی بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے بھی بخوشی رانی کو ہمارے ساتھ آنے دیا۔

کھانا کھاتے ہی ہم وہاں سے روانہ ہونے پر مصر تھے۔

تایا جی نے اصرار کیا پچھلے پہر چلے جانا۔۔۔۔ تائی جی بھی بولیں "گرمیوں کے دن کافی لمبے ہوتے ہیں۔ چار بجے چائے پی کر جانا۔"

قمو اور زیبی نے بھی دو گھنٹے اور رکنے پر اصرار کیا لیکن میں نے بہانہ بنایا "شام کو مجھے ڈرائیو کرنا نہیں آتا۔"

ہم اڑھائی بجے کے قریب رانی کو لے کر گجرات سے نکلے۔

"اتنی جلدی کاہے کی تھی" رانی نے پوچھا۔

زیبی منہ بنا کر بولی "میں تو صبو سے گپ شپ لگانے آئی تھی۔ آرام سے بیٹھنے بھی نہیں دیا۔"

"واقعی بھائی جان دو گھنٹے کا راستہ ہے" قمو بولی۔

"تم سب ایک دم بے وقوف ہو" میں نے ہنس کر کہا۔

"دنیا بھر سے عقلمند تم ہی تو ہو" رانی نے پیار سے میری طرف دیکھا۔

"ابھی پتہ چل جائے گا سب کو" میں نے بڑی شان سے کہا۔

"ہونہہ" زیبی بڑے حسین انداز سے پھنکاری۔۔۔۔ اس کا منہ کپا ہو رہا تھا۔

میں مست ہو کر گاڑی چلاتا چلا گیا۔

گوجرانوالہ پہنچ کر میں نے گاڑی کوک کے لئے روکی۔ اس وقت دھوپ نکل آئی تھی لیکن موسم میں تپش نہیں تھی۔

میں نے سگریٹ کی ڈبیہ بھی خریدی۔ پان بھی لئے آج عیاشی کروانے کا موڈ تھا۔

قمو اور زیبی کا موڈ خوشگوار نہیں تھا۔ دونوں پچھلی سیٹ پر شکلیں بنائے بیٹھی تھیں۔

"اب کیا خیال ہے" میں نے ان سے پوچھا۔

"کوک کے پیسے دو اور گاڑی میں آؤ" رانی بولی گرمی لگ رہی ہے۔

"ایئر کنڈیشنڈ سینما میں نہ جا گھسیں" میں نے شوخی سے کہا "بڑی اچھی پکچر لگی ہے"

"ہائے سچ" قمو اور زیبی کا موڈ ایک دم ٹھیک ہو گیا کنارے لگی بیٹھی زوبی بھی چہکی۔

رانی میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر تھی جلدی سے بولی "پاگل ہوئے ہو۔۔۔۔ شام یہیں ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا۔ پکچر تو دیکھ لیں گے۔"

"شام کو ڈرائیو کیسے کرو گے۔"

"کیوں۔"

"تم جو کہہ رہے تھے تایا جی سے۔"

"فاضل کی رانی۔۔۔۔ بڑی بھولی ہو۔ میں اسی لئے تو تم سب کو اڑا لایا جلدی۔ فلم دکھانا تھی۔ بہانہ نہ بناتا۔۔۔۔ تو اس دوپہر میں آنے کون دیتا۔۔۔۔"

"گھر پہ امی۔۔۔۔"

"وہ چھوڑو مجھ پر۔ کسی کو کیا پتہ چلے گا۔ امی کو بعد میں بتا دیں گے۔"

قمو اور زیبی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ پکچر بڑی رومانٹک تھی۔ میں دیکھ چکا تھا۔ اب زیبی کے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔ شاید اس طرح میں اپنے جذبات زیبی تک پہنچانے کی لاشعوری کوشش کر رہا تھا۔

میں اس کوشش میں کامیاب ہی رہا۔ پکچر کے دوران زیبی بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔

پکچر خوب انجوائے کی۔ ہم سب خوب خوش تھے۔ ایک عرصے بعد اس طرح تفریح کر رہے تھے۔ ننھی منھی خوشیاں سمیٹ رہے تھے ماضی اور مستقبل سے بے خبر ہو کر حال اور صرف حال میں جی رہے تھے۔

حال

جو

اس

وقت خوشحال تھا۔

میں نے فلم کے دوران بھی کوک منگوائی۔ زیبی نے احتجاج کیا "نہ بھئی آج تو کوک پی پی کر برا حال ہو گیا۔"

"کیا یاد کرو گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا" میں نے شوخ ہوتے ہوئے کہا۔

"جب پالا پڑے گا تو یاد ہی کرے گی" رانی نے ہنس کر ذو معنی بات کی۔

اک لحہ کو میرے دل کو دھچکا سا لگا کیا میں زیبی کو اتنی خوشیاں دے سکوں گا۔؟

میرے دل میں یہ سوال کروٹیں لینے لگا۔

لیکن

میں جلدی سنبھل گیا۔

آنے والے وقت کو کس نے دیکھا ہے۔ خدا جانے کیسا ہو' جیسا ہو گا نپٹ لیں گے۔

ہم کوئی نو بجے کے قریب گھر پہنچ گئے۔ امی نیچے صحن میں بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ زیبی کے ابا جی بھی آئے بیٹھے تھے۔

قمو رخصت ہو کر اپنے گھر جا رہی تھی۔ اس کی شادی رانی کی شادی کی طرح دھوم دھام سے تو نہ ہو سکی تھی پھر بھی امی نے جہیز کی صورت میں کافی کچھ اکٹھا کیا ہوا تھا---- زمین بکنے سے جو رقم ملی تھی کچھ اباجی کے دسویں چالیسویں اور آئے گئے کی خاطر مدارت پر خرچ ہوئی تھی جو بچی تھی اس سے امی نے قمو کو بیاہ دیا۔

قمو کے سسرال والے بڑی دھوم دھام سے بڑی شان سے آئے تھے۔

زیور اور کپڑے جو چڑھاوے میں آئے تھے۔ بے حد خوبصورت تھے۔ لوگ قمو کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

امی سب مہمانوں کو یہی تاثر دے رہی تھیں کہ چونکہ اباجی کو فوت ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لئے دھوم دھڑکا نہیں کر سکے۔ مالی حالات کو وہ بڑی خوبصورتی سے اس پردے میں چھپا رہی تھیں۔

ویسے اباجی کی کمی محسوس تو ہو رہی تھی۔ قمو تو کئی دنوں سے رو رو کر نڈھال ہو گئی تھی۔

امی کے آنسو تو کبھی سوکھے ہی نہ تھے۔ بات بے بات روتی رہتی تھیں۔ جیون ساتھی بچھڑ گیا تھا۔ ان کا دکھ اپنا ہی تھا۔

میں بھی بہت زود رنج تھا۔ لیکن اب دل پتھرا گیا تھا۔ عورتوں کی طرح اب آنسو نہیں بہتے تھے۔ دل خون خون ہو جاتا۔ جب بھی میری آنکھیں خشک و ویران رہتیں۔ شاید اب گھر میں میری پوزیشن چونکہ سربراہ کی تھی اس لئے حوصلہ تومند ہو گیا تھا۔

وقت رخصت قمو مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اس کے ماتھے پر شفقت سے بوسہ دیا۔ بالکل اسی طرح---- جس طرح اباجی نے رانی کو گھر سے رخصت کرتے وقت دیا تھا۔ قمو کی چیخیں نکل گئیں۔ رانی زوبی اور امی تو کیا جتنے مہمان تھے سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

تکلیف و اذیت تو تھی ہی۔ بیٹی بابل کے دروازے سے جا رہی تھی بابل نہیں تھا۔ بابل کی شفقتوں اور چاہتوں سے محروم رہ کر بابل کی دہلیز چھوڑنا یقیناً آسان کام نہیں تھا۔

میرا دل لہو لہو تھا۔ لیکن میں قمو کو دلاسہ دے رہا تھا۔

خاندان کی عورتیں بھی اسے چمکا رہی تھیں---- پھپھو جمیلہ نے قمو کو بے حد پیار کرتے ہوئے کہا "خدا کا شکر کرو قمو---- باپ نہیں تو بھائی ہے اس کی زندگی مانگو---- بڑا بھائی باپ ہی ہوتا ہے--"

"ہمارا بھائی لاکھوں میں ایک ہے قمو" رانی نے کہا "ہمیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا---- آئندہ بھی نہ ہونے دے گا۔"

رانی خود بھی روئے جا رہی تھی---- اور قمو کو بھی تسلی دے رہی تھی۔

امی تو صحن میں بچھی کرسی پر نڈھال سی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے تو رانی کی شادی پر رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ اب تو پوزیشن ہی اور تھی۔

قمو رخصت ہو گئی۔

ہمارے سر سے ایک بڑی ذمہ داری اتر گئی۔

اب مسئلہ میرا تھا۔

قمو کے ولیمے سے واپس آئے تو فہمیدہ پھپھو نے امی کو سنانے کے لئے شاہد کے رشتہ کی بات چھیڑ دی۔

رانی میز کے قریب کھڑی بھاری دوپٹہ تہہ کرنے کے بعد گلے سے بڑا سا ہار اتار کر ڈبے میں رکھ رہی تھی---- پھپھو کی باتیں سن کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا۔

میں چپ ہو گیا۔ تھکا ہوا تھا۔ چارپائی پر لیٹ گیا۔

امی بولیں "فہمیدہ خدا مبارک کرے۔ شاہد کا رشتہ بہت اچھی جگہ ہوا ہے۔ شادی کب تک کرو گی۔"

"زہی کا نپٹا لوں دونوں کا اکٹھا ہی کرنے کا ارادہ ہے" وہ بولیں۔

"منگنی کرنے کا ارادہ ہے پھپھو----" رانی نے پوچھا۔

"کس کی" فہمیدہ پھپھو بولیں

"زہی کی" رانی نے کہا۔

"یہ تو تم لوگوں کو پتہ ہو۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں----" وہ بولیں مجھے ان کے لہجے میں طنز کی چبھن سی محسوس ہوئی۔

"گھر کی بات تھی" امی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی احساس جرم سے کٹا جا رہا ہو۔

"پھر بھی امی----" رانی نے تیزی دکھائی "نشانی تو ہونی چاہئے۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں کیا اعتراض ہے" رانی بولی۔

فہمیدہ پھپھو چند لمحے چپ رہیں۔ پھر بولیں "بڑی بات یہ ہے کہ نشانی ہو جانے سے لوگوں کے منہ بند ہو جاتے ہیں۔ اب تو کوئی ادھر سے رشتہ پوچھتا ہے کوئی ادھر سے----- جان کھا رہے ہیں لوگ۔"

امی نے بڑے تحمل سے کہا "ٹھیک کہتی ہو فہمیدہ----- جہاں جوان بیٹی ہو گی۔ لوگ پوچھیں گے ہی پھر زیبی جیسی لڑکی----- ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔"

فہمیدہ پھپھو تعریف سے خوش ہو گئیں۔ ہنستے ہوئے بولی۔ "اللہ کی کرم نوازی ہے بہن۔ خدا نصیب اچھے کرے۔"

"آمین" امی اور رانی نے کہا۔

پھپھو کی بات میرے دل میں چبھ گئی۔ یوں لگا انہوں نے تمسخر سے کہا ہے "خدا نصیب اچھے کرے" کہہ کر جتلایا ہے کہ نصیب اچھے ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

جانے کیوں میں ان دنوں بے حد حساس ہو رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات دل میں تیر کی طرح لگنے لگتی۔

شاید میں سنجیدگی سے اپنے مالی حالات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اتنی محدود تنخواہ میں گزر بسر بمشکل ہوتا تھی۔ لاشعوری طور پر زیبی کے ساتھ شادی کرنا زیادتی کے مترادف لگتا تھا۔

امی کے پاس دو تین زیوروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پیسہ خرچ ہو چکا تھا اب سوائے اس گھر کے جس کی چھتوں تلے ہمیں پناہ ملتی تھی اور جائیداد تھی نہ زمین۔

کبھی کبھی میں فہمیدہ پھپھو کے بارے میں سوچتا تو وہ حق بجانب نظر آتیں ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ نازوں پلی۔ ان کے پاس دولت فراوان نہ تھی پھر بھی اتنی تھی کہ آسودگی سے رہ رہے تھے اور اپنی بیٹی کی ہر فرمائش پوری کر سکتے تھے۔

میرے پاس کیا تھا۔

میں زیبی کو اتنی تنخواہ میں کیونکر خوش رکھ سکوں گا جبکہ زوبی مجو ناجے اور امی کا بار بھی مجھے ہی اٹھانا تھا۔

چائے پی کر فہمیدہ پھپھو چلی گئیں۔ نشانی کرنے کی بات پکی کر گئیں۔ ان کے جانے کے بعد امی اور رانی آپس میں باتیں کرنے لگیں۔

"پھپھو بھی سچی ہیں۔ نشانی کر لینے میں کیا ہرج ہے" رانی بولی۔

"کوئی نہیں-----"

"ایک انگوٹھی اور دو جوڑے۔ ساتھ مٹھائی-----"

"ہاں۔"

"لمبی چوڑی منگنی نہیں کریں گے۔ نشانی کر دیتے ہیں۔ واقعی لوگوں کو پتہ چل جائے گا تو رشتہ پوچھنا چھوڑ دیں گے ہمیں پھپھو کی پوزیشن کا احساس ہونا چاہئے۔"

"ہوں" امی اٹھ کر باہر صحن میں چلی گئیں۔

"کیوں راجے" رانی میرے پاس آ بیٹھی۔ میں چائے پی کر پیالی ابھی ہاتھ ہی میں پکڑے تھا۔

میں نے خالی پیالی خالی خالی نظروں سے رانی کو دیکھتے ہوئے واپس پکڑا دی۔

"بولو نا" رانی چہکی۔

"کیا بولوں۔"

"انگوٹھی پہنا دیں زیبی کو۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔

"کیا بات ہے راجو----- خوش نہیں ہوا----- تیری بات پکی اور بالکل پکی ہو رہی ہے۔"

"ہاں" میں نے اک انگڑائی لی۔

رانی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی ناک پکڑ کر ہولے سے مروڑتے ہوئے ہنس کر کہا "جائے رفتن نہ پائے ماندن۔"

"کیوں" اس نے ناک چھڑا کر ناک ہاتھ سے ملتے ہوئے پوچھا۔

"رانی میں بہت غریب ہوں" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہو تو-----"

"پھر۔"

"پھر کیا غریب لوگوں کی بات پکی نہیں ہوتی۔"

"ہوتی ہے۔"

"پھر ڈر کاہے کا۔"

"یہی حالات رہے تو ڈر ہی ڈر رہے گا۔"

"پاگل ہو۔"

"یقیناً۔"

"دیکھو راجو۔"

"ہوں۔"

"واقعی تمہاری آمدنی اتنی نہیں کہ بہن بھائیوں کو بھی پالو اور اپنا گھر بھی بساؤ۔"

"اب سمجھیں-----"

"لیکن----- پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمت ہارنے سے تو کچھ نہیں بنے گا۔
"خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھو۔"
"تلاش ہی تلاش ہے خوب تر کی۔"
رانی سمجھ دار تھی۔ چپ ہو گئی----- پھر اچانک بولی "تم باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔"
"کہاں۔"
"دوبئی' کویت یا مڈل ایسٹ کے کسی بھی ملک میں۔ بھاری تعداد میں لوگ جا رہے ہیں۔"
"میرے ہاتھ میں ڈگری ہے۔ کوئی ہنر نہیں اور ان ملکوں میں ہنرمندوں کی مانگ ہے۔ مجھ ایسے پڑھے لکھے وہاں جا کر کلرکی ہی کرتے ہیں یا مزدوری کرتے ہیں۔"
"کیوں۔ کوئی نہ کوئی جاب مل ہی سکتی ہے؟"
"اوں ہوں۔ وہاں جو بے ہنر لوگوں کی درگت بنتی ہے نا تم نہیں جانتیں ہاں یہاں سے کوئی بھرتی کر کے لے جائے تو بات اور ہے۔"
"کوشش کرتے رہو۔"
"تم نہیں جانتی کیا کیا کرتا رہتا ہوں۔"
"چلو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ نشانی ہو جائے گی۔ شادی تو سال ڈیڑھ سال سے پہلے پھپھو بھی نہیں کریں گی۔ ان کی عادت جانتے ہو نا۔ دنیا بھر کی چیزیں اکٹھی کریں گی زیبی کے لئے۔"

"مجھے اپنی فکر ہے۔"
"بس بھی کرو۔ کچھ دیر تو خوش ہو لینے دیا کرو۔"
پھر اس نے باتوں کا رخ پھیر دیا۔ قمو کے سسرال والوں کی باتیں کرنے لگی۔ قمو کی خوش بختی کے تذکرے کرتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔ اس نے باتوں میں لگا کر مجھے میرے مسائل سے کچھ دیر کے لئے ضرور الگ کر لیا۔

○ ☆ ○

"تمبولا میں نے کبھی کھیلا ہی نہیں۔"
"آج کھیلنا لطف آئے گا۔"
"تم جانے سے پہلے میرا بیڑہ غرق پوری طرح کرنا چاہتے ہو۔"
"دنیا میں آئے ہو تو زندہ رہنا سیکھو۔"
"تمبولا کھیل کر۔"
"تمبولا تفریحاً کھیلتے ہیں کلب میں۔ کچھ دیر تو اپنے مسائل سے چھٹکارا پا لو گے۔ میری مانو تو کلب کے باقاعدہ ممبر بن جاؤ۔"
"ٹھیک کہتے ہو۔"
"غلط بھی نہیں۔ لوگوں سے ملتے جلتے رہو گے۔ شاید تمہاری معمولی جاب کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔"
"کیسے۔"
"بھئی لوگوں سے ملتے جلتے رہو شاید کوئی سبیل بن جائے۔"
"چلو بیٹھو اور لے چلو جہاں لے جانا ہے۔"
"کلب۔"
"کلب سہی۔"
میں اور شکیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی میں نے ڈرائیو کی ہم دونوں مختلف سڑکوں سے ہوتے کلب کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ احاطے میں کافی گاڑیاں کھڑی تھیں----- میں نے گاڑی بیرونی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔
"ٹھیک" میں نے پوچھا۔
"ٹھیک ہے۔ آؤ-----" شکیل نے کہا۔ "آج کافی لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ہال میں جگہ ملتی بھی ہے یا نہیں۔"
"نہ ملی تو واپس آ جائیں گے۔"

"نہیں بھئی تمبولا ضرور کھیلنا ہے۔۔"

"خدا نے کہا ہے۔"

"یہی سمجھو---- بھئی راج اب ہم پاکستان کے مہمان ہیں۔ مہینے ڈیڑھ تک جانے والے ہیں اس لئے ان مخصوص جگہوں سے لپٹ لپٹ کر مل لینے دو۔"

"ویزا لگ گیا۔"

"ہاں۔"

"واقعی۔"

"سچ۔"

"کب تک جاؤ گے۔"

"میں اگلے ماہ کے آخر تک جاؤں گا۔"

"اور ممی۔"

"وہ ایک ماہ بعد---- دراصل کوٹھی اور سامان کا مسئلہ ہے ہو سکتا ہے ریتا ہی شفٹ کر لے ادھر-----"

"ہوں۔ تو تم لوگ ہمیشہ کے لئے وطن چھوڑ رہے ہو۔"

"فی الحال تو یہی بات ہے۔"

"کیسا لگ رہا ہے۔"

"بہت برا۔"

"سچی۔"

"ہاں راج۔ اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہ ممی ڈیڈی کو جانے کیا سوجھی بوریا بستر گول کر لیا---- اچھا بھلا بزنس تھا---- سب وائنڈ اپ کر کے چل دیئے-----"

"تمہارا دل نہیں تھا۔ تو ڈیڈی سے کہہ دیتے۔"

"بس اس وقت میں بھی جذباتی ہو گیا تھا---- میری ڈرلی بھی تو وہاں ہے نا بس یہی کشش ہے ورنہ-----"

"ورنہ یہاں سہیلیاں بہت تھیں۔"

"شکیل نے قہقہہ لگایا---- اچھا خاصہ فلرٹ تھا۔ لڑکیاں بھی جانے کس شے کی بنی تھیں---- ہنسی اور پھنسی والی بات تھی۔ ویسے بھی میٹھے پر مکھیاں آتی ہیں۔ شکیل کی مالی حالت سب سے بڑی ایٹریکشن تھی۔

ہم دونوں باتیں کرتے اندر گئے۔ ہال واقعی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں چند

کرسیاں خالی تھیں---- شکیل خود ٹکٹ لے آیا۔ پرچیاں ہاتھ میں لئے وہ مجھے لے کر خالی کرسیوں کی طرف بڑھا۔

میں نے ہال پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی۔

عورتیں اور مرد جیسے تمبولے کے لئے دیوانے ہوئے جا رہے تھے فیشن ایبل عورتیں اور مردوں کا اجتماع تھا۔ ہاتھوں میں پرچیاں اور مارکر پکڑے وہ کھیل کھیلنے کے لئے تیار تھے۔

میں دلچسپی سے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ گیم شروع ہو گئی۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ صرف نمبر بولنے والے کی آواز گونج رہی تھی لیکن جب راؤنڈ اپ ہوا تو ہال میں شور مچ گیا۔ میں حیران تھا یہ امیر کبیر لوگ بیس بیس اور پچاس روپے کا انعام جیت کر یوں خوش ہو رہے تھے---- جیسے دنیا جیت لی ہو۔

کھیل ختم ہوا۔ لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ آج کلب میں پکچر بھی دکھائی جانے والی تھی کچھ لوگ پکچر دیکھنے کے لئے دوسرے ہال کی طرف بڑھے۔

میں نے شکیل سے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے۔"

"پکچر دیکھیں گے"

"نہیں بھئی۔"

"کیوں؟ بہت اچھی پکچر ہے۔"

"میں واپس جاؤں گا۔"

"اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔"

"تم پکچر دیکھو میں چلتا ہوں۔"

"ہیلو شکیل" حماد شکیل سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ پھر دو تین اور مردوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ احوال پرسی کی۔ ممی ڈیڈی کا پوچھا۔ مسز کاشف بھی اس سے ملیں۔

میں نے بھی کسی سے ہاتھ ملایا۔ کسی کو سلام کیا۔ شکیل کے توسط سے تعارف ہو رہا تھا۔

"پکچر دیکھ رہے ہو نا۔ بڑی اچھی ہے" مسز کاشف نے اپنی خوبصورت ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے شکیل سے کہا۔

"ضرور دیکھوں گا" شکیل بولا۔

"آؤ پھر-----"

"ابھی آتا ہوں۔"

"شکیل" میں نے کہا۔

"ہاں۔"

"میں جاتا ہوں۔ تم پکچر دیکھو۔"
"جانا بہت ضروری ہے۔"
"ہاں۔"
"جاؤ گے کیسے؟"
"چلا جاؤں گا۔"
"اس وقت تمہیں کوئی سواری ملے گی۔ مال پر....."
"کوئی بات نہیں۔ کچھ پیدل چل لوں گا۔ کہیں تو ملے گی۔"
شکیل نے پھر اصرار کیا۔ "پکچر دیکھ کر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔"
لیکن
میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ گھر میں ان دنوں خوب رونق تھی۔ رانی اور قمو دونوں آئی ہوئی تھیں..... نشانی کرتا تھی۔ خوشی میں اور لڑکیاں بالیاں رات کو ڈھولک بجاتی تھیں۔ گانے گاتی۔ ڈانس کرتی..... ہلا گلا ہوتی تھی میں بھی اس میں شامل ہوتا اور کسی کسی دن تو قمو زیبی کو بھی لے آتی۔ گھر کا معاملہ تھا نا۔
آج بھی زیبی نے آنا تھا۔ میں اسی لئے گھر جانے کے لے بضد تھا۔
"تو یوں کرو" شکیل نے جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر کہا "گاڑی لے جاؤ۔"
میں نے اس کی طرف دیکھا "تم کیسے جاؤ گے۔"
"لفٹ لے لوں گا کسی سے۔"
"لفٹ میں ہی کیوں نہ لے لوں۔"
"چلو ٹھیک ہے۔"
"ہم دونوں باہر آ گئے۔ کچھ لوگ واپس جا رہے تھے شکیل ان میں مانوس چہرے تلاش کرنے لگا۔
"وہ..... وہ" شکیل بولا۔
"کون۔"
"وہ مس ڈوگر۔"
"مس ڈوگر۔"
"وہی یار..... رحمان کی بیٹی..... چلو آج تمہیں اس سے ٹکرا ہی دیں۔"
میں احتجاج کرتا ہی رہ گیا۔ شکیل آگے بڑھا..... وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔
"ہیلو مس ڈوگر" شکیل نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا۔

"ہیلو....." وہ سٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر سیٹ پر بیٹھ گئی میں بھی اب شکیل کے قریب آ گیا۔
مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا تھا مس ڈوگر سے لفٹ لینا لیکن پھر سوچا "اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے مضائقہ ہی کیا ہے۔"
بڑے طبقے کی ایسی چھوٹی چھوٹی بے تکلفیوں سے تو اب میں بھی خوب واقف ہو گیا تھا۔
"مس ڈوگر۔ پلیز ایک کام کریں۔"
"جی۔"
"یہ میرے دوست راج ہیں۔"
اس نے میری طرف دیکھا۔ اندر کو دھنسی آنکھیں پہچان سے چمکیں وہ بولی "انہیں شاید میں پہلے بھی مل چکی ہوں۔"
میں نے محسوس کیا۔ اس کی شکل کی طرح اس کی آواز بھی بڑی بھدی بڑی بھونڈی تھی۔ نغمگی نام کی کوئی چیز نہ تھی اس کی آواز میں۔
"انہیں لفٹ دے سکتی ہیں آپ" شکیل نے کہا۔ مجھے اس کے جملے پر ہنسی آ گئی۔ مس ڈوگر نے میری طرف حیرانگی سے دیکھا۔
بغیر اک لفظ کہے اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔
"تھینک یو" شکیل نے کہا اور مجھے دھکیل کر سیٹ پر بٹھاتے ہوئے سرگوشی میں شوخی سے بولا "لو زینے تک تمہیں پہنچا دیا ہے۔"
میں نے قہر بھری نظر شکیل پر ڈالی وہ مسکراتے ہوئے قدرے پرے ہٹ گیا۔
مس ڈوگر نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ میں نے دروازہ بند کر کے سیٹ پر ٹھیک طرح سے بیٹھتے ہوئے شکیل کو ہاتھ ہلایا۔ وہ شوخی و شرارت سے مسکرا رہا تھا۔
مس ڈوگر خاموشی سے گاڑی کلب کے احاطے سے نکال کر سڑک پر لے آئی۔
"معاف کیجئے گا مس ڈوگر" میں نے گلا ہلکے سے کھنکار کر صاف کیا۔ "آپ کو ناحق زحمت دی۔"
"کوئی بات نہیں" اس نے بے تکلفی سے بے تعلق سا جملہ کہا۔
میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ حسب معمول بے حد بدصورت لگ رہی تھی۔ اس نے آج ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سلکی ساڑھی خوبصورت تھی۔ جو اس کے بدصورت جسم پر لپٹی ہوئی تھی..... میری نظر سٹیرنگ پر رکھے اس کے ہاتھوں پر پڑی۔ ذبح کی ہوئی مرغی کے پنجے..... مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے دھیمی دھیمی بے حد پیاری پرفیوم سپرے کی ہوئی تھی لیکن اس کے وجود کی بدصورتی کے احساس میں خوشبو بھی بے رنگ و بو محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ نے جانا کہاں ہے" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا

"جانا تو شہر ہے۔ لیکن آپ براہ مہربانی مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دیں جہاں رکشا وغیرہ مل جائے۔۔"

"لبرٹی۔"

"وہیں سہی۔ آپ نے ادھر ہی جانا ہے۔"

"جی۔"

"شکریہ۔ وہیں ڈراپ کر دیں۔"

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتی لیکن شہر کی ٹریفک میں میں گاڑی نہیں چلا سکتی۔۔"

اس نے تکلفاً کہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا "آپ کی اتنی ہی عنایت کافی ہے مس ڈوگر---- ورنہ مجھے جانے کتنا پیدل چلنا پڑتا۔

"آپ کلب کے ممبر ہیں۔"

"نہیں۔ شکیل کھینچ لاتا ہے۔۔"

"ہوں۔"

"آپ تو ہوں گی ممبر۔"

"بس کبھی کبھی تمبولا کھیلنے آ جاتی ہوں۔"

"مجھے بھی صرف تمبولا کھیلنے میں دلچسپی ہے" جانے کیوں اور کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ صرف یہی نہیں نکلا۔ میں نے تو یہ بھی کہا "میں کلب کا مستقل ممبر بن رہا ہوں صرف تمبولا کے لئے۔"

وہ بھونڈے پن سے مسکرائی۔

مجھے جانے کیا ہو رہا تھا میرے اندر کا کون ساخفتہ جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ میں کیوں اس سے بے تکلف ہو رہا تھا۔

مسکراتے ہوئے بولا "ایک بات ہے۔"

"کیا۔"

"تمبولے کے بعد میں پکچر نہیں دیکھا کروں گا۔"

"مجھے بھی پسند نہیں۔"

"پھر---- آپ کو لفٹ دینے کی زحمت ضرور دیا کروں گا۔ میرے پاس گاڑی نہیں ہے اور شکیل پکچر دیکھے بنا ہلتا نہیں ہے۔"

"ضرور-----" وہ پھر بھونڈے پن سے مسکرائی۔

ہم چپ ہو گئے۔ گاڑی گلبرگ کے ایریا میں داخل ہو گئی۔ وہ خاموش سے گاڑی چلا رہی تھی۔

راستے میں دو ایک خالی رکشے گزرے۔ ایک خالی ٹیکسی بھی نظر آئی۔ لیکن میں نے کسی کو ہاتھ نہیں دیا جانے کیوں جم کر مس ڈوگر کے ساتھ بیٹھا رہا۔ شکیل کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"زینہ۔" میں نے دل ہی دل میں یہ لفظ دہرایا۔

"واقعی" اندر سے آواز آئی۔

"ہرج کیا ہے۔" ایک گونج اندر ہی اندر پھیل گئی۔

لبرٹی تک ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ میرے اندر تو بہت کچھ ہو رہا تھا۔ کئی پلین بن رہے تھے۔ زینے پر قدم رکھنے کی سوچ زور پکڑ رہی تھی میں نہیں جانتا مس ڈوگر کے اندر کیا ہو رہا تھا۔

بظاہر وہ پرسکون اور پراعتماد طریق سے گاڑی چلا رہی تھی۔

لبرٹی کے سرے پر جہاں کافی رکشے کھڑے تھے اس نے گاڑی روک دی-----

میں نے گاڑی سے نکلتے ہوئے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا "معذرت خواہ ہوں۔ آپ کو زحمت دی۔"

وہ مسکرائی۔ اس کا دہانہ جیسے کانوں تک پھیل گیا۔ اف کس قدر خوفناک مسکراہٹ تھی۔

"شکریہ" میں باہر نکلتے ہوئے بولا۔

اس نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

"خدا حافظ" وہ آہستگی سے بولی۔

"اگلے ہفتے شاید پھر زحمت دوں" میں نے گاڑی کی کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں" اس نے بے تکلفی سے کہا اور گاڑی نکال کر لے گئی۔ میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔

پچھتاوا آیا کہ میں نے کیوں اس سے ایسی بات کہی۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا اس سے اس انداز میں باتیں کرنے کا۔

میں نے رکشا لیا اور گھر کا پتہ بتا کر پیسے طے کئے۔ کم بخت رکشے والے دور کے علاقوں میں اس وقت بغیر پیسے طے کئے جاتے ہی نہیں۔

راستے میں بھی دل ہی دل میں پچھتاتا رہا۔

گھر آیا۔

تو خوب کھپ مچی تھی۔ ڈھولک زوروں سے پیٹی جا رہی تھی لڑکیاں بالیاں ہنسی مذاق کر رہی تھیں اور فلمی گانے اپنی طرز میں گا رہی تھیں۔

○ ☆ ○

رانی اور قمو اور کچھ لڑکیاں دالان میں بیٹھی شگن کے لئے لے جائی جانے والی چیزیں درست کر رہی تھیں۔ امی نے سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا خوبصورت سا جڑاؤ سیٹ زہی کے لئے رانی کو نکال کر دیا۔

دوسری لڑکیاں اور عورتیں ڈبے پر جھپٹ پڑیں۔

"ہائے اللہ کتنا پیارا ہے۔" صائمہ بولی۔

"ہائے نہیں کہتے" پھپھو جمیلہ نے اپنی بیٹی کو ٹوکا۔

"بہت پیارا ہے" چچی رحیمہ نے ڈبہ لے کر سیٹ دیکھا۔ "خدا مبارک کرے۔"

"آمین" امی نے کہا۔

صحن میں کچھ عورتیں آگئی تھیں امی رانی کو چابیاں پکڑا کر باہر چلی گئیں۔

"کیا ہو رہا ہے" میں شوق سے زہی کے کپڑے دیکھنے لگا۔ جو قمو پھیلائے بیٹھی ٹانک رہی تھی۔

پانچ جوڑے اور دو ساڑھیاں جھلملا رہی تھیں۔

"اتنی چیزیں منگنی پر ہی" میں نے اپنی مسرتیں دباتے ہوئے پوچھا۔

"ماشاء اللہ -----" رانی بولی۔

"امی نے خوب مال چھپا کر رکھا ہوا ہے" میں ہنسا۔

"تمہارے ہی کام آیا ہے نا----- دھوم دھام سے منگنی ہو رہی ہے جناب کی" قمو جوڑا ٹانکتے ہوئے بولی۔

"اللہ مبارک کرے۔" جمیلہ پھپھو ہنسی "یہ سب میرا کیا دھرا ہے راجو بھول نہ جانا۔"

"کیسے بھول سکتا ہوں۔ اپنی پیاری پیاری پھپھو کا احسان" میں جمیلہ پھپھو کے قریب دری پر بیٹھتے ہوئے ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولا۔

"جوڑا لوں گی تجھ سے" وہ مجھے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"ساڑھی لا دوں گا" میں نے کہا رانی قمو صائمہ اور دوسری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

موٹی تازی جمیلہ پھپھو نے کب کبھی ساڑھی پہنی تھی۔

ہنسی مذاق ہونے لگا۔ میری بہنیں' میری پھوپھیاں اور میری ماں بے حد خوش تھیں۔ خوش میں بھی تھا میری تو خوشیوں کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ زیبی مجھے مل گئی تھی----- اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

قمو نے جوڑا ٹانک کر دونوں ہاتھوں پر اٹھایا "لو جی دیکھ لو۔ کس مہارت سے ٹانکا ہے میں نے۔"

"واقعی۔ ماہر ہو اس کام میں" رانی نے داد دی۔

"میری کاریگری بھی تو دیکھو" جمیلہ پھپھو نے ساڑھی دکھائی۔ یہ بہت قیمتی ساڑھی تھی۔ شکیل نے خریدی تھی۔ میں باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

لیکن وہ نہیں مانا۔ میرے لئے ٹراپیکل سوٹ تھا۔ اسی نے خریدا تھا۔ خلوص اور محبت سے دیئے گئے تحائف واپس بھی تو نہیں کئے جا سکتے تھے۔

"آپ کی کاریگری کیا ہوئی" میں نے پھپھو سے کہا "ساڑھی اتنی خوبصورت ہے کہ بس-----"

"جناب میرے ہاتھوں کا کمال ہے" پھپھو نے ہاتھ میں پکڑی سوئی کا سرا میرے گال سے چھوا۔

میں نے گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھپھو کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

آپ کے اس قدر صحت مند ہونے کی وجہ اب سمجھ آئی ہے۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ ہنس ہنس کے ہی موٹی ہوتی جا رہی ہیں" میں نے کہا۔

"نظر نہ لگا دینا" وہ بولیں۔

"میں نے تو پہلے ہی دو دفعہ ماشاء اللہ کہا ہے۔"

"شاباش۔"

زوبی چائے بنا کر لے آئی۔ گلابی گلابی چائے سے الائچیوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ خوب بالائی ڈال کر چائے بنائی تھی اس نے بے ڈنڈی کے پیالے زوبی نے ایک ایک کر کے سب کو دیئے چائے کی چسکیوں کے ساتھ گپ شپ بھی چلتی رہی۔

جانے رانی نے کیا کہا----- میں اس کی بات کے جواب میں بولا۔ "زیبی کو بلا لیتیں۔"

"اوئے ہوئے" پھپھو نے کہا "اب مت آئی زیبی۔"

"کیوں جی" میں پھنکارا۔

"اب شادی والے دن ہی دیکھے گا اسے۔"

"اور شادی جو ڈیڑھ سال بعد ہوئی۔"

"تو کیا ہوا۔"

"غلط بات۔"

"ہاں راجے" رانی نے پیار سے کہا "اب وہ منہ اٹھائے تھوڑا ہی چلی آیا کرے گی۔"

"اسے آنا پڑے گا" میں کسی پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح دھاڑا۔ "ورنہ-----"

"قمو تو پہلے ڈر ہی گئی۔ صائمہ ہنس پڑی اور رانی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے میرے ہی انداز میں کہا۔

"ورنہ----- کیا ہو گا وے۔"

"ورنہ یہ منگنی نہیں ہو گی" میں نے پھر پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بولا۔

"ٹھیک ہے نہیں کرتے" رانی نے کہا۔ پھر وہ قمو صبیحہ' رابعہ اور پھپھو سے بولی ییں چھوڑ دیں----- بس----- ختم-----"

میں ایکٹنگ بھول کر راہ راست پر آ گیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

خوب ہلا گلا تھی۔ صحن میں بھی اور کمرے میں بھی۔ رات نشانی کے لئے جانا تھا۔ زیبی کے ہاں۔ نزدیکی رشتہ دار ابھی سے آنا شروع ہو گئے تھے۔

امی صحن میں تھیں۔ دالان سے قہقہے پہ قہقہے اڑتے سنے تو وہیں سے آواز دی "رانی----- کام ختم کیا ہے یا ہنسی مذاق ہی ہو رہا ہے۔"

"بس امی کر لیا سب کچھ" رانی نے جواب دیا۔

کپڑے ٹانکے جا چکے تھے۔ قمو نے ترتیب سے نئے چرمی سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔ زیور کا ڈبہ بھی اسی میں رکھا اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں بھی اکٹھی کر کے ایک طرف رکھ دیں۔

"رانی" میں نے کام ختم ہوتے دیکھ کر کہا۔

"ہوں۔"

"مذاق برطرف۔ میری دو ایک شرطیں ہیں۔"

سب ہمہ تن گوش ہو گئیں----- دری پر بچھی چادر تہہ کرتے کرتے قمو رک کر مجھے تکنے لگی۔

"کیا ہیں شرطیں جناب کی۔"

"ایک تو یہ----- کہ۔"

"ہاں ہاں۔"

"کہہ دو راج" پھپھو جمیلہ نے بھی ٹھوکا دیا۔ رانی اور قمو کچھ کچھ پریشان ہونے لگیں۔

میں نے کہا "ایک شرط تو یہ ہے کہ رات زیبی کو انگوٹھی میں خود پہناؤں گا۔"
"ہائے اللہ ---- " جمیلہ پھپھو نے یوں کہا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو ---- "تو ساتھ جائے گا ----؟"
وہ حیرانگی سے کہہ رہی تھیں۔
"تو اور کیا" میں بولا۔
"بھئی کوئی نکاح تھوڑا ہی ہے۔ منگنی کی رسم کرنا ہے لڑکے بھی کبھی گئے ہیں۔"
ہمارے ہاں رواج نہیں تھا۔ لیکن میں مصر تھا۔ رانی بولی "خیر جائے گا تو سہی لیکن۔"
"گھر والی بات ہے" میں نے کہا "پھر آج کل تو یہ فیشن ہو چلا ہے۔ سب لڑکے خود لڑکیوں کو انگوٹھی پہناتے ہیں۔"
"ہمارے ہاں کبھی ایسا ہوا ہے" رانی بولی۔
"آج ہو گا" میں نے کہا۔
وہ سوچ میں پڑ گئی۔
"اور دوسری بات" میں بولا۔
"ہوں" پھپھو نے میری طرف دیکھا۔
"زیبی کے ہاں میں اسی طرح آیا جایا کروں گا۔ جیسے آیا جایا کرتا ہوں۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔"
"یہ تو بعد کی بات ہے آتے جاتے رہنا ---- پر یہ انگوٹھی پہنانے والی بات غلط ہے۔"
"کوئی غلط نہیں۔"
"یہ تو فہمیدہ آپا سے پوچھنا پڑے گا۔"
"میں خود ہی پوچھ آؤں۔"
"جوتے کھاؤ گے۔ بہت فیشنی بننے کی ضرورت نہیں۔"
میں اپنی بات پر اڑ گیا۔ مجبوراً رانی اور جمیلہ پھپھو کو زیبی کے ہاں جانا پڑا ----
فہمیدہ پھپھو کے خمیر میں بھی فیشن ایبل بننے کا عنصر تھا۔ یوں بھی برادری میں خاصی مالی حیثیت رکھتی تھیں۔ اپنے آپ کو بہت سارے خاندانوں سے اونچا سمجھتی تھیں۔ میری بات انہوں نے بخوشی مان لی۔ رانی اور پھپھو ہنستی مسکراتی واپس آئیں۔
"لو جی تیار ہو جاؤ تم بھی ----"
"تیار میں ہوں پہلے ہی سے ---- اتنا بڑھیا قسم کا سوٹ کس لئے آیا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔"

شام گہری ہو رہی تھی۔ گھر میں شور شرابا مچا تھا۔ عورتیں ہار سنگھار کر رہی تھیں۔ قیمتی قیمتی کپڑے پہنے تھے۔ زیور جسموں پر لادا تھا۔ ایک دوسری سے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
میں نہا دھو کر نیا سوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔ پرفیوم سپرے کی۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ تو جیسے اپنی صورت پہچانی نہ گئی ---- فخر سے میرا سینہ تن گیا۔
سیم و زر سے نہ سہی حسن و وجاہت کی دولت سے تو مالا مال تھا نا۔ رانی اور قمو قیمتی غرارے پہنے دلہنیں بنی ہوئی تھیں۔ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ زوبی نے بھی گوٹے والا نیا جوڑا پہنا تھا۔ امی کریم کلر سادہ لباس میں تھیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر نہال بھی ہو رہی تھیں اور آنکھیں بھی پونچھ رہی تھیں۔ ایسے وقت اباجی سب کو یاد آ رہے تھے لیکن خوشی کے اس موقع پر آنسو بہانا بدشگنی تھا۔
زیبی کا گھر دلہن کی طرح سجا تھا۔ رنگ برنگے قمقموں کے جال مکان کے ماتھے پر سجے تھے ---- تیز روشنی کا بندوبست تھا۔ ان کا گھر بھی مہمانوں سے بھرا تھا۔ منگنی کیا تھی اچھی خاصی شادی کا سا اہتمام تھا۔
ہم کوئی پچاس کے قریب تھے ---- عورتیں اور کچھ مرد۔ ان رشتے دار مردوں میں رانی اور قمو کے شوہر بھی تھے۔ باہر کا مہمان صرف شکیل تھا۔
وہ کیمرہ لایا تھا۔ قدم قدم پر تصویریں لے رہا تھا۔ اتنا پیار اور اتنا خلوص میرے گھر والوں کو مرعوب و متاثر کر رہا تھا۔
ہماری آؤ بھگت اس طرح کی گئی جس طرح کسی بہت بڑے لوگوں کی کی جاتی ہے۔ شاہد واجد امجد اور پھوپھا جی بچھے جا رہے تھے میرے گلے میں پھولوں اور سلمے ستارے کے اتنے ہار ڈالے گئے تھے کہ میری گردن دکھنے لگی تھی۔
کھانا بے حد پرتکلف تھا۔ دل کھول کر پھوپھا جی نے خرچ کیا تھا۔
کھانے کے بعد انگوٹھی پہنانے کی رسم تھی۔
زیبی درمیانی منزل کے ایک کمرے میں تھی۔ اسے میری بہنوں نے منگنی کا جوڑا اور زیور پہنایا تھا۔
پلنگ پر وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ میں فاضل بھائی اور قمو کے شوہر وسیم کے ساتھ اوپر آیا۔ عورتیں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ باتوں اور قہقہوں کا شور مل جل کر ہنگامہ سا بن گیا تھا۔ کچھ عورتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے بھی کر رہی تھیں۔ منگنی پر دولہا کے ساتھ آنے کی شاید یہ ہماری برادری میں پہلی مثال تھی۔ صحن میں جنگلے کے قریب دو کرسیاں رکھ دی گئیں۔ سارا صحن عورتوں اور نوجوان لڑکوں سے بھر گیا۔

مجھے کرسی پر بٹھا کر لڑکیاں زیبی کو لے آئیں۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور میں جو ب
شیر بنا پھرتا تھا اور خود زیبی کو انگوٹھی پہنانے کے لئے اکڑ رہا تھا پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔

زیبی دلہن بنی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

رانی نے انگوٹھی میرے ہاتھ میں دے کر کہا "لو بسم اللہ کرو۔ پہناؤ انگوٹھی" میں جانتا تھا کہ
بہت سی معترض نظریں ہم پر پڑ رہی ہیں لیکن بہت سی پرشوق نظریں بھی تھیں جو اس نئی رسم کو
خوشی و مسرت کے ملے جلے احساس سے تک رہی تھیں۔

قمو نے زیبی کا ہاتھ پکڑ کر میری طرف بڑھانا چاہا۔

لیکن

اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ میری طرح اس کی حالت بھی دگرگوں ہی تھی۔

"پہناؤ نا۔ کیا دیکھ رہے ہو؟" رانی نے مجھ سے کہا۔

"ہاں بھئی بسم اللہ کرو" فاضل بھائی شوق سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"پہناؤں کیسے-----" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ لو" قمو نے زبردستی زیبی کا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

زیبی شرم سے دوہری ہو کر اور جھک گئی۔

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے آج تک زیبی کو چھوا نہیں تھا۔ اتنے قریب بھی کبھی
نہ بیٹھا تھا۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔

رانی نے مجھے ٹھوکا دیا----- میں نے کانپتے اور پسینہ پسینہ ہاتھوں سے زیبی کا ہاتھ پکڑا اور
انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ نعیمہ پھپھو نے مجھے انگوٹھی پہنائی پھر سلامی کی رسم ہوئی۔

مبارک سلامت کا شور مچا----- کسی نے تالیاں پیٹیں۔ کوئی زندہ باد چیخا۔ شکیل گھر والوں کی
اجازت لے کر اوپر آیا تھا۔ اس نے ہماری کئی تصویریں اتار لیں۔

میں زیبی کا خوبصورت سنہری ہاتھ چند لمحے پکڑے تکتا رہا۔

اور

اچانک ہی میرے ذہن میں مس ڈوگر کے ذبح کی ہوئی مرغی کے پنجوں ایسے ہاتھ لہرا گئے۔

جی چاہا زیبی کا پیارا سا ہاتھ چوم لوں----- دل سے لگا لوں----- دل میں چھپا لوں۔

کتنے حسین ہاتھ تھے زیبی کے۔

○ ☆ ○

تمبولا ہو رہا تھا

لیکن

میں پہلے کی طرح بالکل دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ میری نظریں ہال میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ
لے رہی تھیں۔ لوگ بڑے اکسائیٹڈ تھے۔ جلدی جلدی چٹوں پر لگے نمبر کاٹ رہے تھے۔

اچانک مجھے وہ نظر آ گئی۔

مشرقی کونے میں رکھی میز پر وہ دو عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ چوتھی کرسی پر کوئی ادھیڑ عمر
مرد تھا۔

"ساجدہ ڈوگر" میں نے شکیل کو کہنی ماری۔

"آئی ہو گی" شکیل نمبر کاٹتے ہوئے بولا----- وہ اپنی کھیل میں مگن تھا میری بات کی طرف
دھیان ہی نہ دیا۔

میں نے دوبارہ مس ڈوگر کو دیکھا سوکھی دھواں کھائی سی لکڑی کے جسم والی ساجدہ ڈوگر نے
آج شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ دوپٹہ تہہ کر کے پٹی کی صورت گلے میں ڈال رکھا تھا۔ بال آج
ضرورت سے زیادہ ہی بکھرائے ہوئے تھے۔ اس کی چھپکلی کے پیٹ ایسی رنگت ہال کی روشنی میں
کچھ اور خراب لگ رہی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بھی بال پن اور کاغذ کی چٹ تھی۔

میں اسے تکے جا رہا تھا۔

اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی حالانکہ کبھی کبھی وہ ہال پر طائرانہ سی نگاہ ڈال رہی تھی۔

اس نے نمبر کاٹ لئے تھے۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ دبلی پتلی اور لمبی سی مس ڈوگر
لکڑی کی سیڑھی کی طرح تھی۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "شکیل اسے زینہ کہتا
ہے۔ حالانکہ موزوں لفظ سیڑھی ہے۔ خوب جچتا ہے اس پر۔"

شکیل نے مس ڈوگر کو دیکھا اور پھر مجھے آنکھ مارتے ہوئے بولا "آج پھر لفٹ لینا-----"

"پھر پکچر دیکھنے کا موڈ ہے۔"

"نہ بھی دیکھوں پھر بھی تمہیں چھوڑنے نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں۔"

"اس کے ساتھ جانا۔۔۔۔"

میں نے آج برا نہیں مانا۔ شکیل کی بات پر مسکرا دیا۔

تمبولا ختم ہوتے ہی میں اور شکیل ہال سے باہر نکل آئے ہم باتیں کرتے کرتے اس طرف آ گئے جس طرف مس ڈوگر کی گاڑی کھڑی تھی۔

ہم بظاہر لاپرواہی سے باتیں کر رہے تھے۔

لیکن

دراصل مس ڈوگر کی آمد کے منتظر تھے۔

ڈھیر سارے لوگ باہر آ کر اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"میں جاؤں" شکیل بولا "تم لفٹ لے لینا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے بھی اعتماد سے کہا۔

شکیل ذومعنی انداز میں مسکرایا اور پھر وہ واقعی مجھے خدا حافظ کہہ کر اندر چلا گیا۔

میں آہستہ آہستہ بیرونی گیٹ کی طرف بڑھا۔۔۔۔ خواہ مخواہ کی بے تکلفی سے کترایا۔۔۔۔

میں گیٹ کے قریب ہی آ کر کھڑا ہو گیا میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ کوئی رکشا ٹیکسی لے لوں گا۔

چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ مس ڈوگر کی گاڑی گیٹ سے باہر نکلی اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تھی۔

میں نے منہ دانستہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا خیال تھا وہ بنا کچھ کہے گاڑی نکال لے جائے گی۔

لیکن

اس نے گاڑی میرے قریب لا کر روک دی۔

"ہیلو۔۔۔۔" اس نے کہا

"ہیلو" میں نے جواب دیا۔ روکھا پھیکا سا۔

"سواری کے لئے کھڑے ہیں" اس نے پوچھا۔

"شاید رکشا مل جائے۔ شکیل کی یہی بات بری ہے۔ ساتھ لے آتا ہے پھر پکچر کا موڈ بنا لیتا ہے۔"

"آیئے" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"نہیں۔ نہیں مس ڈوگر میں خود ہی چلا جاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں نے ادھر ہی جانا ہے۔ ڈراپ کر دوں گی۔ یہاں تو اس وقت آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔"

میں متذبذب تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ میں جھجکتے ہوئے آگے بڑھا اور فرنٹ سیٹ پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی مخصوص خوبصورت سی پرفیوم لگا رکھی تھی جو اس کی وجودی بدصورتی سے مل کر اپنا خوبصورت احساس کھو رہی تھی۔

میں نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ کہنا زیب تو نہیں دیتا لیکن مجھے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بدمزگی کا احساس ہوا۔ جی چاہا فوراً گاڑی سے اتر جاؤں۔

اس نے گاڑی چلا دی۔

"اس دن رکشا مل گیا تھا نا" اس نے پوچھا۔

"جی" میں نے شیشے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

چند لمحے ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میرے ذہن میں عجیب و غریب سے سوال آ رہے تھے جنہیں میں جھٹک دینا چاہتا تھا۔

"کیا ہرج ہے"

"مسکہ لگا دینا چاہئے۔"

"ہو سکتا ہے کام بن جائے۔"

"تھوڑی ایکٹنگ ہی کرنا پڑے گی نا۔"

"زینے پر قدم رکھ ہی دینا چاہئے۔"

میں ان خیالات کو کوشش کے باوجود ذہن سے نہیں نکال پا رہا تھا۔ مجھے اچھی خاصی ملازمت کی ضرورت تھی۔ سیدھے ہاتھوں گھی نہیں نکل رہا تھا تو ایسے ہتھکنڈے ہی آزمانے پر مائل ہو رہا تھا۔

میرے اندر ان لمحوں میں تبدیلی آ رہی تھی۔ اس تبدیلی کو میں محسوس کر رہا تھا لیکن روک نہیں پا رہا تھا۔ یہ سیلابی صورت میں امنڈ رہی تھی اور میری کوششوں کے بند ٹوٹ رہے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں مس ڈوگر سے راہ و رسم بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ وہ لمحہ تھا۔

جس نے مجھے مقید کر لیا جس نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا جس نے مجھ پر سیلابی صورت میں حملہ کر دیا اور جس سے میں نے بچاؤ کی قطعاً کوشش نہیں کی۔

اسے زینے کے طور پر استعمال کر کے اگر میں کامیابی کی معراج تک پہنچ سکتا تھا۔ تو ہرج ہی کیا تھا۔

برائی اس وقت تک برائی رہتی ہے جب تک ہم اسے برائی سمجھتے ہیں لیکن جب ہم اسے برائی سمجھنا چھوڑ دیں تو وہ برائی نہیں رہتی۔ ہم غیر محسوس طریق سے اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ برائی میں اچھائی کو دیکھتے ہیں اور پھر اس پر اچھائی کا لیبل چسپاں کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔

حالانکہ

برائی کی طرف مائل ہوتے ہی ہم ڈھلانی چٹان سے لڑھک پڑتے ہیں۔ اور پھر تیزی سے لڑھکتے ہی چلے جاتے ہیں احساس اس وقت ہوتا ہے جب کوئی کھائی کوئی عمیق گہرائی ہمارے وجود کے ڈھیلے کو اپنے اندر روپوش کر لیتی ہے۔

مس ڈوگر گاڑی چلا رہی تھی۔

اور

میں وقفوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بے تکلفی اتر رہی تھی۔

"آپ کے پاس گاڑی نہیں ہے" اس نے شاید بات کرنے کی غرض سے کہا۔

"ہے۔ دو پہیوں والی۔"

"سکوٹر۔"

"نہیں۔ سائیکل۔"

اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا۔ جیسے یقین نہ آیا ہو۔

"شکیل کی گاڑی میں کلب آتا ہوں" میں نے اس کی حیرانی کو دور کرنے کے لئے کہا۔

"شکیل آپ کے دوست ہیں۔"

"ظاہر ہے۔"

"اچھے آدمی ہیں وہ۔"

"کچھ برے ہم بھی نہیں" میرے منہ سے نکل گیا۔ مرغی کے پنجوں کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ مس ڈوگر نے میری طرف دیکھا۔

میں ڈر گیا۔

کہیں یہ بے تکلفی پہلے ہی مرحلے پر مروا نہ ڈالے۔ مس ڈوگر نے اگر برا منا لیا تو آئندہ

کے لئے راہیں مسدود بھی ہو سکتی ہیں۔

میں سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر وہ بولی "آپ کا شغل کیا ہے۔"

"بیکاری" میرے منہ سے جیسے خود بخود نکل گیا۔ اس نے حیرانگی سے پھر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں کے کالے کالے گڑھوں میں اس کی بے ڈول سی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

"آپ کچھ نہیں کرتے" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"نہ کرنے کے برابر ہی ہے۔"

"کیوں۔"

"نوکری ہی نہیں ملتی---- جو ملتی ہے وہ-----"

"آپ کی ایجوکیشن۔"

"ایم اے اکنامکس۔"

"کب کیا تھا۔"

"تقریباً دو سال ہو رہے ہیں۔"

"ہوں۔"

"آپ پڑھتی ہیں۔"

"نہیں۔ میں نے بی اے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔"

"پچھلے سال کیا بی اے۔"

"چوتھا سال ہے" اس نے کہا۔ میں نے حیرانگی سے اس کی بات دہرائی "چوتھا سال-----"

وہ دھیرے سے مسکرائی میں نے اس کی عمر کا اندازہ کرنا چاہا۔ وہ خود ہی بولی "میری عمر تیئس سال تین ماہ ہے۔"

میں اس کی ذہانت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

آج بھی اس نے مجھے لبرٹی اتارا اور میرے شکریہ ادا کرنے سے پہلے ہی بائے کر کے گاڑی نکال لے گئی۔

○ ☆ ○

گاڑی میرے قریب سے گزری چند قدم رکی اور پھر ریورس ہو کر میرے قریب رک گئی۔

میں سڑک کے کنارے کنارے پیدل چلا جا رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ مجھے امی نے درزی کے کپڑوں کا پتہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ مجو اور ناجے کے شلوار کرتے سینے کے لئے دیئے ہوئے تھے۔

"ہیلو" گاڑی رکتے ہی میں نے ساجدہ ڈوگر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ جا کر آئی تھی۔ یہ بات میرے لئے اچھا شگون تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں میں خوشی کے بھرپور تاثرات جمع کرتے ہوئے اس کو ہیلو کیا۔

"کدھر۔" اس نے پوچھا۔

"ادھر" میں نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ وہ مسکرائی۔ خوفناک سی مسکراہٹ دیکھ کر میں بڑی خوبصورتی سے مسکرا دیا۔

"آیئے۔ ڈراپ کر دوں گی" اس نے دروازہ کھولے بغیر کہا۔

"شکریہ" میں نے آفر قبول کر لی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور میں اس کے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی چلا دی۔

میں اب ذہنی طور پر فلرٹ کے لئے بالکل تیار تھا۔

کیا ہرج تھا؟

کیا فرق پڑتا تھا؟

یہ سوال میں نے حل کر لئے تھے۔ واقعی کوئی ہرج نہ لگتا تھا اور کوئی فرق بھی نہ پڑتا تھا بلکہ مجھے تو یہ ایک دلچسپ کھیل اور ایک دلنشین مشغلہ لگنے لگا تھا۔ اس طرح اگر ایک معقول ملازمت حاصل کر سکتا تھا۔ ایک اچھی ملازمت لے سکتا تھا۔ تو اس کھیل اور مشغلے کو شروع کرنے میں مضائقہ بھی نہیں تھا۔

"کہیں کام جا رہے تھے۔" اس نے سنجیدہ صورت بنا کر پوچھا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر

مسکراہٹ سے کہیں زیادہ بھدی لگ رہی تھی۔

"کام۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔" میں نے بڑے دلفریب انداز میں کہا۔

اس نے میری طرف سپاٹ نظروں سے دیکھا۔

"آج کل کیا کرتے ہیں" اس نے شاید میرے کام کے متعلق پوچھا۔

"آوارہ گردی" میں نے جواب دیا۔

اس نے پھر میری طرف دیکھا۔

"کوئی کام نہیں ملا۔" اس نے پوچھا۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ بات شروع ہوتے ہی کام کی بات پر پہنچ گئی تھی۔

میں نے منہ بنا کر کہا "بالکل ہی بیکار تو نہیں ہوں۔۔۔۔"

"یعنی جاب کر رہے ہو۔"

"ہاں۔"

"ادھر ہی۔"

"جی ہاں۔"

"جاب اچھی نہیں۔"

میں نے سر ہلا دیا۔

وہ میری جاب کے متعلق پوچھنے لگی میں نے اسے متاثر کرنے کے لئے بڑی کامیاب اداکاری کی اور اپنی جاب کے متعلق بتایا۔

"پرائیویٹ اداروں میں تو نوکری کرنا ہی نہیں چاہئے" میں نے جیسے جھنجلا کر کہا۔

"کیوں۔"

"ان کے مالک ایمپلائی کو زر خرید غلام سمجھتے ہیں۔ تنخواہ دیتے ہوئے دل ڈوبتا ہے اور یوں کام لیتے ہیں جیسے۔۔۔۔"

"سب ادارے ایک سے نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے آپ کا تجربہ تلخ ہی ہو۔ لیکن سب ایک سے نہیں ہوتے۔۔۔۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"بلکہ پرائیویٹ ادارے سہولتیں بھی زیادہ دیتے ہیں اور ان کی تنخواہوں کا ریٹ بھی کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔۔"

"مجھے تو کسی ایسے ادارے سے سابقہ نہیں پڑا۔"

"ہوں۔"

چند لمحے وہ چپ رہی میں اس کی بات کا منتظر رہا۔
گاڑی گنجان آباد سڑکوں سے ہوتی مال پر آ گئی۔
"اوہ" وہ ایک دم چونکی۔
"کیوں۔"
"آپ نے کہاں جانا تھا۔ میں تو اپنے راستے پر چلی جا رہی ہوں۔"
"چلتی جائیے" میں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔
"اور آپ" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ہلکی سی چمک نظر آئی۔
"میں بھی آپ کے ساتھ" اس چمک سے شہہ پا کر بولا۔
"گھر چلیں گے" وہ سادگی سے بولی۔
"کیوں" میں نے گھبرا کر کہا
"چائے وائے....."
"کسی ریسٹورنٹ میں پی لیتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔"
"ٹھیک ہے۔"
ہم شیزان میں آ گئے۔ ایک الگ تھلگ میز کے گرد پڑی کرسیوں پر ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھے تو کئی لوگوں نے ہماری طرف دیکھا شاید ایک وجیہہ اور خوبصورت مرد کے ساتھ ایسی بدشکل لڑکی کو دیکھ کر انہیں حیرانی ہو رہی تھی۔
آج موسم سرد تھا۔ ہال ہیٹروں کی مدد سے گرم تھا۔ باہر سے اندر آ کر فرحت بخش تازگی کا احساس ہوا تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی گھلی گھلی تپش بے حد اچھی لگ رہی تھی۔
بیرہ مینو لے آیا۔
میں نے دیکھے بغیر چائے اور دو تین چیزوں کا آرڈر دے دیا۔
وہ طائرانہ سی نظر ہال پر ڈال رہی تھی۔
"اچھا ریسٹورانٹ بنا ہے یہ" اس نے کہا۔
"ہاں" میں شکیل کے ساتھ بارہا یہاں آ چکا تھا۔
"صاف ستھرا ہے ابھی تو۔ سروس بھی اچھی ہے" اس نے انگریزی میں کہا اس کا لہجہ اور تلفظ بالکل اہل زبان کا سا تھا۔ میں کچھ حیران بھی ہوا اتنی بدصورت لڑکی اتنے خوبصورت لہجے میں انگریزی بول سکتی ہے۔
"ہاں..... اگر انہوں نے یہ معیار قائم رکھا تو" میں نے بھی شستہ انگریزی میں جواب دیا۔
"یہی تو ہم لوگوں کی بری عادت ہے" وہ بولی "معیار قائم رکھنے کے عادی نہیں۔"

"واقعی۔"
ہم دونوں قومی سطح کی چیزوں کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا اس کا مطالعہ کافی وسیع ہے اور وہ حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر ہے۔
میں اس سے کافی مرعوب ہوا۔
چائے آ گئی میں نے اس کے لئے چائے بنائی۔ پیالی پیش کرتے ہوئے شامی کباب کیک اور دوسری چیزیں پیش کیں۔
اس نے ایک کباب اپنی پلیٹ میں رکھا۔ کیچ اپ ڈالی اور کانٹے کے ساتھ کھانے لگی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
اس کا پتلے پتلے لکیر نما ہونٹوں والا پھیلا ہوا دہانہ کھلتا تو اس کی صورت کچھ اور بگڑ جاتی۔
"آپ بھی تو کچھ لیں" اس نے مجھے خالی چائے پیتے ہوئے دیکھ کر کہا اور کبابوں والی پلیٹ میری طرف بڑھائی۔ "یہ لیجئے۔ ان کے کباب لذیذ ہوتے ہیں۔"
"شکریہ" میں نے ایک کباب اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور ہولے سے بولا۔ "لگتا ہے آپ اکثر یہاں آتی رہتی ہیں۔"
"ہاں" اس نے جواب دیا "یہ کباب مجھے بہت پسند ہیں۔"
میں نے شوخی سے آنکھیں گھمائیں اور مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔
"پھر کب آنے کا خیال ہے۔"
"کیا۔"
"یہ کباب کھانے پھر کب آئیں گی۔"
"کیوں۔"
"تاکہ آپ کو کمپنی دینے میں بھی پہنچ جاؤں۔"
وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بے اعتمادی سے مسکرائی۔
میں جھٹ سے بولا "یہ کباب مجھے بھی بہت پسند ہیں اور آج تو بہت ہی اچھے لگے ہیں۔"
"کیوں" اس کی بے اعتمادی قائم تھی۔
"اس لئے کہ آپ نے بھی ان کی تعریف کی ہے لہٰذا کبابوں کے لذیذ ہونے کی بات مستند ہو گئی۔"
وہ مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بے اعتمادی کے ساتھ کچھ حیرانی بھی تھی..... گو وہ بڑے پراعتماد طریق سے میز کے کنارے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔
میں نے جال پھینک دیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس جال کی گرفت میں وہ زود بدیر آئے

گی ضرور۔

ہم دونوں گھونٹ گھونٹ چائے حلق میں انڈیلنے لگے۔ میں کبھی دانستہ طور پر کن انکھیوں سے اسے دیکھ لیتا تھا اور اس طرح دیکھتا تھا کہ اس دیکھنے کا احساس اسے ہو جاتا---- مجھے لگتا وہ لمحہ بھر کے لئے گڑبڑا سی جاتی۔

اس گڑبڑانے پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی جسے میں چھپانے کی کوشش میں نمایاں کر دیتا۔

ہم ادھر ادھر کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ وہ شستہ انگریزی بولتی تھی روانی سے میں بھی بول رہا تھا۔ میں ہر ہر پہلو سے اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سب باتیں لگتا تھا میں نہیں میرے اندر بیٹھا کوئی دوسرا انسان کر رہا ہے۔

دوسرا انسان جو ضرورت مند ہے۔ جو ماں بہن بھائیوں اور منگیتر کے بوجھ تلے دبا ہے جسے زیادہ سے زیادہ پانے کی خواہش ہے جو اونچا معیار زندگی رکھنا چاہتا ہے۔

"آپ کی جاب کا مسئلہ حل ہوا۔" اس نے پیالی پلیٹ میں رکھ کر معطر سا رومال نکال کر اپنا منہ صاف کیا۔

"جاب کا مسئلہ؟" میں نے کہنیاں میز پر ٹکا کر کاغذی نپکن سے ہاتھ صاف کئے۔

"ہاں۔ آپ اس دن کچھ ذکر کر رہے تھے نا---- مطمئن نہیں ہیں اپنی جاب سے۔"

"ہوں۔"

"پھر۔"

"خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہوں۔"

"آپ نے اپنی کوالیفیکیشن کیا بتائی تھی۔"

"ایم اے اکنامکس۔"

"شارٹ ہینڈ یا ٹائپ وغیرہ جانتے ہیں۔"

میں نپکن کا گولہ سا بناتے ہوئے اس کی طرف بڑے حسین انداز میں دیکھ کر مسکرایا اور بولا "آپ تو میرا یوں انٹرویو لے رہی ہیں جیسے کسی فرم کی سلیکشن کمیٹی کی ممبر ہوں۔"

"ہوں" میری بات کے جواب میں اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ڈیڈی کے کاروبار میں پارٹنر کی حیثیت سے کام کر رہی ہوں۔"

"سچ" میں واقعی متعجب تھا۔

"ہاں۔"

"آفس جاتی ہیں۔"

"اکثر۔"

"لیکن---- کیوں؟"

وہ میری طرف دیکھ کر بڑی بیچارگی سے مسکرائی ایک لمحہ کو میرا دل اس مسکراہٹ پر پسیج گیا اس نے سر جھکاتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ "بیکار وقت بھی تو نہیں گزرتا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ضروری تھا۔ ڈیڈی نے میری پارٹنر شپ کو قانونی شکل دے دی۔ اب میں فرم کے کام میں مصروف رہتی ہوں۔"

میں نے گہری گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔

"ہماری فرم کو ایک محنتی اور ایماندار آدمی کی ضرورت ہے" وہ بولی۔ "آپ ڈیڈی سے مل لیں شاید آپ کا کام بن جائے۔"

میں اب اسے تکے جا رہا تھا۔ گہری گہری نظروں سے۔ وہ میری نظروں کی تپش سے شاید پگھل رہی تھی---- اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی---- ہولے سے بولی "محنت اور ایمانداری شرط ہے۔"

میں خوبصورتی سے مسکراتے ہوئے بولا "میں آپ کو بے ایمان نظر آتا ہوں۔"

وہ لمحہ بھر کو مجھے دیکھ کر بیرے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جو بل لے آیا تھا۔

"مس ڈوگر۔ پلیز---- بل میں دوں گا----" میں نے بل والی پلیٹ اپنی طرف کر لی۔ بل دیکھا پیسے دیئے اور مس ڈوگر کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں ریسٹورانٹ سے باہر نکل آئے---- باہر سردی تھی۔ ایک دم کپکپاہٹ سی محسوس ہوئی۔

"خاصی ٹھنڈ ہے۔" اس نے گاڑی کھولتے ہوئے کہا "جلدی سے بیٹھ جایئے۔"

میں اور وہ گاڑی میں آ بیٹھے---- اس نے گاڑی کے ساتھ ہیٹر بھی آن کر دیا۔

"اب؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جہاں کہیں گے ڈراپ کر دوں گی۔"

"اگر نہ کہوں تو----"

"گھر لے جاؤں گی---- اچھا ہے ڈیڈی سے بھی مل لیجئے گا۔"

میں ایک لمحہ کو سوچ میں پڑ گیا---- پھر اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی۔ وہ شاید میرے ذہن کی سوچ سے واقف تھی۔ مسکرا کر بولی "کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں مسکرا دیا۔

"پھر آ جاؤں گا" میں نے کہا۔

"کب؟" وہ بیساختگی سے بولی۔

"کل ہی سہی۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس دے دیں۔ پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ڈیڈی سے آپ کا غائبانہ تعارف کروا دوں گی آج۔"

"تھینک یو" میں نے کہا۔ اس نے اپنے گھر کا نمبر مجھے دے دیا۔

میں راستہ ہموار دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

اس نے مجھے ایک آباد سڑک کے کونے پر ڈراپ کر دیا---- میں کل اس کے ہاں آنے وعدہ کر کے رکشا لے کر گھر آ گیا۔

○ ☆ ○
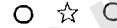
"شاباش زوبو" میں نے زوبی کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

وہ میری ورسٹڈ کی اکلوتی نئی پینٹ خوب اچھی طرح استری کر کے لائی تھی میں نے پچھلے ہفتے لنڈے سے خریدی تھی۔ لال 'گرے' سفید اور کالی دھاریوں والی خوب موٹی سی جرسی کی زپ درست کر رہا تھا بالکل نئی جرسی مل گئی تھی اور اس گرے پینٹ کے ساتھ خوب میچ کرتی تھی۔

"لیں بھائی جان" مجو میرے کالے جوتے پالش کر کے لے آیا "شکل نظر آتی ہے اتنے چمکائے ہیں میں نے۔"

"دیکھو شکل اپنی ان میں" میں نے مذاق سے کہا۔

وہ سچ مچ ہی جوتوں میں اپنی شکل دیکھنے لگا۔ زوبی کھلکھلا کر ہنس پڑی میں نے زوبی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اب جوان ہو گئی تھی۔ قمو کے جانے کے بعد گھر کے کاموں میں خوب حصہ لینے لگی تھی۔ چپ چاپ ہی اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ زوبی کی شکل کچھ کچھ رانی سے ملتی تھی اور کام کاج میں دلچسپی وہ قمو سے بھی بڑھ کر لیتی تھی۔ پڑھائی میں واجبی سی تھی۔

سال دو سال کے اندر یہ بھی بیاہنے کے قابل ہو جائے گی۔ میرے ذہن میں جانے کہاں سے خیال سرسرا گیا اور اس خیال کے ساتھ ہی مس ڈوگر کے ہاں جانے کا خیال کچھ اور مضبوط ہو گیا۔ آج میں اس کے ہاں جا رہا تھا۔ اس کے ڈیڈی سے ملنا تھا۔

صرف ملنے ہی نہیں جا رہا تھا۔ میں تو اس عزم کے ساتھ جا رہا تھا کہ ان کی فرم میں ملازمت حاصل کرنا ہے اور پھر مس ڈوگر کے سہارے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے۔

اس کے سوا کچھ چارہ نہیں تھا۔ سال دو سال بعد زوبو کی شادی کرنا تھی اپنا گھر بسانا تھا---- اور مجو ناجے کی زندگیاں بنانا تھیں۔

مجھے اب قطعاً پرواہ نہ تھی قدم کسی اخلاقی ضابطے کا خیال تھا نہ اچھائی برائی کی تمیز---- میں ترقی کے زینے پر دم رکھ چکا تھا۔ اب پاؤں مضبوطی سے جمانا تھے---- پھر زینہ پھلانگتے ہوئے منزل مقصود کو پانا تھا۔

زوبی نے میری استری شدہ پتلون کرسی کی پشت پر پھیلا دی۔ مجو نے جوتے کرسی کے قریب رکھ دیئے۔

"لایئے بھائی جان میں زپ ٹھیک کر دوں" زوبی نے کہا۔

"بس ہو گئی۔ یہاں دھاگے میں پھنس رہی تھی-----" میں نے کہا۔

"کتنی اچھی ہے۔ بالکل نئی" وہ بولی

"ہاں زوبو-----" میں نے کہا پھر جرسی کو پلنگ پر پھیلاتے ہوئے بولا "دعا کر زوبو میرا کام بن جائے۔ پھر سچ مچ کی نئی سویٹریں لیا کریں گے۔"

وہ ہنس دی "یہ جھوٹ موٹ کی نئی ہے۔"

"اور کیا----- کسی گورے نے پہنی ہو گی----- اللہ جانے کیسا ہو گا----- شرابی-----"

وہ پھر ہنس پڑی۔ "ہائے بھائی جان آپ تو پہننے سے پہلے ہی دل خراب کر رہے ہیں۔"

"مجبوری ہے زوبو۔ مجبوری میں دل خراب کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مجبوری نہ ہو تو کیا سمجھتی ہو----- میں لنڈے کی سویٹر کو ہاتھ لگاؤں-----؟"

وہ چپ ہو گئی----- وہ شائد سمجھتی تھی کہ میں شوق سے لنڈے کی چیزیں پہنتا ہوں۔ کبھی کوٹ اٹھالاتا ہوں کبھی قمیض اور کبھی سویٹر۔

چند لمحوں بعد وہ بولی "صرف ہم ہی تھوڑا لنڈے کی چیزیں لاتے ہیں۔ بڑے بڑے امیر لوگ وہاں سے چیزیں خریدتے ہیں میری کلاس کی امیر امیر لڑکیاں وہاں سے کوٹ اور سویٹریں لیتی ہیں۔"

میں چاہتا تو زوبی کو اس موضوع پر اچھا خاصہ لیکچر دے سکتا تھا۔ لیکن میں ناسمجھ بچی کے ذہن میں کوئی کمپلکس پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہنس کر بولا۔

"تم بھی لے آیا کرو۔ رنگ برنگی سویٹریں۔"

"مفت تھوڑا ہی ملتی ہیں۔ وہاں بھی پیسے خرچ کرنا پڑتے ہیں۔"

"فکر نہ کرو زوبی----- پیسے ہی پیسے ہوں گے۔"

"یہ جاب مل گئی نا----- تو دیکھتی جانا----- میں پیسوں کی بارش کر دوں گا تم پر۔"

وہ ہنس پڑی

"زوبی" امی نے نیچے سے آواز دی۔

"آئی امی" وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

میں تیار ہونے لگا۔ میرے ذہن میں خیالات کی بھرمار تھی۔ بوجھ تھا۔ کش مکش تھی۔ میں زوبی کے لئے پیسوں کی بارش کا سوچ رہا تھا۔

تیار ہو کر میں نے اپنے سراپا پر نگاہ ڈالی----- لنڈے کی جرسی اور پتلون نے کیا رنگ جمایا تھا۔ میرا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ کتنا گریس فل لگ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی پرفیوم نہ تھی لیکن لگتا تھا میں بذات خود مسحور کر دینے والی مہک ہوں۔

تیار ہو کر نیچے آیا۔ امی نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ ان کی نگاہ میری بلائیں لے رہی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو" امی نے پوچھا۔

"کسی سے ملنے" میں مسکرایا۔

"کس سے" امی نے جلدی سے پوچھا۔

"کسی لڑکی سے" میں نے شوخ ہوتے ہوئے کہا۔

"بکواس نہ کر" امی نے ڈانٹا۔

"کیوں امی۔ جوان جہان آدمی ہوں----- اتنے اہتمام سے تیار ہو کر-----۔"

"بک بک نہ کیا کر۔"

"ہرج ہے کوئی۔"

"میں کہتی ہوں۔ ایسی الٹی سیدھی باتیں منہ سے نہ نکالا کر۔ اب تیری منگنی ہو چکی ہے۔ زرا زمہ داری کا احساس کیا کر-----"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا----- امی صحن میں کھڑی تھیں میں ان کے قریب آ گیا ان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولا "امی کچھ پڑھ کر پھونک ماریں مجھ پر تاکہ جس کام جا رہا ہوں ہو جائے۔"

امی نے میری بانہیں گلے سے نکالتے ہوئے کہا "اچھا اس آدمی سے ملنے جا رہا ہے جس نے نوکری کا وعدہ کیا ہے۔"

"ہاں" میں نے کہا۔ گھر والوں کو میں نے یہی کہا تھا کہ کسی فرم کے مالک نے نوکری دینے کے لئے بلایا ہے۔

"اللہ پاک اپنا فضل کرے----- تیرا دامن مراد کے پھولوں سے بھر دے۔"

"آمین۔"

میں باہر جانے کے لئے مڑا۔

ناجا ڈیوڑھی سے صحن میں آ گیا۔ مجھے دیکھا اور پھر بولا "بھائی جان پھپھو کے گھر ٹی وی آیا ہے"

"کس پھپھو کے گھر۔"

"فہمیدہ نے خریدا ہے ٹی وی۔"

"سچ۔"

"ہاں۔۔۔۔"

"مالدار لوگ ہیں وہ۔"

"اللہ نصیب کرے" امی نے دعا دی" زیبی آئی تھی بتانے۔"

"ہم سب ان کے ہاں دیکھنے جائیں گے ٹی وی" ناجا بولا "پھپھو نے سب کو بلایا ہے۔"

زوبی کمرے سے نکل آئی "ہاں امی۔ آج ہم ان کے گھر جائیں گے ٹی وی دیکھنے۔ زیبی باجی نے کہا تھا ضرور آنا۔"

"میں بھی جاؤں گا" مجو نے جنگلے پر سے آدھا دھڑ لٹکاتے ہوئے اوپر سے آواز دی۔

"اچھا اچھا۔۔۔۔ پرے ہٹو۔ جنگلہ اتنا مضبوط نہیں ہے" امی نے مجو سے کہا۔ پھر مجھ سے بولیں "تم کتنے بجے تک لوٹو گے۔"

"کیوں۔"

"ہم سب فہمیدہ کے ہاں ہی ہوں گے۔ ادھر ہی آجانا۔"

"اچھا۔"

میں ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔۔۔۔ ٹی وی کے لئے میرے بہن بھائی جس قدر اکسائیٹڈ تھے۔ یہ بات میرے لاشعور میں ایک چیلنج کی طرح ابھر رہی تھی۔ میں کچھ بے چین بے چین سا ہوا۔۔۔۔

پھر میرے عزم اور ارادے میں اس بے چینی نے مضبوطی بھر دی۔ میں نے مستحکم ارادہ کر لیا۔۔۔۔

زینہ استعمال کرنے کا۔

پوری پوری طرح استعمال کرنے کا۔

بڑی سڑک پر آکر میں نے رکشہ لیا اور مس ڈوگر کے بتائے ہوئے پتے پر رکشے کو چلنے کا کہا۔

شام ہونے والی تھی۔۔۔۔ سردیوں کا دن ٹھٹھرا ہوا ہوتا ہے بہت جلدی دبک جاتا ہے۔ اب دن کی روشنی تو تھی۔۔۔۔ لیکن شام کے دھندلکے پھیلتے جا رہے تھے۔۔۔۔ ہوا میں آج بھی خنکی زیادہ تھی۔۔۔۔

میں مس ڈوگر کی کوٹھی پر بغیر کسی تردد کے پہنچ گیا۔ شاہراہ کا مجھے پتہ تھا اور کوٹھی کا نمبر میرے پاس تھا اس لئے کچھ دشواری پیش نہ آئی۔۔۔۔

میں کوٹھی سے کچھ فاصلے پر ہی اتر گیا۔۔۔۔ اور پیدل چلتا ہوا کالے آہنی گیٹ تک پہنچ گیا۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔۔۔۔ امید وبیم کی حالت میں تھا۔۔۔۔

میں گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ مالی ہاتھ میں کھرپا اور درانتی پکڑے میلی سی چادر کندھے پر ڈالے چمن سے باہر آرہا تھا۔

میں نے پوچھا "ڈوگر صاحب گھر پر ہیں۔۔۔۔؟"

"ہوں گے" اس نے کہا اور بے اعتنائی سے گیٹ کی جانب چل دیا۔

میں پورچ میں آگیا۔۔۔۔ اور دروازے کے قریب لگے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔

بیل ہوئی۔۔۔۔

میں رک کر انتظار کرنے لگا۔

میں وہیں کھڑے کھڑے اس کوٹھی کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹھی بہت پرانی تھی نہ بالکل نئی۔۔۔۔ یقیناً چار کنال کے رقبے پر بنی تھی۔ بڑے بڑے لان چاروں طرف تھے۔ درمیانی عمارت زیادہ بڑی تو نہ تھی۔ پھر بھی تین چار بیڈ روم پر مشتمل لگتی تھی۔۔۔۔

پورچ میں دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔۔۔۔

مجھے کئی لمحے انتظار کرنا پڑا۔۔۔۔ جو میرے لئے اذیت دہ تھا۔ میں آگے پیچھے کھڑی گاڑیوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اگلی گاڑی غالباً رحمان ڈوگر کی تھی کیوں کہ فرنٹ سیٹ پر ڈھیر ساری فائلیں پڑی تھیں۔۔۔۔ دوسری گاڑی ساجدہ کی تھی۔ اس گاڑی میں میں اس سے لفٹ لے چکا تھا۔۔۔۔

دروازہ کھلا۔۔۔۔ اور ایک ملازم نما شخص نے مجھے سرتاپا دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا اسم شریف؟"

"مجھے سراج کہتے ہیں اور مجھے رحمان صاحب سے ملنا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنے کو تھا۔۔۔۔ کہ ساجدہ آگئی۔۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔۔۔۔ میں نے اسے سلام کیا۔

"آیئے' سراج صاحب" اس نے کہا۔ میرے سلام کے جواب میں اس نے صرف سر ہلا دیا۔

میں آگے بڑھا۔۔۔۔ وہ ملازم سے بولی "رحمو ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولو۔" میں ساجدہ کے ساتھ اندر آگیا۔

ساجدہ نے آج موٹے اونی کپڑے پہن رکھے تھے۔ گرم سوٹ گرم سویٹر اور اس پر لمبا سا گرم کوٹ۔ گلے میں اونی مفلر تھا اور سر پر اونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔۔۔۔ سردی اتنی شدید تو نہ تھی لیکن دبلی پتلی سوکھی لکڑی کی طرح دھواں کھائی لڑکی کو کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی۔۔۔۔ ان کپڑوں میں وہ معمول سے زیادہ ہی مضحکہ خیز دکھائی دے رہی تھی۔

رحمو نے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھول دیا۔۔۔۔

ایک لمحہ کو مجھے یوں لگا جیسے اس نے ڈرائنگ روم کا نہیں کسی خود ساختہ جنت کا دروازہ کھول دیا ہے۔۔۔۔

کشادہ ڈرائنگ روم اتنی نفاست اور ایسی بے مثال چیزوں سے سجا تھا کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

صوفوں کی سائیڈ ٹیبلوں پر رکھے کرسٹل کے لیمپوں سے چھن چھن کر برسنے والی روشنی میں کمرے کی خوبصورتی مسحور کر رہی تھی۔۔۔۔

"تشریف رکھیئے" اس نے مجھ سے کہا۔

میں ایک نرم و گداز صوفے میں دھنس سا گیا۔۔۔۔ وہ میرے سامنے ویلوٹ لگی گدے دار کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔۔

کمرہ خاصہ گرم ہو رہا تھا۔۔۔۔ بڑا سا ہیٹر دیوار میں لگا ہوا تھا۔۔۔۔ اس کی سرخ سرخ روشنی اور تپش سردی کو چاٹ رہی تھی۔۔۔۔

"گھر ملنے میں دشواری پیش تو نہیں آئی" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں کمرے کی خوبصورتی کے سحر سے نکلا اور اس کے وجود کی بدصورتی کے متعلق سوچتے ہوئے بولا "نہیں۔۔۔۔"

وہ چند لمحے چپ رہی۔

میں نے پوچھا "آپ کے ڈیڈی گھر پہ ہیں۔"

"ہاں۔"

"میرا غائبانہ تعارف۔"

"کروا دیا ہے۔ ابھی بلاتی ہوں انہیں" وہ اٹھی

ذرا ٹھہر جایئے" میں نے جلدی سے کہا وہ حیران ہو کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی "کیوں۔"

"بیٹھیے آپ۔"

وہ بیٹھ گئی۔ میں مسکرا دیا۔۔۔۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔

میں نے پھر مسکرا کر اسے دیکھا اور بولا "آپ کے ڈیڈی نے کیا کہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ نے جو میرا تعارف کروایا۔ کچھ تو کہا ہو گا۔"

"کچھ نہیں۔۔۔۔ بس آپ سے مل لیں گے۔۔۔۔"

"کام ملنے کی امید ہے۔"

وہ ہنس پڑی "اچھا۔۔۔۔ اسی لئے مجھے جانے نہیں دیا۔۔۔۔ پہلے آپ یقین کرنا چاہتے

ہیں۔۔۔۔"

"میں نے سنا ہے آپ کے ڈیڈی جاب دینے کے معاملے میں خاصے سخت ہیں۔۔۔۔"

"بالکل۔۔۔۔ وہ اصول کے سختی سے پابند ہوتے ہیں۔۔۔۔ اگر کوئی اہل ہو تو کام دیتے ہیں۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔"

"جواب۔۔۔۔"

"بالکل۔"

"میں۔۔۔۔ کس پوزیشن میں ہوں۔"

وہ پھر ہنس پڑی۔۔۔۔ اٹھتے ہوئے بولی "فکر نہ کریں۔۔۔۔ اپنی لیاقت پر اعتماد کریں۔ محنتی اور ایماندار تو آپ وقت کے ساتھ ثابت ہوں گے۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ تھوڑی سی۔۔۔۔ سفارش بھی کر دوں گی۔ آپ کا کام بن جائے گا۔۔۔۔"

"اوہ۔۔۔۔ شکریہ۔۔۔۔ شکریہ۔۔۔۔" میں جذباتی سا ہو گیا۔۔۔۔

وہ مجھ پر اک نگاہ۔۔۔۔ جس میں پسندیدگی کی چمک تھی مجھ پر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔۔۔۔

پھر

وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ اندر آئی

میں تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔ ڈوگر صاحب سے تعارف ہوا۔ وہ مصافحہ کرنے کے بعد صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "تشریف رکھیئے۔۔۔۔"

رحمان ڈوگر پچاس کے لگ بھگ ہوں گے۔ خوبصورت تو نہ تھے لیکن بیٹی کی طرح بدصورت بھی نہیں تھے۔۔۔۔ بال کھچڑی سے تھے۔ سر درمیان سے گنجا تھا۔ آنکھیں چھوٹی لیکن چمکدار تھیں۔۔۔۔ ناک اونچی اور پتلی۔ دہانہ درمیانہ رنگ کھلتا ہوا گندمی اور جسم قد کے لحاظ سے قدرے فربہ دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔ انہوں نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔۔۔۔ اور پائپ ہاتھ میں تھا۔۔۔۔ مجموعی طور پر وہ گریس فل ہی لگ رہے تھے۔۔۔۔

وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔۔۔۔ ساجدہ بھی ان کے ساتھ میں بیٹھ گئی۔۔۔۔

رحمان ڈوگر نے مجھ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ میں خود آگہی سے پر اعتماد تھا۔ مجھے ان کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات نظر آئے۔

ہم رسمی سی باتیں کرنے لگے۔۔۔۔

ساجدہ اٹھ کر چلی گئی۔

رحمان ڈوگر مجھے اپنی فیکٹری اور آفس کے متعلق بتانے لگے اپنے کڑے اصول اور ضوابط کا

بھی ذکر کیا----

پھر

اس جاب کا بتایا- جس کے لئے انہیں محنتی' قابل اور ایماندار آدمی کی ضرورت تھی اور جس کے حصول کے لئے آج ساجدہ نے مجھے بلایا تھا----

کام بھی خاصا سخت تھا---- لیکن تنخواہ اور دوسری سہولتیں جو اس جاب کے لئے مخصوص تھیں---- ایسی تھیں کہ لمحہ بھر کو تو میں یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق سا ہو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں---- شاید اسی لئے میں نے اک لمحہ کو اپنی آنکھیں میچ لیں----

وہ مجھ سے میری تعلیم---- تعلیمی ریکارڈ---- موجودہ نوکری---- وہاں کی تنخواہ اور کام کے متعلق پوچھتے رہے----

میں نے انہیں مرعوب کرنے کی پوری پوری کوشش کی---- میں جوان آدمی تھا- آٹھ گھنٹے کی بجائے سولہ گھنٹے بھی کام کر سکتا تھا---- میں نے انہیں محنتی ہونے کا یقین دلانے کے لئے الفاظ کا جتنا ذخیرہ استعمال کر سکتا تھا کیا-

لیکن

وہ عجیب سی مخلوق تھے---- میں ان کے رویے یا باتوں سے بالکل اخذ نہ کر سکا کہ اس جاب کے لئے انہوں نے مجھے منتخب کر لیا ہے-

ساجدہ آ گئی---- اس کے پیچھے پیچھے ملازم ٹرالی میں چائے لا رہا تھا----

چائے کے ساتھ لوازمات کچھ زیادہ نہیں تھے---- صرف نمکین اور میٹھے بسکٹ تھے----

میرا دل بجھ سا گیا- لگتا تھا پذیرائی معقول نہیں ہوئی----

چائے کے بعد رحمان اٹھ گئے---- انہوں نے پندرہ تاریخ کو باقاعدہ انٹرویو کے لئے بلایا---- میں نے ساجدہ سے کہا "تھوڑی سی سفارش کریں گی-"

وہ مسکرائی---- "آپ انٹرویو تو دے لیں---- ڈیڈی بے جا سفارشوں کے قائل نہیں---- بورڈ کے سامنے آپ حاضر ہوں- ایک ممبر میں بھی ہوں-"

میں کچھ بے مزہ سا ہو گیا---- میرا خیال تھا---- کہ آج ساجدہ کے ہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جاؤں گا---- جاب کی آفر ملے گی---- اور کل سے ایک شاندار آفس میں میری سیٹ بن جائے گی-

کچھ دیر بیٹھ کر میں اٹھ آیا---- ساجدہ نے بھی بے جا ہمت افزائی نہیں کی-

لیکن

یہ جاب میرے مطلب کی تھی---- میری ضرورت تھی---- اور اسے میں نے حاصل کرنا تھا----

○ ☆ ○

"پھر-"

"بس جو جو پوچھتے گئے---- میں جواب دیتا گیا-"

"کون کون تھا-"

"رحمان---- مس ڈوگر اور ایک صاحب غالباً مینجر---- اور لوگ بھی آئے تھے انٹرویو کے لئے----"

"ہاں-"

"کتنے----"

"غالباً آٹھ-"

"پھر تو چانس ہے-"

"کیسے-"

"بھئی مس رحمان کی سفارش-"

میں نے برا سا منہ بنایا---- شکیل ہنس پڑا----

"انٹرویو کے لئے اور بھی لوگ ہیں----" میں بولا "تین دن انٹرویو کے لئے مخصوص ہیں----"

"اچھی خاصی جاب ہے اس کا مطلب تو یہی ہوا-"

"ہاں-"

میں نے جاب تنخواہ اور دیگر سہولتوں کا ذکر کیا-

شکیل جیسے اچھل پڑا---- "پھر تو یہ جاب تمہیں ضرور ملنا چاہئے-"

"امید کم ہی ہے- بڑے بڑے جغادری قسم کے لوگ تھے- امیدواروں میں---- اپنے پاس ایک ڈگری ہی ڈگری ہے----"

"لیکن کام بن سکتا ہے-"

"کیسے-"

"مس ڈوگر سے دوستی بڑھاؤ۔"

"ہونہہ" میں نے پھر منہ بڑھایا---- "ایسی کچی وہ بھی نہیں لگتی---- میں چند ملاقاتوں میں اس کا جائزہ لے چکا ہوں----"

چھوڑو یار---- تمہارے اس چھ فٹ کے ڈیل ڈول اور خوبصورت چہرے کا کیا فائدہ جو ایک دھواں کھائی لکڑی سی لڑکی کو بھی پٹو نہ ڈال سکو۔"

"میری مردانہ وجاہت کو چیلنج نہ کرو۔"

شکیل میری بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑا---- پھر کرسی میں آگے کو جھکتے ہوئے رازداری سے بولا "اسی طرح تو کام بنے گا----"

ہم دونوں لان میں کین کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ آج دھوپ خوب نکھر کر نکلی تھی۔ بارشوں کے بعد مطلع صاف ہوا تھا۔ سبزہ اور پھول دھلے دھلائے بڑے صاف لگ رہے تھے۔ گھاس کا مخملیں فرش بھی بڑا دیدہ زیب تھا----

آج چھٹی تھی اور میں شکیل کے ہاں چلا آیا تھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ دھوپ نازک اندام حسینہ کی طرح آہستہ آہستہ اتری تھی اور اب پورے لان پر چھائی تھی---- شکیل کی ممی چند منٹ ہمارے ساتھ بیٹھی تھیں۔ پھر اندر چلی گئی تھیں---- ہمارے لئے کینو' سیب اور کیلے بھجوا دیئے تھے---- ڈرائے فروٹ کی طشتری بھی بھیجی تھی۔

ہم دونوں چلغوزے کھاتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ کل میرا انٹرویو ہوا تھا اور میں پوری روئیداد شکیل کو سنانے آیا تھا۔

"جواب کب تک دیں گے" شکیل نے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد پوچھا۔

"کچھ پتہ نہیں۔"

"ابھی تو انٹرویو ہی ہو رہے ہوں گے۔"

"کل بھی ہو گا۔"

"چند دن ہیں ابھی---- انتظار کرنا ہو گا۔"

"چانس کم ہی دکھائی دیتا ہے۔"

"ناامید کیوں ہوتے ہو۔"

"بھئی بڑے بڑے تجربہ کار لوگ بھی تھے۔"

"کیا ہوا----؟"

"تم یونہی آس دلا رہے ہو۔"

"یونہی نہیں----"

"تو اور----"

"مس ڈوگر کو رام کرو----"

"پھر وہی بات---- حربے تو آزمائے ہیں---- لیکن خاصی ہوشیار عورت ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا اس کا۔"

"میری مانو تو اسے قابو کرو---- کام بن جائے گا---- اور ایک دفعہ کام بن گیا تو تمہارے سارے مسائل یوں حل ہو جائیں گے" شکیل نے چٹکی بجائی۔

"ہاں---- یہ بات تو ہے" میں سوچتے ہوئے بولا----

"مس ڈوگر بنتی ہے یار---- تم سے متاثر نہ ہوتی تو گھر پہ کیوں بلاتی۔ خاص طور پر اپنے باپ سے تمہیں ملایا----"

میں سوچ میں پڑ گیا----

"تمہارا کام ضرور بن جائے گا۔ مس ڈوگر پر تمہاری وجاہت کا جادو چل چکا ہے۔ یہ دوسری بات ہے---- کہ کمپلکس کی ماری بیچاری مس ڈوگر اس کا اظہار نہ کرے۔"

"شاید تمہاری ریڈنگ صحیح ہو۔"

"سو فیصد ہے۔"

میں مسکرا دیا----

شکیل شوخی سے بولا---- "ہم نے تو راہ دکھا دی تھی یار---- وہ زینہ ہے زینہ---- ترقی کا' کامیابی کا---- بلاجھجک پیر رکھ دو اس پر----"

"ٹھیک ہے" میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو مجتمع کیا۔

پھر ہم دونوں نے مس ڈوگر کو مدعو کرنے کا پلان بنایا۔

"ہلٹن میں بلا لیتے ہیں" شکیل بولا----

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"گپ شپ رہے گی---- تم اس کے قریب آنے کی کوشش کرنا" شکیل نے ہنس کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں اس کی ایکٹنگ بڑی خوش اسلوبی سے کر سکتا ہوں" میں نے بھی ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا----

"کب مدعو کریں" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں کچھ دن انتظار کر لیا جائے۔"

"یہ نہ ہو ہم انتظار کرتے رہیں---- اور جاب کسی اور کو مل جائے۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے----- کل ہی بلا لو-----"

"فون نمبر ہے میرے پاس۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی کر لو----- گھر پہ ہی ہو گی۔"

شکیل اٹھ کھڑا ہوا----- اس نے ملازم کو آواز دی۔

"جی صاحب" کیاریوں کے پاس کھڑا لڑکا دوڑا آیا۔

"یہ چیزیں اٹھالو" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا-----

"اچھا صاحب۔"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا----- ہم دونوں اندر آ گئے----- فون لابی میں پڑا تھا-----

"کر لو-----" شکیل نے کہا فون اٹھا کر صوفے پر رکھ دیا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا-----

شکیل مجھے چھوڑ کر سامنے والے کمرے میں چلا گیا-----"

میں نے مس رحمان ڈوگر کا نمبر نوٹ کیا ہوا تھا----- جیب سے کاغذ نکالا----- اور نمبر دیکھتے ہوئے ڈائیل پر انگلی گھمانے لگا-----

پہلی دفعہ ڈائیل کرنے پر ہی نمبر مل گیا----- ادھر سے کسی ملازم نے اٹھایا-----

"کون صاحب۔"

"مس ڈوگر ہیں۔"

"جی۔"

"ان سے بات کرنا ہے۔"

"آپ کا نام۔"

"راج۔"

"اچھا صاحب ہولڈ کیجئے----- ابھی بلاتا ہوں-----"

میں فون تھامے بیٹھا رہا----- میرے اندر کچھ پالینے کچھ چھین لینے کی ہوس کلبلا رہی تھی۔ میں نے یہ جاب حاصل کرنا تھی اور ضرور حاصل کرنا تھی۔

"ہیلو" تھوڑی دیر بعد مس ڈوگر کی بھونڈی سی آواز میری سماعت پر گراں گزری لیکن میں نے اپنی آواز میں محبتوں کی مٹھاس بھر کر کہا----- "کیا حال ہے مس ڈوگر۔"

"شکریہ----- ٹھیک ہوں۔"

"آج چھٹی ہے۔"

"جی----- میں اکثر چھٹی پہ ہی ہوتی ہوں۔"

میں نے دانستہ انٹرویو کا ذکر نہ کیا----- بس ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا----- اس کے انداز سے لگتا تھا کہ میرا اس وقت فون کرنا اسے برا نہیں لگا-----

پھر بھی میں نے پوچھا "اس وقت فون کر کے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔"

"اوہ نہیں" وہ ایک دم کہہ اٹھی----- میں سرشار سے لہجے میں بولا۔ "شکیل کے ہاں آیا تھا----- فون دیکھا تو جی چاہا آپ کو فون کروں-----"

"شکریہ" وہ بولی-----

"مس ڈوگر۔"

"ایک درخواست کروں۔"

"جی۔"

"کل شام آپ ہمارے ساتھ چائے پی سکتی ہیں؟"

وہ چند لمحے چپ رہی----- پھر بولی "کسی خوشی میں؟"

"شکیل عنقریب یو کے جا رہا ہے----- اسے چائے پر مدعو کیا----- تو سوچا آپ کو بھی زحمت دوں-----"

وہ چپ رہی----- میں نے بڑے اصرار سے کہا "پلیز انکار نہ کیجئے گا----- تھوڑا سا وقت میری خاطر----- ضرور نکال لیجئے گا-----"

"ہوں۔"

"آئیں گی نا-----"

"کہاں آؤں۔"

"ہلٹن میں----- کل شام چار بجے۔"

"بہتر۔"

"اوہ شکریہ----- بے حد شکریہ۔"

میں جس جذباتی پن کا اظہار کر رہا تھا۔ شاید اس کو اس کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا----- اسی لئے میری باتوں کا اٹک اٹک کر جواب دے رہی تھی-----

اس نے دعوت قبول کر لی تھی میں نے فون رکھتے ہی شکیل کو پکارا-----

وہ کمرے سے نکل آیا----- مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا "آئے گی نا۔"

"ضرور آئے گی" میں نے شوخی سے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"آئے گی نہیں تو جائے گی کہاں" شکیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے بازو پھیلا دیئے۔ میں خوشی اور مستی میں جھومتا اٹھا اور اس کے قہقہے کی سنگت قہقہے سے کرتا ہوا اس سے بغلگیر ہو گیا۔

ہم لمبی ڈرائیو پر جا رہے تھے---- ساجدہ گاڑی چلا رہی تھی۔ اور میں اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ تو تھا۔ لیکن میں نے اپنے رویے سے اس فاصلہ کو بے معنی بنانے کی کوشش کی تھی۔

ساجدہ اس دن ہلٹن آئی تھی---- شکیل بھی تھا۔ ہم تینوں نے کافی وقت گزارا تھا---- مس ڈوگر ہم دونوں سے بے تکلفی سے باتیں کرتی رہی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ بھی ہم دونوں کی طرح ایک مرد ہے۔ نسوانیت نام کی کوئی شے اس میں نظر نہ آتی تھی---- لیکن کمبخت مرد بھی تو نہ لگتی تھی۔ مریل مردار سا بھونڈا بھی شاید اس سے کچھ اچھا ہی ہوتا ہو گا۔

اس دن میں نے اس سے اپنی نوکری کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی۔ گو دل میں کھٹک تھی۔ میں نتیجے کا منتظر تھا۔ جلد از جلد فیصلہ سننا چاہتا تھا لیکن میں نے دانستہ اس سے ذکر نہیں کیا۔

اگر میں سلیکٹ ہو گیا ہوتا تو یقیناً مجھے اطلاع مل گئی ہوتی۔ معاملہ گڑ بڑ ہی تھا---- اسی لئے ساجدہ کا تعاون ضروری ہو گیا تھا۔ میں اس کے قریب آنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا---- اس کی قربت ہی میرے مسائل حل کر سکتی تھی۔

اس دن میں نے اسے یہی تاثر دیا تھا کہ نوکری سے زیادہ میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس پر میرے رویے کا کیا اثر ہوا---- کیوں کہ اس کا بھونڈا سا چہرہ ہمیشہ ہی جذبات سے عاری ہوتا تھا اور اس کا رویہ لڑکیوں کا سا کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ملتی تھی---- بالکل ملنے والوں کی طرح---- کوئی جذبہ کوئی حرکت کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا اس نے اپنا آپ اک خول میں مقید کر رکھا ہے۔ وہ بے شک بے انتہا بدصورت تھی---- لیکن تھی تو لڑکی۔ یقیناً اس کے سینے میں جذبات بھی ہوں گے---- لیکن یہ سب کچھ حصار کے اندر تھا----

میں نے بھی اس تک پہنچنے کا تہیہ کر لیا تھا---- اس خول میں دراڑیں ڈالنے اور اس حصار میں جھریاں بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے آج بھی اس مقصد کے لئے اسے فون کیا تھا۔

اس نے بلا جھجک میری بات مان لی تھی اور میں نے جس جگہ رک کر اس کا انتظار کرنا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ گئی تھی----

اب میں اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا---- اور ہم سرمئی سڑک پر تیزی سے جا رہے تھے۔ میں اس کے متعلق دل ہی دل میں سوچ بھی رہا تھا---- کہ یہ کیا شے ہے---- وہ مجھ سے بڑی روانی سے باتیں کرتی تھی۔ شرم و حجاب نامی کوئی شے درمیان میں نہ تھی۔ یا تو اسے اپنے آپ پر بہت زیادہ اعتماد تھا---- یا اتنی بے اعتمادی تھی اپنی بدصورتی کی وجہ سے کہ اسے احساس ہی نہ ہوتا تھا----

ہم دونوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے---- شکیل چند دنوں بعد یو کے جانے والا تھا۔ اس وقت اس کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مجھے اعتراف کرنا پڑ رہا تھا کہ ساجدہ بے حد جامع اور ٹھوس باتیں کر رہی ہے اس کی معلومات وسیع تھیں اور تجربہ بھی عمر کی حد سے تجاوز کرتا تھا----

میں اس کی باتیں سن کر چونک بھی جاتا اور حیرانگی سے اسے تکنے بھی لگتا---- اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح نہ تو وہ تصوراتی دنیا کے حسین جالوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ نہ ہی رومانی فضاؤں میں اڑنے کی عادی معلوم ہوتی تھی---- یوں لگتا تھا---- یہ چیزیں اس کی زندگی سے خارج ہیں----

لیکن

میں نے اسے اس طرف مائل کرنا تھا---- اسے چاہتوں اور محبتوں سے آشنا کرنا تھا۔

باتیں ہو رہی تھیں----

اور

وہ سٹیرنگ تھامے سامنے سڑک پر نظریں جمائے بڑے پرسکون انداز میں ڈرائیو کر رہی تھی---- میں---- ایک جوان اور خوبرو مرد---- اس کے برابر بیٹھا تھا---- لیکن وہ جیسے کسی بات سے متاثر ہی نہ تھی---- مجھے شاید جوان اور خوبرو مرد کی بجائے وہ پتھر کا بت سمجھ رہی تھی----

"آپ کو دفتر سے کوئی اطلاع ملی" اس نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔

"کس دفتر سے۔"

"ہمارے دفتر سے---- انٹرویو کے بعد۔"

"کیا اطلاع ملنا تھی---- آپ کے تو علم میں ہو گا۔"

"ہوں۔"

میں متجسس تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ خود ہی بولی---- "آپ کا تیسرا نمبر

ہے۔"

میرا دل اچھلا اور پھر ڈوب گیا---- بے اختیار میرے لبوں سے نکلا "یعنی----"

"یعنی دو آدمی آپ سے بہتر قرار دیئے گئے ہیں----" وہ بولی----

میں ایک دم مایوس ہو گیا----

اس نے میری طرف دیکھا اور آہستگی سے بولی "ایک مسٹر مسعود اشعر ہیں۔ وہ کافی سینئر آدمی ہیں۔ ان کا تجربہ بھی بہت ہے۔"

"ہوں۔"

"دوسرے اسلم قریشی ہیں۔ ان کے پاس کافی ڈگریاں ہیں اور وہ بھی پانچ سال کا تجربہ رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ابھی پوری طرح فیصلہ تو نہیں ہوا---- ڈیڈی نے یہی کہا تھا---- میری رائے پوچھی تھی۔"

میں نے جلدی سے کہا "آپ کی رائے---- ؟"

وہ مسکرائی---- اس کے پتلے پتلے ہونٹوں والا دہانہ ایک لمبی لکیر بن گیا----

وہ آہستگی سے بولی "ڈیڈی بڑے اصول پرست ہیں----"

"سفارش نہیں مانتے" میں نے خود پر قابو پا کر تیکھی نظروں کا تیر چلایا----

وہ کچھ گڑبڑا سی گئی---- آہستگی سے سر ہلایا----

میں چند لمحے چپ رہا---- وہ میرے چہرے پر مایوسی کی چھاپ دیکھ کر بولی۔

"آپ کو یقیناً صدمہ ہوا ہے----"

"کس بات کا" میں نے پینترا بدلا----

"یہ بات سن کر کہ آپ کا تیسرا نمبر ہے۔"

"اوں ہوں۔"

"واقعی۔"

"ہاں۔"

"آپ کچھ بجھ سے گئے ہیں۔"

"یہ حقیقت ہے----"

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے چہرے پر اداسی کا تاثر گہرا کرتے ہوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اپنی خوبصورت آنکھیں ڈال دیں----

اس نے جلدی سے نظریں سامنے شیشے پر جما دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے مرغی کے پنجوں ایسے ہاتھوں کی گرفت سٹیرنگ پر اک لمحہ کے لئے مضبوط ہوئی ہے۔

"سوری" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیوں۔"

"آپ کو بہتر ہوتا---- دفتر سے براہ راست اطلاع ملتی۔ مجھے آپ کو مطلع نہیں کرنا چاہئے تھا---- آپ کو یقیناً مایوسی ہوئی ہے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی گہری مصنوعی آہ بھر کر اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ ایک بار اس کی گرفت پھر سٹیرنگ پر مضبوط ہو گئی۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

میں بھی چند لمحے چپ رہا----

پھر میں نے سیٹ پر رخ بدلا---- اس کی طرف دیکھا اور بولا "مجھے یقیناً مایوسی ہوئی ہے مس ڈوگر----"

وہ پریشان سی ہوئی----

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے دکھ بھری آواز میں کہا "اس بات سے نہیں کہ مجھے یہ نوکری نہ ملے گی۔"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی---- پھر اس کے لبوں سے نکلا "تو اور----"

"صرف اس خیال سے---- کہ---- کہ----" میں نے دانستہ بات پوری نہیں کی----

اپنے اوپر دکھ اور مایوسی زیادہ سے زیادہ مسلط کر لی---- دو ایک بار اسے دیکھا اور یوں ظاہر کیا کہ بات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی----

وہ چپ رہی---- بالکل چپ۔

میں نے آہستگی سے کہا "مس ڈوگر---- مجھے یہ ملازمت حاصل کرنے کی زیادہ لگن صرف اس لئے تھی---- کہ میں---- میں آپ کا ساتھ چاہتا تھا----"

وہ تھرا گئی----

سٹیرنگ پر اس کے ہاتھ کانپ گئے۔

بے یقینی سے اس نے میری طرف دیکھا---- اس کا چھپکلی کے پیٹ ایسی رنگت والا چہرہ کلیجی رنگ کا ہو گیا---- شاید اس کے بدن کا سارا خون چہرے پر آ گیا تھا---- میں سر جھکائے بیٹھا صرف کن انکھیوں سے اس کے چہرے کے تاثرات تک رہا تھا---- اسے نارمل ہونے میں کئی لمحے لگے۔

اور

میں خوش ہوا---- کہ خول کو چٹخا ہی لیا---- میری بات یقیناً اس کے اندر کی عورت کے من میں ہلچل مچا گئی تھی۔

میں اس کھیل میں لطف لینے لگا۔ جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی۔ پھر اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ سگریٹ پی سکتا ہوں۔"

اس نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور بڑے قاتلانہ سٹائل سے سگریٹ کے کش لینے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح کش لیتے ہوئے میں بے حد پر کشش لگتا ہوں----

وہ بیچاری بری طرح نروس ہو رہی تھی---- چند لمحے وہ شیشے پر نظریں جمائے گاڑی چلاتی رہی----

پھر

میری طرف دیکھے بغیر بولی "واپس چلیں۔"

"تھک گئیں" میں نے بڑے خوبصورت انداز میں اسے دیکھا۔

"نہیں۔"

"اکتا گئیں۔"

اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا---- میں زیر لب مسکرا دیا---- حسین نگاہوں کے تیر میں اس پر مسلسل برسائے جا رہا تھا----

"آپ ڈرائیو کریں گے؟" اس نے کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا----

"بخوشی" میں خوشی سے بولا---- تیسرے نمبر پر آنے کا دکھ میرے ذہن سے نکل گیا تھا---- میں نے کامیابی ہر قیمت پر حاصل کرنا تھی۔ اس لئے بے فکر تھا۔

اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی---- پھر دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ میں کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا---- اور ہاتھ بڑھا کر دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا----

وہ میری جگہ پر بیٹھ گئی---- وہ یقیناً پر سکون نہیں تھی۔ گاڑی ٹھیک سے چلانا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ اسی لئے ڈرائیونگ کے لئے مجھے کہا تھا----

اس نے دروازہ بند کر دیا اور بولی "باہر کافی سردی ہے۔"

"سردی کے موسم میں سردی ہی ہو گی" میں نے قدرے شوخی سے اسے دیکھا۔

"وہ تو ظاہر ہے" اس نے آہستگی سے جواب دیا----

میں نے اس سے پوچھا "چلاؤں گاڑی---- یا----"

"یا---- کیا"

"کچھ دیر یہیں رکے رہیں؟"

"کیوں؟"

"اس کیوں کا تو کوئی جواز نہیں---- بعض اوقات بے معنی حرکتیں بے معنی باتیں کر کے بھی انسان کو خوشی ہوتی ہے----"

وہ چپ ہو گئی---- یوں لگتا تھا---- اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی ہے---- خود اعتمادی کا لبادہ جو وہ ہر وقت اوڑھے رہتی تھی۔ اتر چکا تھا---- وہ اب لئے دیئے بیٹھی تھی---- بے تکلفی اور بے حسی جو اس کی طبیعت کا خاصا معلوم ہوا کرتے تھے---- اب غائب تھے----

"مس ساجدہ ڈوگر صاحبہ" میں نے سگریٹ کا آخری کش لے کر باقی ٹکڑا باہر پھینک کر اس کی طرف دیکھا---- پریشان نہ ہوں۔

میں اپنے دل کی ننھی سی خواہش کے سہارے بات کر رہا تھا---- آپ نہیں چاہتیں تو لیجئے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی----

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ سیٹ پر کچھ سنبھل کر کچھ سمٹ کر بیٹھ گئی---- وہ اپنے ہاتھوں کو مسلسل مروڑ رہی تھی---- اور اس کا استخوانی وجود ہولے ہولے ہل رہا تھا----

"مس ڈوگر" میں نے اسے خاموش دیکھ کر بلایا----

"جی۔"

"ناراض تو نہیں ہو گئیں----"

وہ خاموش رہی۔ میں دل ہی دل میں ڈر گیا---- اسے ناراض کرنا تو مقصود نہ تھا---- میں بھی خاموش ہو گیا---- اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی----

چند لمحے بڑے جاں گسل گزرے---- پھر اس نے سیٹ پر پہلو بدلا---- میری طرف دیکھا---- اور بڑے اطمینان سے بولی

"مسٹر سراج---- آج آپ نے جو انداز تکلم اختیار کیا ہے----"

"جی----" میں پورے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا----

اب کے وہ گھبرائی نہیں۔ اسی انداز میں بولی "اگر تو یہ خوشامد ہے---- یعنی ملازمت حاصل کرنے کے لئے----"

"مس ڈوگر" میں نے ایک دم غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی---- وہ

ٹھٹھک گئی---- اس کے چہرے پر حیرانگی پھیل گئی----

میں نے غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا "مس ڈوگر---- ٹھیک ہے مجھے اچھی ملازمت کی ضرورت ہے لیکن میں بھوکوں نہیں مر رہا---- میرے پاس جاب ہے۔ میرے جذبات کو اگر آپ یہ رنگ دے رہی ہیں---- تو بہتر ہے۔ ہم جہاں ہیں وہیں رک جائیں۔"

میں نے جان بوجھ کر گاڑی بھی سڑک کے کنارے روک دی اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا---- آپ گاڑی لے جائیں۔ میں یہیں اتر جاتا ہوں۔"

"آپ----" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

میں باہر نکلنے سے پہلے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ صرف میری طرف تک کر رہ گئی---- اس کی نظروں میں التجا تھی---- پہلی بار مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کسی بڑے جذبے کی چمک نظر آئی----

"بیٹھیے---- اور گاڑی چلایئے" اس نے مجھ سے کہا۔

"پہلے اپنے الفاظ واپس لیجئے۔"

وہ مسکرا دی---- میں حیران سا ہوا---- پہلی دفعہ اس کے چہرے پر چھائی یہ مسکراہٹ مجھے اچھی لگی---- اور میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ جذبوں کا حسن بدصورتی پر بھی حاوی ہو جاتا ہے----

واپسی پر میں ہی ڈرائیو کرتا رہا---- آج کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے پھر اس سے ایسی کوئی بات نہ کی---- ہاں گاڑی چلاتے ہوئے میں بڑے سرشار لہجے میں کوئی شعر بار بار گنگناتا رہا----

اس کے گھر کے قریب آ کر میں نے پھر اس سے سیٹ بدلی---- اس نے مجھے لبرٹی کے کونے پر اتار دیا----

"شکریہ" میں نے اس کی آنکھوں میں مسکراتی ہوئی نظریں ڈالیں۔

وہ جھینپ گئی---- لیکن مسکراہٹ نہ چھپا سکی---- خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی۔

اور

مجھے یقین ہو گیا کہ آج وہ میرے لئے اپنے ڈیڈی سے یہ ملازمت ضرور چھین لے گی۔

○ ☆ ○

"ہرا۔"

میں نے خط پڑھتے ہی دونوں بازو اوپر اٹھاتے ہوئے خوشی سی زور دار نعرہ مارا۔

اماں لپک کر باورچی خانے سے باہر آئیں۔ مجو اور ناجا کمرے میں بیٹھے سکول کا کام کر رہے تھے۔ میرے نعرہ مستانہ پر باہر دوڑے۔ زوبی اوپر تھی۔ جنگلے سے آدھا دھڑ لٹکاتے ہوئے بولی

"کیا ہوا۔"

میں نے امی کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر انہیں دائرے کی صورت میں گھما لیا۔

"اے ہے۔ بتا تو سہی کیا ہوا---- امی اپنا آپ چھڑاتے ہوئے بولیں۔

"امی---- امی---- وہ ہو گیا---- جو شاید کبھی نہ ہو سکتا" میں نے خط ان کی آنکھوں کے آگے نچاتے ہوئے خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے کہا۔

"میں کیا پڑھوں گی انگریزی کا خط ہے۔ بتا دے---- نا---- کس کا خط ہے۔ جو خوشی سے باؤلا ہوا جا رہا ہے؟

"امی---- میری پیاری پیاری امی" میں نے امی کی ٹھوڑی کو چھو کر بڑے پیار سے کہا "مجھے نوکری مل گئی ہے----"

"نوکری----" امی کچھ نہ سمجھیں۔

"ہاں امی----؟۔"

"پہلے نہیں تھی نوکری۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مجو بولا---- اچھا اچھا بھائی جان وہ نوکری ملی ہے جس کا انٹرویو دیا تھا----"

"ہاں مجو---- مزے ہو گئے سب کے۔"

"مجھے بھی کچھ بتانا----" امی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ مسکراتے ہوئے صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئیں----

میں امی کے قریب جا بیٹھا---- خط دوبارہ پڑھا---- اماں تجسس اور شوق سے خط سننے کی

منتظر تھیں۔۔۔۔

"آج کیا دن ہے" میں نے پوچھا۔۔۔۔

"اتوار" امی بولیں۔ مجو اور ناجا میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ زوبی بھی جلدی سیڑھیاں اتر کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔۔۔۔

"وہی نوکری مل گئی" اس نے شوق سے پوچھا۔

"ہاں زوبو۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ جس کا انٹرویو دیا تھا۔۔۔۔"

"اللہ" وہ جیسے خوشی سے پاگل ہو اٹھی" سچ مچ اتنی بہت ساری تنخواہ ملے گی آپ کو۔۔۔۔ اور گاڑی۔۔۔۔ اور بنگلہ۔۔۔۔"

امی حیرانگی سے کبھی مجھے اور کبھی زوبی کو تکنے لگیں۔۔۔۔

میں خوشی سے بہک رہا تھا امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "امی اب سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔۔۔۔ خوش ہو جا میری ماں۔۔۔۔ کہ تیرے پوت نے بہت بڑا معرکہ مار لیا۔۔۔۔"

امی نے میری پیشانی چوم لی۔ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولیں "اللہ تجھے زندگی دے۔۔۔۔ اور قدم قدم پر کامیابی تیرے قدم چومے میری تو ہر وقت یہی دعا ہے بیٹے۔"

"سب آپ کی دعاؤں کا اثر ہے امی۔۔۔۔" میں کچھ کچھ اپنے آپ میں آیا۔۔۔۔ "ورنہ یہ نوکری۔۔۔۔ سوچ بھی سکتا تھا کبھی میں۔۔۔۔"

زوبی خوش ہو رہی تھی بولی "ہاں بھائی جان مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا۔۔۔۔ اتنی ہی تنخواہ ملے گی نا۔۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ اتنی ہی جتنی تمہیں بتائی تھی" میں بولا۔۔۔۔

"کتنی بھائی جان" مجو نے پوچھا۔۔۔۔

"جتنی اب لے رہا ہوں نا۔۔۔۔" میں نے مجو کو سمجھایا۔ "اس سے دس گنا زیادہ۔"

"دس گنا؟" زوبی کی آنکھیں کھل گئیں۔ امی بھی حیرت سے میرا منہ تکنے لگیں۔

"ہاں" میں نے کہا۔

مجو تو خوشی سے ناچنے لگا۔۔۔۔ امی نے جھولی پھیلا کر نیلے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔۔۔۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

"صرف تنخواہ ہی نہیں۔۔۔۔" میں بولا۔۔۔۔ "تین چار ماہ بعد گاڑی بھی ملے گی۔۔۔۔"

"سچ" زوبی نے خوشی سے آنکھیں میچ لیں۔

امی بولیں "اللہ نظر بد سے بچائے"

میں سرشار تھا۔۔۔۔ بہکتے ہوئے بولا۔۔۔۔ "پھر ایک سال بعد بنگلہ بھی ملے گی۔"

امی نہال ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔۔ بار بار اس کے لبوں پر شکرانے کے الفاظ آ رہے تھے۔

"میرے مولا یہ تیری نوازش ہے۔۔۔۔ ورنہ ہم کس قابل تھے؟" وہ بڑبڑائیں۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

میں نے یہ آنسو اپنی انگلیوں سے پونچھ ڈالے "اماں۔ اب میں آپ کو کبھی اداس نہ دیکھوں۔"

امی آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں "خدا تجھے شاد آباد رکھے بیٹے۔۔۔۔ بعض اوقات خوشیاں ہمارے ظرف سے بڑھ جاتی ہیں نا۔۔۔۔؟

میں چند منٹ اپنے بھائی بہن اور امی سے باتیں کرتا رہا۔۔۔۔

پھر خط ہاتھ میں لیے لیے اٹھا۔۔۔۔

"کہاں" زوبی نے پوچھا۔۔۔۔

"زیبی کو خوشخبری نہ سناؤں" میں نے کہا۔۔۔۔

"ضرور سناؤ۔۔۔۔ ضرور سناؤ بیٹے۔۔۔۔ یہ تو اسی کی قسمت نے یاوری کی ہے۔ جاؤ جا کر سناؤ اسے خوشخبری۔۔۔۔"

میں کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی بالوں میں کنگھی کی۔۔۔۔ اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

امی شکرانے کے نوافل پڑھنے کے لئے وضو کرنے لگیں۔

میں صحن عبور کر کے ڈیوڑھی کی طرف لپکا۔۔۔۔ اور پھر میرے قدم غیر معمولی تیزی سے زیبی کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔

گلی میں لوگ آ جا رہے تھے لیکن میں تو جیسے سب سے بے خبر تھا۔ ماسی رحمتے نے مجھے یوں تیزی سے جاتے دیکھا تو ناک پر انگلی رکھ کر بولی! کیوں راجے خیر تو ہے۔۔۔۔ دعا نہ سلام۔۔۔۔ بھاگا جا رہا ہے۔"

میں نے سلیوٹ کے انداز میں سلام مارا "خوش ماسی۔" "جیتے رہو۔"

میں آگے بڑھ گیا۔۔۔۔ سامنے سے ماسٹر غلام حسین چلے آ رہے تھے۔ میں رکنا نہیں چاہتا تھا لیکن سلام کرنا پڑا۔

"کیا حال ہے بیٹے" انہوں نے شفقت سے پوچھا۔۔۔۔ وہ بڑے باتونی تھے۔۔۔۔ جہاں کہیں پکڑ بیٹھتے تو چھوڑنے کا نام نہ لیتے۔

میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا "ماسٹر جی۔۔۔۔ شکر ہے اللہ کا سب ٹھیک ہے۔ میں ذرا عجلت میں ہوں۔ پھپھو کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"کوئی کام ہے۔"

"جی---- جی؟"

میں جان چھڑا کر بھاگا اور زیبی کے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا---- سردی کافی تھی۔ میرا خیال تھا زیبی اوپر والی منزل پر ہو گی---- یہ لوگ سارا دن اسی منزل پر گزارتے تھے---- رات کو سونے کے لئے نچلی منزل میں آیا کرتے تھے۔ ابھی تو شام بھی نہ اتری تھی۔ اس لئے میں نے سیدھا سیڑھیوں کا رخ کیا۔

آہٹ سن کر زیبی نچلے کمرے سے نکل آئی "کون؟" اس نے پوچھا۔

"میں" میں جو تین چار سیڑھیاں پھلانگ چکا تھا---- کود کر واپس آیا۔ زیبی صحن میں کھڑی تھی۔ اس نے اورنج کپڑوں پر سیاہ سویٹر پہن رکھی تھی---- سیاہ شال بازو پر لٹکائے ہوئے تھی----

"زیبی" میں نے یہاں بھی اک زوردار قہقہہ لگایا----

زیبی ان دنوں مجھ سے زیادہ ہی شرماتی لجاتی تھی---- مجھے دیکھا تو جلدی سے شال کھول کر اوپر لینے لگی۔

لیکن

میں نے اک چھلانگ لگائی اور اس تک پہنچ گیا۔

"زیبی---- زیبی---- ایک بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں۔" میں نے بلاجھجک اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔

وہ میری حرکت سے گھبرا گئی---- چہرہ کانوں کی لووں تک سرخ ہو گیا۔ خوبصورت آنکھوں میں حیا کی سرخی دوڑ گئی----

"ہائے چھوڑو نا---- کیا ہوا ہے تمہیں" وہ بولی۔

لیکن

میں نے چھوڑنے کی بجائے اسے بازوؤں میں بھر لیا---- گرد و پیش کا مجھے ہوش ہی کب تھا۔ میں نے اسے سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے کہا "زیبی مجھے وہ نوکری مل گئی ہے---- وہ جس کے متعلق تمہیں بتایا تھا۔"

"وہ---- سچی؟" اک لحہ کو زیبی بھی جیسے اردگرد سے بے خبر ہو گئی----

"ہاں" میں نے کہا----

"واقعی" وہ ہمہ سپردگی تھی۔

"ہاں ہاں---- یہ دیکھو آج ہی خط آیا ہے" میں نے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ پھر میں نے خط جیب سے نکالا---- وہ مجھ سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی----

میں نے اسے خط پڑھ کر سنایا----

وہ خوش تھی۔ اتنی خوش کہ اس کا چہرہ چاند کی طرح دمکنے لگا میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

وہ شرما گئی---- اور لحہ بھر پہلے جو میں اسے بازوؤں میں دبوچ چکا تھا۔ اس کا احساس اسے اب ہوا---- اس کا چہرہ گلگوں ہو گیا۔

کتنی حسین کتنی دلکش لگ رہی تھی' اس لحہ---- میں شوخی سے پھر اس کی طرف لپکا----

لیکن

اس نے دونوں ہاتھوں پر ہی مجھ روک لیا---- خوشیوں سے میں پہلے ہی باؤلا ہو رہا تھا۔ یہ لطیف سی چھیڑ چھاڑ لطف و انبساط کی انتہاؤں کو چھو گئی---- میں سرشار سرشار وہاں سے واپس آیا----

یہ خوشخبری شکیل کو بھی سنانا تھی---- میں شکیل کے ہاں جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

وہاں بھی ردعمل یہی تھا----

ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے رہے۔

"مار لیا نا میدان" شکیل نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔"

"گرو مان لو ہمیں۔ کیسی راہ دکھائی۔ ہو گیا نا ثابت کہ مس ڈوگر زینہ ہے زینہ----"

"ہاں---- اس ملازمت کے حصول کے لئے تو وہی زینہ ثابت ہوئی۔"

"میرے یار---- آئندہ کامیابیوں کے لئے بھی وہ زینہ ہی ثابت ہو گی---- بس ڈٹے رہنا۔"

اس نے کھلکھلا کر قہقہہ لگایا---- میں نے بھی اس قہقہے میں اپنا قہقہہ شامل کر دیا۔ دیر تک ہم دونوں اکٹھے رہے۔

○ ☆ ○

میں نے سوچا ساجدہ زوگر کا شکریہ ادا کیا جائے۔ یہ ملازمت اسی نے دلوائی تھی۔ میں تیسرے نمبر پر تھا لیکن جاب مجھے مل گئی تھی۔ یہ سب اس دن کا کرشمہ تھا۔ جب میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ساجدہ پر اپنی چاہت کا انکشاف کیا تھا----

میں شکیل کے ہاں گیا---- وہ باتھ روم میں تھا۔ میں لابی میں آکر بیٹھ گیا---- آج چھٹی تھی۔ اس کی ممی گھر کے کاموں میں مصروف تھیں۔ مجھے اخبار دے کر وہ اوپر چلی گئی تھیں۔

چند لمحے اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں دیکھیں۔ پھر سامنے پڑے فون کو دیکھ کر ساجدہ سے بات کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا خیال آگیا۔

میں نے فون سٹینڈ پر سے اٹھایا اور صوفے پر اپنے قریب رکھ لیا۔ ساجدہ کا نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نمبر ڈائیل کرنے لگا۔

فون انگیج تھا۔

میں نے دوسری اور تیسری بار نمبر ڈائیل کیا۔ فون انگیج ہی ملا۔ میں نے فون رکھ دیا۔

چند منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے پھر نمبر ڈائیل کیا۔ گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

نمبر مل گیا تھا---- میں ساجدہ سے بات کرنے کے لئے الفاظ وضع کرنے لگا۔

"ہیلو" ادھر سے ساجدہ کی بے ہنگم آواز آئی---- اتفاق سے فون کسی نوکر کی بجائے اسی نے اٹھایا تھا۔

"ہیلو" میں خوش دلی سے بولا---- خوش تو میں تھا ہی---- ساجدہ سے چہلیں کرنا چاہتا تھا----

"آپ----" وہ بولی۔

"کون ہوں بھلا۔"

"راج۔"

"آواز پہچان لی۔"

"انداز پہچان لیا۔"

"اوہ---- جیو----"

وہ ہنس پڑی

"بڑی ذہین ہیں آپ" میں نے ہنسی کی آواز سن کر کہا۔

"کیسے۔"

"انداز پہچان لیے۔"

"ہوں۔"

"یہ ذہانت کی علامت ہے۔"

"جو لوگ حسین نہیں ہوتے انہیں ذہین ضرور ہونا چاہئے۔"

"مار ڈالا----"

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔"

"بڑے چہک رہے ہیں۔"

"بہت خوش ہوں۔"

"خوشی کی بات---- ؟"

"پوچھیں تو سہی----۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہیں؟"

"جاب مل گئی نا---- ؟"

"شکریہ---- لیکن میری خوشیاں صرف جاب کے گرد ہی نہیں گھومتیں۔"

"بے نیازی کا یہ عالم ہے۔"

"بالکل۔ مل گئی---- اچھی بات نہ ملتی فکر نہ تھی---- افسوس ضرور ہوتا۔"

"بہت باتیں بنانا آتی ہیں۔"

"مجھے۔"

"جی ہاں۔"

"سنجیدہ بھی ہوتے ہیں۔ یا بات برائے بات کرتے ہیں۔"

"ساجدہ----"

میرے تحکمانہ انداز سے وہ شاید ڈر گئی---- جلدی سے گھبرائی گھبرائی بولی:

"میرا مطلب تھا----"

"میں تمہارا مطلب نہیں جاننا چاہتا----" میں بے تکلفی سے آپ کی بجائے اسے تم پکارنے لگا۔ مس ڈوگر کا تکلف بھی چھوڑ کر اسے ساجدہ کہا۔

"تو----" وہ نروس سی تھی۔

"آج شام میرے ساتھ چائے پی سکتی ہو۔"

"آج شام۔"

"ہاں۔"

"کسی خوشی میں؟۔"

"جاب کی خوشی میں۔ تمہارا شکریہ ادا کرنا ہے۔"

"میرا شکریہ آپ اس طرح ادا کریں کہ اپنے کام سے ڈیڈی کو مطمئن کر دیں۔"

"یہ بعد کی بات ہے۔ میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ تمہیں تمہارے ڈیڈی کے سامنے میری وجہ سے کبھی شرمندہ نہ ہونا پڑے گا----"

"شکریہ۔"

"تو پھر آئیں آج شام۔"

"کہاں؟"

"جہاں کہو۔"

"شیزان۔"

"چلو شیزان ہی سہی---- ویسے مجھے ہلٹن پسند تھا۔"

"آپ کی مرضی وہیں آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ساڑھے چار۔"

"او کے۔"

"رات کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔"

"نہ بھئی---- ڈیڈی اتنی کھلی چھٹی نہیں دیں گے۔"

"جب تمبولا کے لئے جاتی ہو----"

"ماما، کو بتا کر جاتی ہوں۔"

"انہیں بھی بتا آنا----"

"بضد ہوں۔"

وہ ہنسی اور آہستگی سے بولی "خدا خیر کرے۔"

"کیوں؟"

"آپ جو اتنے ضدی ہیں۔"

"اپنی بات الٹی ہو سیدھی ہو منوا کر رہتا ہوں۔"

"بری بات۔"

"ناں---- ہی۔"

وہ میری بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پہلی دفعہ اس کی ہنسی میں مجھے زندگی محسوس ہوئی----

"میں ٹھیک ساڑھے چار بجے تمہارا انتظار کروں گا---- ہلٹن کے گیٹ پر۔"

"آ جاؤں گی۔"

"شکریہ۔"

"ہو سکے تو رات کھانے کا بھی ڈیڈی کو کہہ آنا----"

"دیکھوں گی---- آج چھٹی ہے اور ڈیڈی گھر پہ ہی ہیں۔ پوچھ لوں گی۔"

"اوہ---- جیو----" میں نے ہنس کر کہا---- وہ بھی ہنس پڑی----

چند ادھر ادھر کی بے مقصد اور بے معنی باتوں سے میں نے اسے خوب رجھالیا تو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا----

شکیل تیار ہو کر لابی میں آ گیا تھا---- مجھے فون رکھتے دیکھا تو پوچھا "مس ڈوگر سے باتیں ہو رہی ہوں گی۔"

"اور کسے فون کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ ادا کیا۔"

"ہاں----"

"بس اس سے بنائے رکھنا یار---- بہت کچھ پا لو گے۔"

"خیال برا نہیں----"

"رحمان کی کمزوری ہے یہ لڑکی----"

"تبھی تو ملازمت مل گئی یہ---- ورنہ دو سینئر آدمی تھے۔"

شکیل اور میں باتیں کرنے لگے----

شکیل کو میں نے یہ نہیں بتایا کہ مس ڈوگر کو آج شام چائے پر مدعو کیا ہے۔ جانے کیوں میں اس سے اب اکیلے ہی ملنا چاہتا تھا۔

"ملازمت کی خوشی میں کوئی چائے وائے نہیں پلاؤ گے؟" شکیل نے ہنس کر کہا----

"ابھی چلو۔"

"ابھی نہیں۔ شام کا پروگرام بناؤ---- رینا باجی بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گی نہ آفاق بھائی---- سچی وہ دونوں تو اتنے خوش ہوئے کہ کیا بتاؤں۔"

"یہ سب تم لوگوں کی شفقت اور محبت ہے شکیل---- چائے کیا چلو کسی دن کھانا کھائیں گے سب---- لیکن آج شام نہیں۔"

"کیوں؟"

"گھر میں کام ہے۔"

شکیل نے کہا "چلو کسی اور دن سہی۔"

میں نے سیٹرڈے نائٹ کھانے کا کہہ دیا---- کسی اچھے سے ہوٹل میں اس سب کو کھانا کھلانے کا میں نے ارادہ کر لیا۔

"اوکے" شکیل ہنسا "اب تو تم سے زبردستی بھی ٹریٹ لے سکتے ہیں۔ اتنی زیادہ تنخواہ پاؤ گے۔"

"بس---- میں تو خود بھی قسمت کے اس پلٹے پر حیران ہوتا ہوں۔"

"خدا مبارک کرے۔"

"آمین----"

ملازم چائے اور بسکٹ لے آیا۔ میں اور شکیل دونوں چائے پینے لگے۔ چائے کی ایک پیالی ملازم اس کی ممی کے لئے اوپر لے گیا۔

شام چار بجے میں گھر سے خوب بن ٹھن کر نکلا۔ ورسٹڈ کی پتلون کے ساتھ گرے سویٹر جو زیبی نے اپنے ہاتھوں سے بن کر دی تھی پہنی۔ چونکہ رات تک باہر رہنا تھا۔ اس لئے لنڈے سے خریدا ہوا ٹویڈ کا کوٹ بھی پہن لیا----

ساڑھے چار بجے میں ہوٹل کے بیرونی گیٹ پر کھڑا ساجدہ کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے سچ مچ ہی اس کا انتظار ہو----

وہ دو تین منٹ بعد آن پہنچی---- گاڑی گیٹ کے قریب لاتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے ایک مسکراتی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"ہیلو" میں اس کی طرف بڑھا----

"ہیلو" اس نے گاڑی آہستہ کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا---- میں اس کے برابر آ بیٹھا---- وہ گاڑی پارکنگ لاٹ کی طرف لے آئی۔

میں نے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی---- آج جانے کیوں وہ کچھ کچھ اچھی لگ رہی تھی----

شاید میری نظریں اب اس کے بھونڈے پن کی عادی ہو گئی تھیں---- یا اس کی ذہانت کا میں لاشعوری طور پر قائل ہو گیا تھا کہ ظاہری شکل و صورت پر توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

اس نے گاڑی پارک کی۔ میں گاڑی سے نکل آیا۔ وہ گاڑی بند کر کے باہر آ گئی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے برآمدے میں آئے---- اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ ویسے باہر گاڑیوں کی تعداد کافی تھی۔

ہم شیشے کے بڑے دروازے کو کھول کر اندر آئے۔ مغلیہ طرز کے دربان نے ہمیں خوش آمدید کہا---- آج بھی اس کی نگاہوں میں مسکراہٹ چھپی تھی---- چند دن پہلے بھی ہم یہاں چائے پینے آئے تھے---- یقیناً وہ ہمیں پہچان گیا تھا----

ساجدہ نے آج بڑی خوبصورت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ساڑھی کی مناسبت سے ہلکے نیلے رنگ کا سویٹر پہنا ہوا تھا---- ساڑھی اس کے دبلے پتلے اور بغیر نشیب و فراز کے جسم پر یوں لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے کسی تختے پر کپڑا لپیٹ دیا گیا ہو---- اس کے جسم میں لوچ بھی تو نہیں تھا۔ لکڑی کی طرح سخت اور اکڑا ہوا تھا۔ گرم شال بھی بے انتہا خوبصورت اور قیمتی تھی لیکن اس کے کندھوں پر کسی طور بجتی نہ تھی---- یہ شال زیبی نے اوڑھی ہوئی ہوتی تو---- کیا کہنے۔

میں ذہن میں زیبی اور ساجدہ کا موازنہ کر رہا تھا۔ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہو رہا تھا۔ زیبی جیسی ریشمی لڑکی کے سامنے ساجدہ کوراکھدر لگتی تھی----

ہم دونوں لاؤنج سے گزرے اور سامنے والے پورشن میں چلے گئے۔ کرسیوں پر کچھ لوگ براجمان تھے---- غیر ملکی جوڑے بھی بیٹھے ہوئے تھے اور کزنوں منگیتروں اور دوستوں کے ساتھ آئے لوگ بھی---- میں ساجدہ کو لے کر آگے بڑھا اور ایک کونے میں پڑی میز کی طرف آ گیا۔ یہاں نسبتاً تنہائی تھی----

ہم دونوں میز کے کناروں پر بیٹھ گئے----

میں نے ایک بھرپور مسکراتی نگاہ ساجدہ پر ڈالی۔

وہ قدرے مجوب انداز میں بولی "مبارک ہو۔"

مجھے اس کے مجوب پر ہنسی آ رہی تھی بمشکل روکتے ہوئے بولا "شکریہ---- ویسے مبارک کی مستحق آپ ہیں---- آپ نے میرے لئے بہت بڑا کام کیا۔"

وہ کچھ کچھ سرخ ہو گئی---- پھر بولی "ہاں---- ڈیڈی رضامند نہیں تھے۔ لیکن میں نے انہیں قائل کر ہی لیا----"

"میری طرفداری کی۔"

"کرنا پڑی۔"

"کیوں؟"

میں نے شوخی سے اپنی خوبصورت آنکھیں اس پر گاڑ دیں۔ وہ شرما گئی----- مجھے جانے کیوں ہنسی آئے جا رہی تھی-----

چند لمحے ہم دونوں چپ رہے وہ اپنی پلکیں جھپک جھپک کر مجھے دیکھ رہی تھی اور میں نگاہوں میں دنیا بھر کی دلچسپی اور شوخی سمیٹے اسے تک رہا تھا-----

اس وقت میں کتنا منافق تھا-----

بیرہ مینو بک لے آیا-----

"کیا پینا پسند کریں گے" میں نے ساجدہ سے پوچھا۔

"کچھ منگوالیں۔"

"چائے یا کافی۔"

"چائے۔"

"ساتھ۔"

"اپنی پسند کی چیز منگوالیں۔"

"میری پسند کی چیز ضروری نہیں آپ کو بھی پسند ہو۔"

"ہو گی-----"

"یہ بات-----"

میں نے پھر شوخی سے اس کی طرف دیکھا----- وہ زیر لب مسکرا دی۔

میں نے دو تین چیزوں کا آرڈر دے کر مینو بک میز کے سرے پر رکھ دی۔ بیرہ آرڈر لے کر چلا گیا۔

اور

میں ساجدہ سے محبت کی ساختہ پینگیں بڑھانے لگا۔

چائے آ گئی۔

میں نے دو پیالیوں میں چائے بنائی۔ ایک ساجدہ کے سامنے رکھ دی دوسری اپنے----- ہم دونوں چائے پینے لگے۔

"رات کا کھانا کہاں کھائیں" میں نے اس سے پوچھا۔

"سوری راج، میں رک نہ سکوں گی۔"

"کیوں؟"

"ڈیڈی گھر پہ اکیلے ہیں اور چھٹی کے دن ہم کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔"

میں کچھ بجھ سا گیا----- اس دلچسپ کھیل میں اب مجھے بڑا لطف ملتا تھا----- میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

میں خاموشی سے چائے پینے لگا----- وہ میری طرف گاہے گاہے پوری آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے تکتی رہی۔

"ناراض ہو گئے" اس نے بالآخر پوچھا۔

میں نے ایک ناراض نگاہ اس پر ڈالی----- اور روٹھے روٹھے لہجے میں بولا "ناراض ہونے کا حق مجھے کہاں سے ملا-----"

"اوہ----- راج----- پلیز-----" وہ پیالی واپس رکھتے ہوئے بولی "کل سہی میں کل رات آپ کے ساتھ کھانا کھا لوں گی-----"

میں روٹھا روٹھا بیٹھا رہا----- بیرہ "کچھ اور چاہئے" کہنے آیا تو میں نے کہا "بل لاؤ۔"

ساجدہ میرا منہ تکنے لگی-----

ہم کافی دیر یہیں بیٹھ سکتے تھے----- لیکن میں نے بل منگوا لیا تھا۔

بل ادا کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی اٹھی۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے باہر آ گئے۔ میں کن انکھیوں سے ساجدہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

وہ خاصی اداس ہو گئی تھی۔ یہ اداسی اس کے چہرے کو بڑا بھیانک بنا رہی تھی----- میں من ہی من میں اپنی کامیابی پر مسکرا رہا تھا----- آخر اسے میں نے پھانس ہی لیا تھا-----

برآمدہ طے کر کے ہم گاڑی کی طرف آئے۔ اس نے گاڑی کھولی اور پھر فرنٹ سیٹ کا دوسرا دروازہ میرے لئے کھول دیا۔

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کھڑکی میں جھک کر کہا "شکریہ مس ڈوگر----- میں خود چلا جاؤں گا----- آپ جائیے-----"

میری اس بات نے جیسے اس کی جان پر بنا دی----- بے حد دکھے اور اداس لہجے میں بولی:

"بیٹھئے تو سہی-----"

"نہیں۔"

"راج-----"

"ہوں۔"

"پلیز بیٹھیے۔"

"میں چلا جاؤں گا---- آپ زحمت نہ کریں۔"

"کچھ دیر کے لئے تو آیئے نا---- ابھی کافی وقت ہے۔ ہم تھوڑی سی ڈرائیو کر سکتے ہیں۔"

"ضرورت کیا ہے----"

"ہے نا۔"

میں نے اسے زیادہ الجھانا مناسب نہ سمجھا---- خاموش منہ بنائے کھڑا رہا---- اس نے خود ہی بڑھ کر دروازہ کھولا---- اور میں سیٹ پر بیٹھ گیا----

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی "بڑی جلدی ناراض ہو جاتے ہیں آپ۔"

"ناراض نہ ہوؤں تو کیا کروں۔ کتنی چاہت سے آپ کو روک رہا تھا لیکن آپ۔"

میں نے دیکھا وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ گاڑی ہوٹل کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئی---- وہ خاموشی سے گاڑی چلاتی گئی۔ میں بھی چپ رہا۔

پھر

خاموشی کو اس نے خود ہی توڑا---- بڑے گمبھیر لہجے میں بولی "راج میں جو کچھ ہوں---- اچھی طرح جانتی ہوں----"

میں ایکٹنگ بھول بھال کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آواز میں دل چیرنے والا دکھ تھا----

وہ دکھ سے مسکرائی---- میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بولی "میں اس بات میں یقین ہی نہیں رکھتی کہ کوئی مرد میرے لئے محبت کے جذبات دل میں رکھتا ہے---- ایسا بے وقوف کوئی نہیں ہو سکتا----"

میں گڑبڑا سا گیا---- اس وقت وہ مجھے بے حد مظلوم لگ رہی تھی اور مظلوم پر پیار آ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ میرا دل جذبہ ہمدردی سے بھر گیا۔

بے اختیارانہ میرے لبوں سے نکلا "ایسا بے وقوف اک ہے۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں مسکرا دیا---- وہ بے یقینی سے بولی "راج---- پلیز---- مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔"

ایک بار پھر مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ سچائی کا تازیانہ میرے ضمیر پر لگا تھا---- وہ خود ہی بولی۔

"میں الہڑ اور انجان لڑکی نہیں ہوں دوست---- میں نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہوں---- من آنم کہ من دانم والی بات ہے---- کافی لوگوں نے میری قریب آنے کی کوشش کی ہے لیکن جس مقصد کے لئے وہ میرے قریب آنا چاہتے تھے میں نہیں چاہوں گی راج---- کہ تمہارا مقصد

بھی وہی ہو----"

"مطلب؟"

"میرے ڈیڈی کی بے پناہ دولت۔"

"ساجدہ---- !!"

"مجھ میں کوئی کشش نہیں۔ کوئی خوبی نہیں---- کوئی اٹریکشن ہے تو صرف میرے ڈیڈی کی دولت جس کی میں تنہا وارث ہوں---- لیکن کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اسے نظرانداز کر کے محض دولت کے حصول کی کوشش کی ہو----"

"ساجدہ---- تم---- تم---- میں ہکلا گیا---- وہ تو سچائی کے نیزے لاعلمی ہی میں میرے اندر اتار رہی تھی۔

وہ دھیرے سے مسکرائی---- "سچائی کی لو کتنی حسین ہوتی ہے۔"

مجھے آج پہلی بار احساس ہوا---- وہ مجھے ان لمحات میں کوئی آفاقی شے لگ رہی تھی۔

لیکن

میں

میں بے ایمان تھا۔

منافق تھا۔

ظاہر و باطن میں فرق آ چکا تھا۔

اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں مجبور تھا۔

میں نے اپنے ضمیر کو اپنی ضرورتوں اور مجبوریوں کے بوجھ تلے کچل ڈالا---- ساجدہ کی دلجوئی کرنا ضروری تھی۔ اسے احساس دلانا تھا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں----

حالانکہ

میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔

نہیں کر سکتا تھا----

وہ خود ہی باتیں کر رہی تھی۔ آہستگی سے بولی "میں اپنے دو کزنوں کی ممنون احسان ہوں جنہوں نے سچائی سے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے نہیں میری دولت سے محبت کرتے ہیں---- وہ یقیناً ٹھوس اور عظیم کردار کے انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے دھوکہ دیا نہ اندھیرے میں رکھا----"

میں اندر ہی اندر کانپ گیا----

لیکن میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے کو چھوا---- وہ میری طرف تکنے لگی---- میں

نے اپنی نگاہوں کا سارا سحر اس پر لٹاتے ہوئے کہا "یہ تمہید ہے-----"

"ہاں۔"

"کس لئے۔"

"میں نہیں چاہتی کہ تم مجھے اندھیرے میں رکھو اور میں فریب کھا جاؤں۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔"

"ایسا ہوا----- تو میرا یہ کمزور وجود----- متحمل نہ ہو سکے گا----- نہ۔"

"ساجدہ----- مجھے تمہاری دولت کی پرواہ ہے نہ اس نوکری کی۔ جو تمہارے توسط سے ملی ہے۔"

اس نے پھر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

"آزمانا چاہتی ہو----- تو ملازمت سے انکار کر سکتا ہوں لیکن صرف ایک شرط ہو گی-----"

میں رک گیا----- اس نے میری طرف سپاٹ نظروں سے دیکھا۔ میں نے سر جھکایا----- پھر سر اٹھایا اس کی طرف مسحور کن نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "شرط صرف یہ ہے کہ تم مجھ سے اسی طرح ملتی رہو گی-----"

اس کا سارا وجود ہل گیا----- اور اس کے پنجے سٹیرنگ پر جیسے جکڑے گئے۔ گاڑی کو ہلکا سا جھٹکا بھی لگا-----

پھر وہ نارمل ہو گئی-----

ہم دونوں چند لمحے چپ بیٹھے رہے۔ ہم نے کافی ڈرائیو کر لی تھی۔

وہ بولی "واپس چلیں۔"

"کہاں؟"

"گھر۔"

"کھانا؟"

"پھر کسی دن۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ناراض نہ ہونا راج----- پھر کسی دن----- چاہو تو کل ہی سہی۔"

"ٹھیک ہے۔ کل ہم ڈنر باہر کریں گے۔ وعدہ-----؟"

"وعدہ۔"

وہ بڑی پر سکون اور خوش نظر آنے لگی تھی----- شاید اس نے میری محبت پر یقین کر لیا تھا-----

میرے دل میں اس کے لئے محبت نام کی تو کوئی شے نہ تھی۔ ہاں ہمدردی کے جذبات ضرور مچل رہے تھے----- میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ بے انتہا بدصورت ہے۔ تو اس میں اس کا کیا قصور----- وہ بلا کی ذہین ہے۔ اس کا مطالعہ وسیع ہے۔ اس کا تجربہ عمر سے کہیں آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی یہ خوبیاں کیا خوبیاں نہیں ہیں-----

○ ☆ ○

میں چند دنوں ہی میں کام سمجھ گیا۔ اپنی قابلیت اور محنت سے میں اپنے آپ کو اس جاب کا جلد از جلد اہل ثابت کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ مجھے یہ سیٹ ٹرائل بیس پر دی گئی تھی۔

میں نے دو ہفتے ہی میں اتنا کام کر ڈالا۔۔۔۔ کہ رحمان ڈوگر حیران رہ گئے۔۔۔۔ وہ میرے کام سے بے حد خوش ہوئے اور تیسرے ہفتے مجھے میری سیٹ دے دی۔ اب میرا کمرہ الگ تھا۔ جہاں بیٹھ کر میں کام کرتا تھا۔ چپراسی بھی میری خدمت کے لئے مامور ہوا اور فون بھی مل گیا۔

میں خوشی سے بہک بہک گیا۔۔۔۔ میں جانتا تھا یہ صرف میری محنت اور قابلیت ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں مس ڈوگر کی کوشش بھی شامل ہے۔ وہ میری نگاہوں کا شکار ہو چکی تھی اور اب لطف و کرم کی نوازشات مجھ پر برسنے لگی تھیں۔

میں تے اپنا مطلب نکالنا تھا۔ اس لئے مجھے اور کسی بات کا غم تھا نہ فکر۔۔۔۔ ساجدہ کو تھوڑی دیر کے لئے محبت کی رنگین و حسین وادیوں میں بھٹکا کر صلے کے طور پر نوازشات پانا کیا برا تھا۔۔۔۔

ساجدہ سے بے ایمان ہونے کے باوجود میں کام کرنے میں پورا ایماندار تھا۔۔۔۔ میں نے واقعی دن رات ایک کر دیا تھا اور یہ محنت کاروبار کے لئے ضروری تھی۔۔۔۔

ساجدہ بھی کبھی کبھی دفتر آتی تھی۔ ایک ونگ کا اکاؤنٹ وہ رکھتی تھی۔ میں نے یہ کام بھی خود ہی کرنا شروع کر دیا۔۔۔۔ جو کام وہ ہفتے میں کیا کرتی تھی میں نے دو دن میں کر ڈالا۔۔۔۔

اس دن وہ میرے کمرے میں آ گئی۔۔۔۔

"ہیلو" اس نے اندر آتے ہی خوشدلی سے کہا۔۔۔۔

"ہیلو" میں کام میں مصروف تھا۔۔۔۔ گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ جوابی ہیلو کہا اور پھر فائل پر جھک گیا۔

اسے بیٹھنے کو کہنے کا خیال ہی نہ رہا۔۔۔۔ کچھ کاغذی غلطیاں تھیں۔ جنہیں میں بمشکل ٹھیک کر رہا تھا۔۔۔۔

"اوہو۔۔۔۔" وہ چند لمحوں بعد مسکرائی۔

"ہوں" میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر شرمندہ سا ہو کر بولا "سوری میں بہت مصروف تھا۔ بیٹھو۔۔۔۔"

وہ مسکراتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئی۔۔۔۔ "تمہیں تو اردگرد کا ہوش ہی نہیں۔"

"ہے۔ میں مسکرایا" چند لمحے مجھے دے دو۔۔۔۔ "میں یہ کام ختم کر لوں۔"

"کر لو۔"

میں پھر فائلوں کے صفحات ترتیب دینے لگا۔ اکاؤنٹ کی بہت بڑی غلطی بھی میں نے پکڑ لی تھی۔ ان دنوں میں مینجر کی ہیراپھیری کے گرد ہو رہا تھا۔ ہر چیز پر اس نے خوب پیسہ بنایا تھا۔ جس سے فرم کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔

چند منٹ بعد میں نے فائلیں ایک طرف کر کے رکھ دیں۔ جیب سے سگریٹ نکالا۔ لائیٹر بھی۔۔۔۔ اب میں قیمتی برانڈ کا سگریٹ جیب میں رکھتا تھا۔۔۔۔

"اجازت" میں نے سگریٹ ہونٹوں میں رکھتے ہوئے ساجدہ کی طرف دیکھا۔

"ہر بار اجازت ضروری ہے کیا" وہ مسکرائی۔۔۔۔

"ہاں بھئی۔۔۔۔ کیا خبر مزاج میں کس وقت تبدیلی آ جائے۔۔۔۔" میں نے شوخی سے اسے دیکھا۔۔۔۔ ساجدہ نے اس دن میرا سگریٹ بجھا دیا تھا۔ جب ہم ہلٹن سے کھانا کھا کر باہر نکلے تھے۔

"اس دن کی بات کرتے ہو۔"

"کسی دن کی بھی ہو سکتی ہے۔"

"بہت تیز ہو۔"

"شکریہ۔۔۔۔ پوچھنے کی جرات کر سکتا ہوں۔ کیا تیزی دکھائی میں نے"

"ہر بات میں تیزی دکھائی ہے۔"

"مثلاً"

"مثلاً کیا بتاؤں۔۔۔۔ کیا بتاؤں۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ ہاں۔"

"راج۔"

"جی۔"

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں نا۔۔۔۔ تو خود ہی حیران ہوتی ہوں۔"

"کیا سوچتی ہو۔۔۔۔ اور کیوں حیران ہوتی ہو۔"

"تمہارے متعلق۔۔۔۔ اپنے متعلق۔۔۔۔"

"تفصیل۔۔۔۔ تفصیل سے بات کرو جی" میں نے شوخی سے کہا اور دھوئیں کے مرغولے

بناتے ہوئے کرسی میں پھیل گیا----

"چھوڑو بھئی----" وہ کچھ لجا سی گئی---- "کام ختم ہو گیا----"

"کیوں؟"

"آفس ٹائم ختم ہونے والا ہے۔"

"تم آفس ٹائم ختم ہوتے ہی چلی جاتی ہو۔"

"میرے جانے کی خوب کہی---- میں تو شغلاً یہاں آتی اور کام کرتی ہوں---- جب جی چاہتا ہے آجاتی ہوں----"

"کئی دنوں سے مسلسل آرہی ہو" میں نے شوخ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "تمہارے لئے----"

"او جیو----" میں نے شریر نظروں سے اسے دیکھا---- وہ شرما گئی----

"آج کہیں چلو گے----" اس نے چند لمحوں بعد پوچھا----

"کہاں۔"

"چائے وائے ہو جائے۔"

"ضرور----"

"کب اٹھو گے یہاں سے۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا "پانچ بج جائیں گے۔"

"ہائے اللہ---- اتنی اتنی دیر کام کرتے ہو۔"

"سارا کام چوپٹ ہے جناب----"

"سچ۔"

"ہاں۔"

"نہیں۔"

"یہ دیکھو۔"

میں منیجر اسد کی کارکردگی اسے دکھانے لگا۔ کچھ بلوں کی ہیرا پھیری میں نے پکڑی تھی----

وہ حیران رہ گئی----

"اور یہ آپ کا اکاؤنٹ جناب" میں نے اس کی فائل بھی سامنے کر دی۔ ہفتے میں ایک دو دن کام کرنے سے تو کام نہیں ہوتا نا

میں نے اس کے کچھ ادھورے اکاؤنٹ پھر سے بنائے تھے۔

وہ بڑی متاثر اور بڑی مرعوب ہوئی---- اس کی باتوں اور انداز سے میں نے اندازہ لگایا کہ

یہ میرے حق میں مفید ہو گا اور ساجدہ ڈیڈی سے میرے متعلق ضرور پرزور لفظوں میں کہے گی----

مجھے اپنی نوکری محفوظ محسوس ہونے لگی----

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی "تم پانچ بجے فارغ ہو گے۔"

"ہاں۔"

"پھر۔"

"جہاں کہو گی آجاؤں گا۔"

"باہر گھومنے پھرنے کو جی چاہ رہا تھا۔"

"اچھی بات---- یہ کام کرنا ضروری ہے۔ ورنہ میں ابھی چلتا تمہارے ساتھ----"

"خیر---- تم پانچ ساڑھے پانچ آجانا۔"

"کہاں؟"

"لبرٹی۔"

"لیکن---- ؟"

"کیا؟"

"پانچ ساڑھے پانچ تو یہاں سے اٹھوں گا۔ پھر سائیکل پر گھر پہنچتے آدھ گھنٹہ لگے گا---- تیار ہوتے اور لبرٹی پہنچتے سات بج جائیں گے۔"

میں نے دانستہ سائیکل کا ذکر کیا----

اور

وہ اسی بات پر چونکی، کچھ سوچتے ہوئے بولی "تم سائیکل پر روز آتے جاتے ہو۔"

"تو کیا موٹر پر----"

وہ چپ رہی۔

میں ہنس کر بولا "عادی ہوں میڈم---- ویسے یہ روز کا فاصلہ کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔ گاڑی تو فرم چھ ماہ بعد دے گی---- سوچتا ہوں سکوٹر ہی خرید لوں۔"

"تم فرم کا مہینوں کا کام دنوں میں کر رہے ہو تو فرم کے اصولوں میں بھی لچک پیدا ہونی چاہئے۔"

"کیا مطلب؟" میں تیر نشانے پر بٹھا چکا تھا۔ پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔

"میں ڈیڈی سے آج ہی بات کروں گی۔"

"کس بات کی۔"

تمہیں گاڑی دے دیں۔

"اوہ---- نہیں ساجدہ---- ۔"

"کیوں نہیں---- ؟"

"میں اپنا امپریشن خراب نہیں کرنا چاہتا---- ڈوگر صاحب کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں---- کہ لالچ میں فرم کا مہینوں کا کام دنوں میں نپٹا رہا ہوں۔"

"تم رہنے دو۔"

"لیکن ساجدہ۔"

"کہہ دیا نا تم اس سلسلے میں کچھ نہ کہو۔ میں جانوں اور ڈیڈی----"

"میں پھر بھی کہوں گا---- کہ----"

"پلیز چپ رہو---- یہ بتاؤ سات بجے کہاں آؤ گے۔"

"جہاں کہو----"

"کھانا آج باہر کھائیں گے۔"

"شکریہ شکریہ---- ڈیڈی سے اجازت لے لی۔"

"ڈیڈی کہیں ڈنر پہ جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک----"

وہ مجھ سے سات بجے چاتیز میں کھانا کھانے کا وعدہ لے کر چلی گئی----

میں نے فائلیں پھر اپنے سامنے کر لیں۔

میرا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

○ ☆ ○

"سر۔"

"ہوں۔"

"آپ کو رحمان صاحب بلا رہے ہیں۔"

"مجھے۔"

"جی ہاں۔"

"ابھی۔"

"ہاں جی۔"

"چلو میں آیا۔"

میں نے چپراسی کو واپس بھیج دیا۔ پھر اپنی فائلیں اسی طرح کھلی رہنے دیں۔ پیپر ویٹ اٹھا کر ان پر رکھا۔

اور سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا----

جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ رحمان مجھے گاڑی کے متعلق کچھ کہیں گے۔ کل آفس ہی میں ساجدہ سے بات ہوئی تھی اور رات کھانے پر بھی اس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی سے کہہ کر ابھی گاڑی مجھے دلوا دے گی۔ رات اس نے یقیناً ڈیڈی سے بات کی ہو گی اور اب رحمان صاحب نے اسی لئے مجھے بلایا ہو گا۔

میں نے بالوں میں جلدی جلدی کنگھی کی---- کنگھی واپس جیب میں رکھ کر میں دروازے کی طرف بڑھا----

تھوڑی ہی دیر بعد میں رحمان صاحب کے پرشکوہ آفس میں تھا ان کا آفس خاصا بڑا تھا---- کسی بڑے صنعت کار کا آفس جتنا شاندار ہونا چاہئے رحمان کا آفس اس سے بھی کچھ سوا تھا---- کمرہ گرم تھا۔

رحمان ریوالونگ چیئر پر میز کے دوسری طرف بیٹھے تھے۔ انتہر بڑی گدے دار کرسیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "بیٹھئے" میں کرسی پہ بیٹھ گیا۔

رحمان پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بولے "تمہیں میں نے ایک خاص کام کے لئے بلایا ہے۔"

"فرمایئے" میں نے مودبانہ کہا۔

وہ کچھ کہنے کو تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی---- انہوں نے فون اٹھالیا---- اور باتیں کرنے لگے۔

میں بنظر غائر ان کا آفس تکنے لگا---- ٹیک کی دیواریں۔ فرش پر قالین---- خوبصورت نرم و گداز کرسیاں---- بڑی سی آفس ٹیبل---- دیواروں پر کلاک---- قائداعظم کی بڑے خوبصورت فریم والی تصویر اور سال رواں کے کیلنڈر---- ایئرکنڈیشنز---- ہیٹر---- ایک دیوار میں سیف دوسری کے پاس لوہے کی کیبنٹ۔ میز پر تین چار فون۔ فائلیں---- پیپر ٹرے اور پیپر ویٹ پڑے تھے۔

وہ بات کرچکے تو فون رکھتے ہوئے بولے۔" نئی فیکٹری کے متعلق بات ہو رہی تھی---- تمہیں اپنا پلان بتایا تھا نا۔"

"جی۔"

"تم اسی طرح محنت اور ایمان داری سے کام کرتے رہے۔ تو نئی فیکٹری لگانے میں مجھے بڑی آسانی ہو جائے گی۔"

"سر۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں اپنا کام اس سے بھی زیادہ لگن اور محنت سے کروں گا۔"

"شاباش----"

"شکریہ۔"

"ہاں! سراج میں نے تمہیں بلایا ہے۔"

"جی!"

"تم یہاں آتے جاتے کیسے ہو۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا---- چہرہ بھی تمتمانے لگا---- وہی بات تھی نا---- میرے دل سے آواز آئی---- میں نے قدرے سہمی سی صورت بنا کر کہا "سر سائیکل پر آتا ہوں۔"

"بہت دور نہیں پڑتا۔ سائیکل پر آنا جانا مشکل ہوتا ہو گا----"

میں نے سر جھکا لیا---- بڑی مسکین سی صورت بنا کر بولا "اور چارہ بھی تو نہیں کوئی۔"

"فیکٹری کی طرف سے تمہیں چھ ماہ بعد گاڑی مل جائے گی۔"

"جی آپ کی عنایت ہے۔"

"لیکن یہ چھ ماہ----"

"کوئی بات نہیں سر---- آ ہی جاتا ہوں نا۔"

"تم----۔"

"جی۔"

"جب تک تمہارے لئے نئی گاڑی نہیں آتی۔ تم ہماری گاڑی پر آیا جایا کرو----"

میں خوشی سے اچھل پڑنے کو تھا---- لیکن اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "عنایت کا شکریہ سر۔ ویسے آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے گاڑی دے کر آپ----"

وہ مسکرائے اور بولے "میرے پاس نئی گاڑی ہے۔ ساجدہ کی اپنی گاڑی الگ ہے۔ یہ گاڑی بیچنے کے لئے رکھی ہے---- فی الحال تم استعمال کرو---- نئی گاڑی آگئی تو اسے بیچ دیں گے----"

"شکریہ سر بے حد شکریہ---- آپ نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔" میں سیٹ سے قدرے اٹھ کر بولا----

وہ مسکرائے اور خوش ہو کر بولے "میں نے تو نہیں کیا میاں---- ساجدہ نے کیا ہے تمہارا پرابلم حل----"

میں نے یوں اداکاری کی جیسے اس کے نام پر شرما گیا ہوں----

"یہ لو چابیاں" انہوں نے گاڑی کی چابیاں مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ" میں نے چابیاں لے لیں۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

"لائسنس تو تمہارے پاس نہیں ہو گا----"

"بنوا لوں گا۔"

"جلدی بنوا لینا۔"

"بہت اچھا۔"

وہ بڑے پیار سے مجھے تک رہے تھے۔ میں چند لمحے مودبانہ انداز میں بیٹھا رہا----

پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب اجازت ہے سر۔"

"ہاں۔"

میں اٹھا اور آفس سے باہر آنے کے لئے قدم بڑھایا----

"سنو" انہوں نے آواز دی۔

"جی۔"

"گاڑی گھر پہ ہے۔"

"جی اچھا۔"

"کب لینے جاؤ گے۔"

"کام ختم کر کے۔"

وہ مسکرائے اور خوشدلی سے بولے "کام تو تمہارا شام تک بھی ختم نہیں ہو گا۔۔۔۔"

میں نے تعظیم سے سر جھکایا۔

وہ بڑے پیار سے بولے "میں تمہارا ممنون و احسان ہوں راج۔

مجھے ایسے ہی ہونہار اور محنتی آدمی کی ضرورت تھی۔ مجھے ساجدہ پر فخر ہے جس کی نظر انتخاب تم پر پڑی۔۔۔۔ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔۔۔۔"

میں تعریف سن کر دل ہی دل میں پھول گیا۔۔۔۔ لیکن بظاہر انکساری کا مجسمہ بنا رہا۔۔۔۔

"شام کو گاڑی لینے آؤ۔ تو چائے ہمارے ساتھ ہی پینا" رحمان شفقت سے بولے۔

میں نے خوشی سے چائے کی دعوت قبول کر لی۔۔۔۔ اور شکریہ ادا کر کے آفس سے باہر آ گیا۔۔۔۔

ہم سب اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔ اپنی مجبوریوں کے آگے جھکے ہوئے اپنی ضرورتوں کے سامنے بے بس۔

رحمان بھی میری ہی طرح تھا۔ اپنی بدشکل بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے وہ جدوجہد کر رہا تھا۔۔۔۔ مجھ پر عنایات کی بارش بے مقصد تو نہ تھی۔ میں تو اک کایاں تھا۔ سب کچھ اچھی طرح سمجھتا تھا۔۔۔۔

میں شام ان کے ہاں جا پہنچا۔

ساجدہ اور رحمان میرا انتظار کر رہے تھے۔۔۔۔ آج چائے پر تکلف تھی۔ ہم تینوں نے بڑے بے تکلف ماحول میں چائے پی

رحمان مجھے دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے تھے اور ساجدہ کے چہرے پر بھی خوشیوں کے پرتو رقصاں تھے۔

میں گھنٹہ بھر وہاں ٹھہرا۔۔۔۔

پھر گاڑی لے کر گھر آ گیا۔۔۔۔ خوشی کی ایک لہر تھی۔ جو سارے گھر میں دوڑ گئی۔۔۔۔ امی اور زوبی کو تو یقین ہی نہ آتا تھا۔۔۔۔ کہ گاڑی میرے تصرف میں رہے گی اور چند ماہ بعد مجھے نئی گاڑی بھی مل جائے گی۔

سب خوش تھے۔

بے حد خوش۔۔۔۔

مو اور ناجو تو بھاگے بھاگے زیبی کے گھر بھی یہ خبر پہنچا آئے تھے اور رات گئے تک پھپھو جی، پھوپھا جی، زیبی، امجد اور شاہد ہمارے گھر بیٹھے رہے تھے۔۔۔۔

سب کتنے خوش تھے۔۔۔۔!

لیکن ان سب کی خوشیاں میرے ضمیر پر بار بن رہی تھیں۔ اس رات جب میں نے سونا چاہا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اپنے آپ کا جائزہ لے رہا تھا۔۔۔۔ جو قدم اٹھ رہے تھے۔ کیا میں اٹھانے میں حق بجانب تھا؟

اپنے مفاد کے لئے

اپنی ضرورت کے لئے

میں ایک معصوم لڑکی کا اعتماد لوٹ رہا تھا۔

میں دھوکہ باز تھا۔ فریبی تھا۔۔۔۔ بے ایمان اور منافق تھا

میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا تھا۔۔۔۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔۔۔۔ نیند غائب تھی اور میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔۔۔۔

ایک بج گیا۔

پھر۔۔۔۔

دو بجے۔

گھڑی کی سوئیاں تین پر آ گئیں۔۔۔۔

میری بے خواب آنکھیں جل رہی تھیں۔۔۔۔ میں مسلسل ساجدہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔۔۔۔

ساجدہ

جو ایک بدصورت اور کریہہ المنظر خول میں بند خوبصورت روح تھی۔۔۔۔ جو احساس کمتری کا شکار ایسا وجود تھی۔۔۔۔ جس کے اندر ایک بھرپور عورت تھی۔

میں اداکاری کرتے کرتے ساجدہ کو بڑی نازک حدود تک لے آیا تھا۔ میں نے اس کے گرد اٹھے خول کو چٹخا دیا تھا۔ اس کے اندر کی حساس لڑکی کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔

اندر کی حساس لڑکی۔

جو زندگی کی رعنائیوں اور حسن میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔ جو ایک مرد کی محبت اور چاہت کے لئے تڑپ رہی تھی۔ جو گھر چاہتی تھی۔ شوہر چاہتی تھی۔ بچے چاہتی تھی۔

ایک معصوم لڑکی کے اندر کی حساس دنیا میں ہلچل مچا دینا۔ اسے دھوکے سے بیدار کر دینا شاید دنیا کا سب سے بڑا جرم تھا۔ اس سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔۔

احساس گناہ سے میرا وجود کانپنے لگا تھا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔۔۔۔ خوف خدا سے میرا رواں رواں لرز رہا تھا۔۔۔۔

لیکن

میں نے زبردستی اپنی سوچوں کا رخ بدلا---- سوچ کے زاویئے بدل گئے---- تو ذہن کی آگ بھی کچھ سرد ہونے لگی۔ میں نے بڑی ڈھٹائی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیا---- ضمیر سے آنکھیں پھیرلیں---- اور جو کچھ میں کر رہا تھا اس میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کی پوری کوشش کرنے لگا۔

نیند لانے کے لئے میں نے ویلیم کی گولیاں کھائیں۔

پھر

میں بے خبر سو گیا۔

○ ☆ ○

گیٹ سے ڈرائیو وے پر گاڑی لاتے ہی میں نے ہارن کیا۔ اور پھر مسلسل ہارن کئے گیا۔

شکیل لان ہی میں تھا---- مسلسل ہارن سے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا اور گاڑی کا سرپرائز دینا مقصود تھا---- میں سراپا مسکراہٹ تھا۔

شکیل کے ہاں شاید کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ جو ابھی ابھی اٹھ کر گئے تھے---- میری گاڑی گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی نیلے رنگ کی گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تھی۔

لان چیئرز بے ترتیب سی پڑی تھیں۔ چائے کے برتن اور پھل ڈرائے فروٹ اور بسکٹ وغیرہ میزوں پر پڑے تھے۔ پلیٹوں کے علاوہ کچھ چھلکے گھاس پر بھی گرے پڑے تھے۔

دھوپ اس وقت بڑی رسیلی تھی۔ سہ پہر ہو رہی تھی۔ شکیل اپنے مہمانوں کو دھوپ کی زد میں اسی لیے لے بیٹھا ہو گا کہ دھوپ بڑی رسیلی تھی۔

ہارن اور پھر مسلسل ہارن کی آواز پر شکیل نے پلٹ کر دیکھا پہلے شاید گاڑی ہی کو دیکھا۔ کیونکہ گھبراہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا سمجھا ہو گا کوئی مہمان آگئے ہیں---- لان چیئرز اور کھانے پینے کی چیزوں کی بے ترتیبی اور مہمان---- اسی لیے چونکا ہو گا۔

لیکن

جب مجھ پر نظر پڑی---- تو مسکراتا ہوا میری طرف آگیا۔

میں بڑے ٹھاٹھ سے گاڑی میں بیٹھا تھا۔

"آؤ" اس نے تپاک سے قریب آتے ہوئے کہا---- مجھے غصہ آیا۔ "عجیب انسان ہو" میں بولا۔

"کیوں۔"

"پوچھا تک نہیں۔ کہ مابدولت گاڑی میں کیسے آئے ہیں۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا "استاد کہاں سے ماری ہے گاڑی۔"

"اپنی ہے جناب اپنی" میں نے سینہ تان کر شان استغناء سے شکیل کو دیکھا۔

"واقعی۔"

"اور۔"

"ایسے ہی ہانک رہے ہو۔"

"حد ہو گئی۔۔۔۔"

"خریدی ہے۔"

"ملی ہے۔"

"کہاں سے۔"

"دربار سے۔"

"سچی۔"

"سچی۔"

شکیل نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے پورے زور سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ہم دونوں نے ایک بھرپور ملا جلا قہقہہ لگایا۔۔۔۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔۔۔۔ اور ڈرائیونگ سیٹ سے کھسک کر دوسری سیٹ پر آتے ہوئے شکیل کو بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔

"بڑے ٹھاٹھ ہیں" شکیل سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔۔۔۔

"دیکھ لو۔"

"کام آئی نا ہماری تدبیر۔"

"ضرورت سے زیادہ ہی کام آ گئی۔۔۔۔"

"واقعی جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے نہیں نوکری کو۔۔۔۔ اور گاڑی بھی مل گئی۔"

"یہ تو وقتی طور پر گزارے کے لیے ملی ہے۔۔۔۔ عنقریب برینڈ نیو گاڑی مل رہی ہے۔"

شکیل نے حیرانگی سے مجھے دیکھا "واقعی۔"

"ہاں" میں نے رحمان صاحب کی باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔

"بڑے لکی ہو۔"

"کیا لک ہے۔"

"اس کا کیا حال ہے۔"

"کس کا۔"

"زینے کا۔"

"بالکل ٹھیک۔۔۔۔"

"کیسے جا رہے ہو۔"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کیوں۔"

"یار وہ بے چاری۔۔۔۔"

"تمہاری اداکاری سے مسحور ہو گئی۔"

"بالکل۔"

"سچ سمجھتی ہے کہ تم اسے چاہتے ہو۔"

"ہاں۔۔۔۔ سچ نہ سمجھتی تو یہ مراعات" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔۔۔۔

شکیل بھی مسکرانے لگا۔

ہم دونوں مل کر ساجدہ کا مذاق اڑانے لگے۔۔۔۔

"یار بہت ہی بد شکل ہے بے چاری" شکیل بولا۔۔۔۔

"نہ جسم ہے نہ جان" میں نے تمسخر سے قہقہہ لگایا۔۔۔۔ "پھر بھی جب شرماتی لجاتی ہے نہ۔۔۔۔ تو دیکھنے والی ہوتی ہے۔۔۔۔"

"کچھ اچھی لگنے لگتی ہے۔"

"تو یہ تو۔۔۔۔ اس کا چہرہ اور بھیانک ہو جاتا ہے۔۔۔۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "کل کی بات ہے۔۔۔۔ جانے وہ کس بات پر ہنسی۔۔۔۔ اف توبہ۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کا چھجہ سا بن گیا۔۔۔۔ نچلا ہونٹ اندر چلا گیا۔۔۔۔ ہونٹوں کے کناروں پر سلوٹیں پڑ گئیں۔۔۔۔ اور آنکھیں تو نظر ہی نہ آئیں۔۔۔۔ چہرے پر ناک ہی ناک۔۔۔۔"

"بس کرو یار" شکیل ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ میں ساجدہ کی نقل بھی اتار رہا تھا۔ اپنے ہونٹ کا چھجہ بنا کر اسے بتا رہا تھا۔ اور ناک تو جتنی پھیل سکتی تھی۔ پھیلا رہا تھا۔۔۔۔

"لطف کی بات تو یہ ہے" میں نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کہا۔۔۔۔

"کیا" شکیل بے صبری سے بولا۔۔۔۔

"کم بخت یہ سمجھنے لگی ہے۔ کہ میں اسے دل و جان سے چاہتا ہوں" میں نے تمسخر سے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔۔۔۔

"یہ سمجھنے لگی ہے جبھی تو نوازشات کی بارش ہو رہی ہے" شکیل بولا۔۔۔۔ "میرا تو خیال ہے اگلے ماہ تنخواہ بھی بڑھوا دے گی۔۔۔۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔ اسی لیے اسے چاہنے کی رفتار تیز کر دی ہے۔ میں نے پھر قہقہہ لگایا۔

میری بات پر شکیل دل کھول کر ہنسا۔۔۔۔

"بڑا لطف آتا ہے یار۔۔۔۔" ہنس ہنس کر میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔۔۔۔

"ہوں۔"

"کل کی بات ہے۔"

"کیا۔"

"ہم دونوں چائے پی رہے تھے۔"

"کہاں۔"

"آفس میں۔۔۔۔"

"وہ آفس آتی ہے۔"

"پھر ملاقات روز آتی ہے۔"

"واہ۔۔۔۔ واہ۔ عیش ہو گئی تمہاری۔"

"وہی تو بتا رہا ہوں تمہیں۔۔۔۔ کل اس نے چائے کی پیالی بنا کر مجھے پیش کی۔"

"پھر۔۔۔۔"

"جانتے ہو میں نے کیا کیا۔"

"کیا کیا؟"

"پیالی پکڑتے ہوئے اس صحت مند ہاتھ کی انگلیوں میں صحتمند جذبات بھر کر اس کے مرغی کے پنجے ایسے ہاتھ کو چھو لیا۔۔۔۔"

میں نے زور دار قہقہہ لگایا۔

"پھر" شکیل بھی قہقہے میں قہقہہ شامل کرتے ہوئے بولا۔

"بس عجیب حالت تھی اس کی۔۔۔۔ جب وہ شرماتی ہے نا۔۔۔۔ تو ایسی مکروہ لگنے لگتی ہے۔ کہ کیا بتاؤں تمہیں۔۔۔۔ میرے ہاتھ کے لمس سے تو وہ سٹپٹا گئی۔۔۔۔ سارا خون اچھل کر چہرے پر آ گیا۔ جس سے اس کا چہرہ بالکل کلیجی رنگ کا ہو گیا۔۔۔۔"

"کلیجی رنگ کا۔۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔۔ مارے ہنسی کے شکیل کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔۔۔۔

"مجھے ہنسی تو بہت آئی۔۔۔۔ لیکن میں نے اس کو یہی تاثر دیا۔ کہ اس کے ہاتھ کے لمس سے میرے جذبات میں ہلچل مچ گئی ہے۔

"ہو ہو۔۔۔۔ ہو" شکیل کے منہ سے ہنسی کی آواز بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔۔۔۔ وہ پیٹ پکڑے ہنس ہنس کر پاگل ہو رہا تھا۔۔۔۔ پاگل میں بھی ہو رہا تھا۔۔۔۔ بڑا شوخ ہو رہا تھا اس وقت۔۔۔۔ بڑی مستی میں باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔

کافی دیر یہ مشغلہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے جاری رہا۔۔۔۔

جب مواد ختم ہو گیا۔ تو شکیل بولا "گاڑی سے ہی چپک گئے ہو۔ آؤ باہر نکلو۔۔۔۔"

"نہیں" میں نے کہا۔

"کیوں۔"

"میں تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا۔۔۔۔"

"کیوں ساجدہ کے پاس جانا ہے"

"او۔۔۔۔ گولی مارو اسے۔۔۔۔ میں نے رانی کو لینے جانا ہے گجرات۔"

"ابھی۔"

"ہاں۔"

"تو جاؤ پھر۔۔۔۔ دیر ہو جائے گی۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔۔ ہاں میں جس بات کے لیے آیا تھا وہ تو یاد ہی نہ رہی۔"

"کیا بات۔"

"تمہیں کھانے پر بلانا تھا۔"

"کیوں۔"

"بھئی اب تم جانے والے ہو۔ کھانا وانا کھائیں گے۔"

"کتنی بار کھلانا ہے۔"

"چھوڑو یار۔۔۔۔ ہاں آج بدھ ہے نا۔"

"ہاں۔"

"جمعرات کو۔۔۔۔ یعنی کل رات کا کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے۔"

"تکلف کرتے ہو"

"نہیں بھئی۔۔۔۔ ذرا گپ شپ لگائیں گے۔۔۔۔ پھر تم کہاں ہم کہاں۔۔۔۔ سچی شکیل دل ت برا ہو جاتا ہے۔ جب تمہارے چلے جانے کا سوچتا ہوں۔"

"ہاں ضرور ہو گا۔۔۔۔ خود مجھے کونسا اچھا لگ رہا ہے۔۔۔۔"

"تمہیں تو ضرور لگ رہا ہو گا۔۔۔۔ بکتے ہو۔۔۔۔ ایک تو تمہاری۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہاں ہے۔ سرے گوریاں۔۔۔۔" میں ہنسا۔

"گولی مارو۔ گوریوں کو۔۔۔۔"

"کہنے کی باتیں ہیں۔۔۔۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کسی سے ٹکراؤ تو ہمیں بھی یاد کر لینا۔"

"بہت اچھا حضور ---- آپ خود ہی آنے کی تکلیف کر لیجئے گا۔"

"اوہو ---- ہم اور لندن ---"

"مس ڈوگر سے رومانس جاری رکھنا ---- شاید لندن کا چکر بھی نکل آئے۔"

ہم دونوں نے اس بات پر ایک مشترکہ قہقہہ لگایا ----

پھر

شکیل گاڑی سے باہر نکلا ---- "تھوڑی دیر بیٹھ جاتے۔"

"نہیں بھئی ---- میں نے گجرات جا کے واپس بھی آنا ہے۔"

چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے شکیل کو خدا حافظ کہا کل رات کھانے کا وقت اور جگہ بتائی اور گاڑی نکال لے گیا۔

○ ☆ ○

میں نے تنخواہ اماں کی جھولی میں ڈالی ---- تو اتنے ڈھیر سارے پیسے دیکھ کر امی حیران رہ گئیں ---- میں بنک سے تنخواہ کے پیسے نکلوا کر امی کو دینے آیا تھا ----

امی نے جھولی سمیٹ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر ان کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"شکر ہے تیرا میرے مالک ----" رندھی ہوئی آواز میں انہوں نے کہا۔ پھر تخت پر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور میں جو ان کے سامنے کھڑا بڑے تفاخر سے مسکرا رہا تھا ---- انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

"جگ جگ جئے میرے لال" وہ بولیں "اللہ تیری کمائی میں برکت دے --"

"بہت دے گا میری ماں جانی ---- بہت دے گا" میں نے امی کو پیار کر لیا۔ اس وقت مجھے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی۔

اس کا اظہار ممکن نہیں۔ میری ماں نے کتنے دکھ جھیلے تھے۔ کیسے کڑے وقت دیکھے تھے۔ کتنے مصائب سے دوچار رہی تھیں ----

ان کو خوشیاں دے کر میں سرخرو ہو رہا تھا ---- میں دل ہی دل میں تہیہ کر رہا تھا۔ کہ اپنی ماں کو اس سے بھی زیادہ خوشیاں دوں گا۔

اس سے بھی زیادہ ----

کہیں زیادہ۔

امی پھر تخت پر بیٹھ گئیں۔ جھولی کھول کر پیسوں کو تکتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں "کاش تیرے ابا زندہ ہوتے۔ یہ دن ان کی قسمت میں نہیں تھا ----"

ابا جی کو یاد کر کے میرا دل بھی اداس ہو گیا۔ واقعی وہ آج میری اتنی ڈھیر ساری تنخواہ دیکھتے تو خوشی و فخر سے ان کا سینہ تن جاتا۔

امی اٹھ کر پیسے صندوق میں رکھ آئیں ---- پھر واپس آ کر تخت پر بیٹھتے ہوئے بولیں "اس میں سے ہر ماہ اللہ کے نام کے پیسے نکالنے ہیں۔"

"ضرور ----"

"اور اس دفعہ تو منتیں بھی اتارنی ہیں۔ میں نے بہت ساری منتیں مانی ہوئی ہیں ---- دیگ پکانی ہے ---- قرآن شریف، ختم کروانا ہے۔

"زیارت پر چڑھاوا چڑھانا ہے ---- وہ ----

"امی جس طرح چاہیں کریں۔ یہ پیسہ آپ کا ہے ---- جہاں جی چاہے خرچ کریں۔"

"جیتے رہو بیٹے ----"

"آپ بھی جیئیں ---- اور جھولیاں بھر بھر کر میری آمدنی سے خرچ کریں" میں نے شوخی سے قہقہہ لگایا ----

امی تنخواہ میں سے قمو رانی زوبی کے لیے تحفہ خریدنا چاہتی تھیں۔ پہلی تنخواہ میں بہنوں کا حصہ شگن کے طور پر ہوتا تھا ---- پھر زیبی بھی تھی۔ اس کے لیے بھی کوئی اچھی سی شے خریدنا چاہتی تھیں ----

"امی کہہ دیا ہے نا جو جی چاہے کریں ---- اس وقت مجھے صرف ایک پیالی چائے پلا دیں ---- مجھے دفتر واپس جانا ہے۔"

امی اٹھیں ---- اور باورچی خانے کی طرف چلیں۔ میں سامنے دالان میں چلا گیا۔ زوبی مجو اور ناجا سکول گئے ہوئے تھے ---- گھر پہ صرف امی تھیں۔

"امی" میں نے دالان سے نکلتے ہوئے کہا ----

"جی۔"

"چائے رہنے دیں۔"

"کیوں۔"

"دفتر میں پی لوں گا۔"

"اب بنا رہی ہوں۔"

نہیں امی۔ دیر ہو جائے گی ----"

میں انگلی پر گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے باہر نکل آیا ---- گلی میں آتے ہی مجھے زیبی کا خیال آگیا۔ تنخواہ کی خوشخبری اسے بھی تو سنانا چاہئے تھی۔ ویسے بھی کئی دنوں سے میں زیبی سے مل نہ سکا تھا۔ دو ایک بار آمنا سامنا ہی ہوا ---- باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملا ----

میں بڑی گلی کی طرف جانے کی بجائے زیبی کے گھر کی طرف مڑا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا تھا۔ اور جیراں چھان بورا لیے بیٹھی تھی۔ چھان بورا لینے والا برابر کے دروازے پر بیٹھا سوکھے ٹکڑے تول تول کر تھیلے میں بھر رہا تھا۔ اور مائی سکینہ جو دور پار کی ہماری رشتہ دار بھی تھی۔ چھان بورا بیچ رہی تھی ----

جیراں نے مجھے دیکھا ---- تو سمٹ کر راہ بنا دی۔

"سلام باؤ جی" اس نے کہا۔

"باؤ جی نہیں جیراں ---- اب صاحب جی کہا کر۔ صاحب جی" میں نے ہنس کر کہا ----

اب میں باؤ نہیں بہت بڑا صاحب ہو گیا ہوں ----"

"اللہ زندگی دے

"اب باؤ جی نہ کہنا۔"

"بہت اچھا باؤ جی۔"

"پھر باؤ جی۔"

"بھول گئی ---- صاحب جی ----"

"ہاں ---- صاحب جی ---- سمجھیں۔"

"سمجھ گئی ----"

میں مسکراتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا ---- زیبی کے ہاں میں اب بھی بے روک ٹوک آتا تھا ---- پابندی والی بات میں نے منگنی ہونے پر ہی طے کر لی تھی ---- پھپھو ہی کرتا دھرتا تھیں اس گھر کی۔ انہوں نے میری بات مان لی تھی ---- بات تو میری اب مانی ہی جاتی تھی ---- جب سے مجھے یہ نوکری ملی تھی۔ گاڑی ملی تھی ---- میں دیکھ رہا تھا کہ میری عزت اور وقار اس گھر میں بہت بڑھ گیا ہے۔ پھپھو تو نچھاور ہو ہو جاتی ---- میری خاطر مدارت پہلے بھی کرتی تھیں۔ لیکن اب تو جس طرح کرتی تھیں ---- اس کا اور ہی ڈھنگ تھا۔ میں سیدھا اوپر والی منزل پر جا پہنچا ----

"بھئی کوئی ہے" وہاں بالکل خاموشی تھی ---- شاید گھر پہ کوئی نہ تھا۔ میں صحن میں کھڑا ہو گیا ----

کوئی جواب نہ ملا ---- "پھپھو جی" میں نے پکارا ---- جواب نہ ملا ----

"زیبی" میں نے چند لمحوں بعد پھر آواز دی ---- سامنے والے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے زیبی نے مجھے دیکھا۔

"حد ہو گئی" میں بے دھڑک کمرے میں جا گھسا۔

زیبی دروازے کے قریب ہی کھڑی رہی ---- وہ شاید بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ بال کھلے تھے اور ہاتھ میں کنگھی پکڑ رکھی تھی۔ اس نے پستی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کالا سویٹر ان کپڑوں کے ساتھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ زیبی کھلے اور بکھرے بالوں میں قیامت ڈھا رہی تھی ----

لیکن -----

وہ خاموش کھڑی رہی۔ میرے آنے کی جیسے اسے قطعاً خوشی نہ ہوئی۔ میں تو آج کل اپنے آپ فرش سے عرش پر لے جا رہا تھا۔ اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ زیبی کی بے رخی سے بدک گیا تھا۔

"کیا بات ہے زیبی" میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا -----

زیبی نے اک روٹھی روٹھی نگاہ مجھ پر ڈالی اور رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

"بتاتی کیوں نہیں ہو کیا ہوا ہے -----" میں نے پھر اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

اس نے اک نگاہ جو ناراضگی کی ضامن تھی مجھ پر ڈالی اور پھر نظریں جھکا لیں۔ اس کا یہ انداز اتنا قاتلانہ اور حسین تھا کہ میں دل تھام کر رہ گیا۔

"زیبی" میں بڑی ملائمت سے بولا -----

اس نے پھر مجھ پر وہی نگاہ ڈالی۔

"خفا ہو" میں نے اس کی زلفوں کی گھٹاؤں میں پناہ لینے کی خواہش محسوس کی -----

وہ اب بھی کچھ نہ بولی۔

"ناراض ہو -----" میں نے اپنی آنکھوں میں نشہ سا اترتا محسوس کیا۔

"کیوں آئے ہو" وہ جھلا کر بولی۔

"نہ آتا" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا -----

"اتنے دن نہیں آئے۔ اب بھی نہ آتے" وہ واقعی مجھ سے خفا تھی۔

"اوہ ----- زیبی ----- یہ بات ہے" میں کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"بہت بڑے افسر بن گئے ہو نا افسری لیے پھرتے ہو۔"

اس نے گلہ کیا۔

میں اس کی معصوم شکایت پر مسکرا اٹھا۔

"سب کچھ تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں میری جان" میں نے بڑی بے باکی سے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ اونچا کر لیا۔

میری نگاہوں سے اس کی نگاہیں ملیں -----

ہم دونوں مسکرا دیئے -----

گلہ شکوہ جاتا رہا -----

میں نے زیبی کو اپنے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا -----

شرما کر گھبرا کر وہ مجھ سے ایک دم الگ ہو گئی ----- اس کے چہرے پر شفق کے رنگ پھیل

گئے ----- اور آنکھوں میں چاندنی سمٹ آئی ----- اک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالتے ہوئے وہ شرما کر کمرے سے نکل کر صحن میں جا کھڑی ہوئی -----

میرا جی چاہا ----- بڑھ کر پھر اسے بازوؤں میں دبوچ لوں ----- اس کے بالوں پر ہونٹوں پر آنکھوں پر اپنے جلتے اور تشنہ ہونٹ رکھ دوں ----- وہ میری تھی اور ایسا کرنے کا مجھے حق تھا -----

میں اب نظریات بدل رہا تھا ----- قدریں بدل رہا تھا ----- اپنی منگیتر سے اس طرح ٹوٹ کر پیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ جس طبقے کی طرف میری اڑان تھی ----- وہاں یہ باتیں معیوب نہ تھیں -----

ان دنوں میں اپنی اصل سے جدا ہو رہا تھا -----

ان دنوں تو شاید -----

میں اپنے آپ سے جدا ہو رہا تھا۔

میں چند منٹ کمرے میں کھڑا رہا۔ زیبی صحن کے آخری کنارے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی -----

میں کمرے سے باہر نکلا -----

"زیبی۔"

"ہوں۔"

"ایک کپ چائے پلاؤ۔"

زیبی شاید میری بے باکی سے ڈر گئی تھی ----- مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولی ----- پہلے جیراں کو بلاؤ نیچے سے۔"

"وہ تو چھان بورا لیے بیٹھی ہے -----"

"بلاؤ تو۔"

"سنو زیبی۔"

"ہوں۔"

"یہ چھان بورے بیچنا چھوڑ دو اب -----"

"کیوں ----- اتنے ڈھیر سارے ٹکڑے اور چھان جمع ہو گیا تھا -----"

"جیراں کو دے دیا کرو -----"

اس نے شوخی سے نگاہیں گھمائیں اور ہنس کر بولی "بڑے افسر بن گئے ہو نا اب یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"بالکل۔"

"سب ہی بچتے ہیں" زیبی نے مجھے میرے گھر والوں کا اشارتاً احساس دلایا۔

"اب نہیں بچیں گے" میں نے کہا----

"بہت اچھا صاحب" وہ ہنس پڑی۔

"چلو چائے بناؤ"

"بناتی ہوں۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے دفتر بھی جانا ہے۔"

"دفتر سے کیوں بھاگ آئے؟"

"تنخواہ لے کے آیا تھا۔"

"اوہ اچھا---- مبارک ہو----"

"مبارک تمہیں ہو ---- تمہارے ہونے والے شوہر نامدار کو آج ڈھیر ساری تنخواہ ملی ہے۔"

"ہو ہو---- کیا تحفہ لو گی۔"

"تحفہ پوچھ کر دیا جاتا ہے؟"

"بہت تیز ہو گئی ہو۔"

میں اس پر پھر جھپٹنا چاہتا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز آئی----

زیبی مسکراتے ہوئے باورچی خانے میں گھس گئی----

امجد آیا تھا

وہ ہمارے گھر سے میری تنخواہ کی نوید سن کر آیا تھا----

"پکچر دکھائیں گے بھائی جان" اس نے مجھ سے کہا۔

"ضرور ---- ضرور ----" میں نے خوش دلی سے کہا۔

وہ میری تنخواہ سن کر اب تک حیران تھا---- میں ہنس کر بولا "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا---- برینڈ نیو گاڑی مل رہی ہے۔ اور تنخواہ بھی اور بڑھے گی۔"

زیبی بے حد خوش تھی----

"چائے بنا لائی----

میں نے جلدی جلدی چائے حلق میں انڈیلی---- امجد آگیا تھا۔ اب یہاں رکنے میں مزہ بھی تو نہیں تھا----

○ ☆ ○

شکیل کی فلائیٹ سوا دس کی تھی۔ ہم لوگ دس بجے سے پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچ گئے تھے۔ میں نے دفتر سے آدھے دن کی چھٹی لی تھی۔ صبح دفتر گیا تھا ---- اور رحمان صاحب سے آدھے دن کی رخصت کے لیے کہا تھا۔

وہ ہنس کر بولے تھے "دفتر تمہارا اپنا ہے بیٹے----"

میں اس شفقت اور بے تکلفی سے کچھ گھبرا گیا تھا---- پھر بھی وضاحت کی تھی "سر میرا عزیز ترین دوست آج یو کے جا رہا ہے۔ اسے سی آف کرنا ہے دفتر سے غیر حاضری کام پر اثر انداز نہیں ہو گی۔ میں شام کو کام ختم کر کے ہی چھٹی کروں گا۔"

"میرے عزیز" انہوں نے کہا تھا "تمہارے کام سے میں جتنا مطمئن ہوں ---- دفتر کے کسی آدمی کے کام سے بھی اتنا نہیں۔ میں تو خود اپنے کام سے بھی اتنا مطمئن نہیں ہوں جتنا تم سے ہوں۔"

"شکریہ سر۔"

"تم میرے کام کے لیے خوش بختی کی علامت ہو سراج۔ ماشاء اللہ کام بہت اونچا جا رہا ہے۔ نئی فیکٹری چلنے سے تو مجھے امید ہے یہ کام سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے موقع پرستی کی۔ ہنس کر بولا "سر ایسا نہ سمجھیں ---- کام سنبھالنے کے لیے میں اپنی ساری قوت و صلاحیت استعمال کروں گا----"

وہ مرعوب ہو کر بولے "مجھے تم سے یہی توقع ہے ---- نئی فیکٹری کا بار تم ہی سنبھالو گے۔"

میں جی ہی جی میں خوش ہو گیا---- اور مجھے اپنا مستقبل بے حد تابناک نظر آنے لگا۔

"پائپ کا سکوپ بہت ہے ہمارے ملک میں۔ گیس اور پانی کے لیے تو اس کا استعمال اب لازمی ہے ---- ملک میں کنسٹرکشن بھی تو بہت ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے پائپ کی کھپت بھی ہو گی۔"

"سر یہ مجھ پر چھوڑ دیں ---- پائپ کی نئی فیکٹری اس طرح چلے گی کہ ڈیمانڈ [illegible] میں توازن ہی نہیں رہ سکے گا ---- آپ کو اس فیکٹری میں جلد ہی ایکسٹینشن کرنا پڑے گی۔"

میں نے رحمان صاحب کو خوب مرعوب کیا ----- ویسے بات ٹھیک بھی تھی ----- نئی فیکٹری کی پروڈکشن ابھی صحیح طور پر شروع بھی نہ ہوئی تھی ----- کہ آرڈر پہ آرڈر آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے توقع تو پہلے ہی تھی۔ کہ نئی فیکٹری کا منیجر رحمان صاحب مجھے ہی بنائیں گے۔ آج انہوں نے وضاحت بھی کر دی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا ----- اور دل ہی دل میں تہیہ کر لیا۔ کہ پوری محنت لگن اور ایمان داری سے فیکٹری کا کام چلاؤں گا۔

کمال کی بات تو یہی تھی کہ۔ میں کام میں مخلص تھا۔ کوئی ہیرا پھیری نہیں کر رہا تھا ----- ہیرا پھیری تو صرف ساجدہ سے کر رہا تھا۔

میں رحمان صاحب کے دفتر سے نکل کر سیدھا شکیل کے گھر پہنچا ----- وہاں کچھ لوگ جمع تھے ----- شکیل کو الوداع کہنے آئے تھے ----- پونے دس ہم ایئر پورٹ کی طرف چل دیئے۔ شکیل کی ممی فی الحال نہیں جا رہی تھیں ----- ریتا آفاق اور وہ الگ موٹر میں تھے۔ شکیل کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا ----- چند دوست اور بھی ساتھ آئے -----

ایئر پورٹ پر کافی رش تھا۔ کئی فلائٹیں آ رہی تھیں۔ جا رہی تھیں۔ لاؤنج لوگوں سے بھری تھی۔ مڈل ایسٹ کے ملکوں میں جانے والے لوگوں کی کثرت تھی۔ اور انہیں خدا حافظ کہنے آنے والوں سے لاؤنج بھری تھی۔

ہم سب باتیں کر رہے تھے ----- ریتا شکیل کے جانے سے بے حد اداس تھی -----

میرا دل بھی بہت اداس تھا۔ اتنا پیارا اور مخلص دوست بچھڑ رہا تھا۔ اپنوں سے بچھڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ شکیل کو تو میں صرف دوست ہی نہیں مانتا تھا۔

وہ تو میرا استاد تھا۔

میرا گرو تھا۔

مجھے ترقی کی راہ پر ڈالنے والا ----- میرا رہبر تھا۔

ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں بٹے ہوئے تھے۔ شکیل کبھی ممی کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ کبھی ریتا اور آفاق سے باتیں کرنے لگتا۔ کبھی دوسرے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا ----- کبھی میرے پاس آ جاتا ----- میں نے شکیل کے جانے کا ساجدہ کو بھی بتایا تھا۔

اس نے فلائٹ کا وقت پوچھا تھا۔ اور اسے سی آف کرنے آنے کا بھی کہا تھا۔

دس بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ وہ تا حال نہیں پہنچی تھی ----- مجھے اس کا انتظار تھا۔

میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اور نگاہیں باہر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

شکیل نے مجھے دیکھا تو بولا "کیا بات ہے۔ کسی کا انتظار ہے کیا۔"

"ہاں۔"

"کس کا۔"

"اسی کا۔"

"مس ڈوگر کا۔"

"ہاں۔"

"وہ آئے گی۔"

"تمہیں سی آف کرنے۔"

"واقعی۔"

"کہا تو تھا آنے کا۔"

شکیل نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا "ٹائم تو کم ہی ہے۔"

"اسے آ جانا چاہئے تھا -----"

میری بات پر وہ مسکرایا ----- میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے آنکھوں میں شوخ سی چمک لاتے ہوئے بولا ----- "بڑے زور شور سے اس کا انتظار کر رہے ہو۔"

میں پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا "یار اس نے کہا جو تھا ----- کہ آئے گی۔"

اس نے کہا اور تم نے انتظار شروع کر دیا۔"

"بالکل۔"

وہ پھر ہنسا اور ہولے سے سرگوشی کے انداز میں بولا "راج ----- کہیں اس سے تم سچ مچ ہی تو انوالو نہیں ہو گئے -----"

"بیوقوف۔"

"تمہاری حالت سے لگتا تو ایسا ہی ہے -----" وہ ہنسا۔

"میری توہین کر رہے ہو" میں نے رعب جمایا -----

"اوہو" وہ مسکرایا۔

"ہاں ----- میری پسند اتنی گئی گزری ہو سکتی ہے" میں ہنس کر کہا۔

"تمہاری پسند تو ماشاء اللہ -----" شکیل نے سنجیدگی سے کہا ----- اس کا اشارہ زیبی کی طرف تھا ----- "بہت خوش بخت ہو ----- تمہاری منگیتر لاکھوں میں ایک ہے۔"

"پھر -----"

"مذاق کر رہا تھا۔"

"وہ آ گئی -----" میری نظر ساجدہ پر پڑی ----- میں شکیل کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

شکیل کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ پھیل گئی -----

"ہیلو" میں نے ساجدہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"دیر تو نہیں ہو گئی" اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"فلائٹ بس اب جانے ہی والی ہے۔۔۔۔ اتنی دیر لگا دی۔۔۔۔ میں نے شکوہ کیا۔

وہ فخریہ انداز میں مسکرائی۔۔۔۔ میرے شکوے نے اس کی اہمیت اس پر واضح کی تھی نا۔۔۔۔

ساجدہ نے آج بڑا خوبصورت لباس پہنا تھا۔ جو اس کے جسم سے زیادہ کسی ہینگر پر لٹکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

آج اس نے کاسمیٹکس کا بھی استعمال کیا ہوا تھا۔۔۔۔ جس سے اس کے چہرے کی بدنمائی کچھ اور واضح ہو گئی تھی۔۔۔۔ مجھے اسے دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔۔۔۔ اس نے بالوں کا سٹائل بھی بدلا ہوا تھا۔

میں نے اسے شوخ شوخ مسکراتی نظروں سے دیکھا تو اس کے چہرے پر حیا کے رنگ لہرا گئے۔

میں نے شوخی کو مزید رنگ بخشنے کے لیے کہا "ساجدہ آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔۔۔۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔۔۔۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ یوں لگا اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

اپنی چندھیائی چندھیائی آنکھوں کو پورا کھول کر اس نے مجھے دیکھا۔ ان نگاہوں میں جانے کیا تھا۔ کہ میرا دل سینے میں تڑپ سا گیا۔

وہ بے حد اداس نظر آئی اور آہستگی سے بولی "پلیز راج۔۔۔۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولا کرو۔۔۔۔" اب میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی۔ جو ہوں سو ہوں۔" وہ چابی انگلی پر گھماتے ہوئے بولی۔

"میں نے کیا کہا ہے۔"

"یہی کہ آج میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔"

"جھوٹ ہے یہ۔"

"ہاں۔"

میں ناراض ہو گیا۔۔۔۔

وہ میری ناراضگی کو محسوس کرتے ہوئے بولی "میں سچائی سے منحرف نہیں ہونا چاہتی راج۔۔۔۔"

"کیسی سچائی" میں تلخی سے بولا۔

"یہی کہ میں اک انتہائی بدصورت لڑکی ہوں، جو کبھی بھی اچھی نہیں لگ سکتی۔۔۔۔"

میں نے اس کی طرف پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔۔۔۔ اف اس کے چہرے پر کرب اپنی شدتوں اور انتہاؤں کے ساتھ ٹوٹ رہا تھا۔ میرا دل جذبہ ہمدردی سے لبالب پیمانے کی طرح بھر گیا۔۔۔۔ جی چاہا ساجدہ کی یہ ساری محرومیاں اور مایوسیاں اپنے سینے میں سمیٹ لوں۔۔۔۔

فلائیٹ کی پرواز کا اعلان ہو گیا۔۔۔۔ ساجدہ نے قدم بڑھایا۔ وہ شکیل کی طرف گئی۔۔۔۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ شکیل کے پاس آ گیا۔

میں بے طرح اداس ہو رہا تھا۔۔۔۔ شکیل بچھڑ رہا تھا۔۔۔۔ اور ساجدہ کی محرومی کرب اور اذیت میرے دل کے حساس گوشوں کو چھو رہا تھا۔

شکیل سے میں بغلگیر ہوا۔۔۔۔ کئی لمحے ہم اسی حالت میں کھڑے رہے۔۔۔۔

بھول نہ جانا مجھے۔" شکیل نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ پھر ساجدہ سے مخاطب ہو کر بولا "یہ بڑا نٹ کھٹ سا نازک مزاج دوست ہے میرا۔۔۔۔ اس کا خیال رکھیئے گا۔۔۔۔"

ساجدہ مسکرا بھی نہ سکی۔۔۔۔

شکیل ہم سے جدا ہو کر اپنے دوسرے رشتہ داروں کی طرف بڑھا۔ ہم اسے سی آف کر کے آ گئے۔۔۔۔

میں اداس تھا۔۔۔۔

اور۔۔۔۔

ساجدہ چپ۔

○ ☆ ○

اداسی مجھ پر کئی دن مسلط رہی میں بے حد پژمردہ اور نڈھال تھا ---- یوں لگتا تھا۔ میرے اندر لق و دق صحرا پھیل رہے ہیں ---- کوئی بات اچھی نہ لگتی ---- کسی کام میں جی نہ لگتا ----

شاید یہ شکیل سے بچھڑنے کا اثر تھا ---- یا ---- ساجدہ کی مایوسی نے دل کے کسی حساس گوشے کو چھو لیا تھا ----

میں اپنا تجزیہ کرتا تب بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ پاتا ---- میں تو زہبی کا دیوانہ تھا۔ اس کی چاہت میرے انگ انگ میں رچی بسی تھی ---- کالے بالوں اور کالی آنکھوں والی اس سنہری لڑکی نے مجھے برسوں سے دیوانہ کر رکھا تھا۔ اس کے مقابلے میں ساجدہ ---- کتنی بھونڈی کیسی بھدی اور کریہہ المنظر لڑکی تھی ----

اس لڑکی کو تو میں نے آلے کے طور پر استعمال کیا تھا ---- ترقی کی راہ کا زینہ تھی میرے لیے ---- میں اس کے لیے نرم و گداز جذبات کیوں کر رکھ سکتا تھا ---- اسے دیکھ کر کسی بھی ذی ہوش مرد کے جذبات ابھر نہیں سکتے تھے ---- میں تو اتنا وجیہہ' پروقار اور حسین آدمی تھا ----

لیکن

میں اداس تھا ---- ساجدہ کی محرومی و مایوسی میرے دل میں تڑپ پیدا کر دیتی تھی ----

کیا میں اسے چاہنے لگا تھا؟

ایک دن پوری ایمانداری سے میں نے اپنے آپ سے سوال کر ڈالا ----

لیکن

اس بے ہودہ سوال کے جواب میں میں خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

چھپکلی ایسی رنگت اور ذبح کی ہوئی مرغی کے پنجوں جیسے ہاتھوں والی لڑکی سے پیار ----؟ کیا بے ہودہ بات تھی ----

لیکن اس طرح ہنستے اور سوچتے وقت مجھے یوں لگ رہا تھا۔ کہ میں اپنے آپ میں منقسم ہو رہا ہوں ---- بٹ رہا ہوں ---- بچھڑ رہا ہوں ---- میں کوئی اور تھا اور میرے اندر کوئی اور ----

شاید اداسی اور پژمردگی کی یہی وجہ تھی۔ اندر باہر کی تکرار سے شخصیت پارہ پارہ ہوتی ہی ہے ----

میرے باہر کا آدمی خاصہ زور آور تھا۔ اس نے اندر کے انسان کو جھکا ہی لیا ----

ساجدہ سے مجھے محبت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ میری ضرورت تھی۔ میں اس کے سہارے ترقی کی شاندار منزل کی طرف گامزن تھا ---- مجھے نئی فیکٹری کا انچارج بنایا جا رہا تھا۔ میری تنخواہ بڑھائی گئی تھی۔ میرے لیے تین بیڈ روم کی کوٹھی خریدنے کی تجویز زیر غور تھی ---- یہ سب باتیں مجھے ساجدہ کے قرب پر مجبور رکھتی تھیں۔

ورنہ

ورنہ محبت اور چاہت ----

میں نے ایک بلند قہقہہ لگاتے ہوئے اس بات کو تمسخر سے رد کر دیا۔ میں ساجدہ سے ضرورتوں کے لیے وابستہ تھا ---- میں نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ----

اس دن میں دفتر میں بیٹھا تھا ---- کام کچھ زیادہ نہیں تھا ---- گھنٹہ بھر میں کر لیا۔ اب میں نئی فیکٹری میں جانے لگا تھا۔ دفتر میں بیٹھنے کا زیادہ موقع ہی نہ ملتا ---- اور اسی وجہ سے ساجدہ سے بھی ملاقات نہ ہو سکی ---- وہ حسب معمول دفتر کسی کسی دن آتی تھی۔ جب سے میں نے اس کا کام سنبھالا تھا۔ اس کا چکر برائے نام ہی ہوتا ----

میں نے فائل چیک کر کے بند کر دی ---- گھنٹی بجائی ---- چپراسی کو بلانا مقصود تھا ----

وہ میرے بلاوے پر جلد ہی اندر آ گیا۔ میری اہمیت و حیثیت اب چپراسی کیا پورے دفتری عملے پر واضح تھی ---- عزت و احترام یوں کیا جاتا جیسے میں رحمان صاحب کا ملازم ہی نہیں۔ ان کا وارث اور قائم مقام ہوں۔ چپراسی نے اندر آتے ہی مجھے ہاتھ اونچا لے جاتے ہوئے سلیوٹ کے انداز میں سلام کیا۔

میں نے کرسی میں پیچھے کو پھیلتے ہوئے کہا "رحمت دین۔"

"جی سر۔"

"مس ڈوگر دفتر آتی ہیں۔"

"آج آئی ہیں۔"

"اتنے دن نہیں آئیں۔"

"دیکھا نہیں تھا ---- ایک دو دفعہ بڑے صاحب کے پاس چند منٹ کے لیے آئی تھیں شاید ----"

"اب کہاں ہیں۔"

"بڑے صاحب کے پاس ہوں گی ----"

"بڑے صاحب تو دوسری فیکٹری دیکھنے گئے ہیں۔"

"مس ڈوگر صاحبہ یہیں ہیں۔"

"دیکھو ہیں ---- تو ----"

"اچھا صاحب۔"

"کہنا ---- میں نے انہیں یاد کیا ہے ---"

چپراسی سر اثبات میں ہلا کر دروازے سے نکلا ہی تھا۔ کہ ساجدہ اندر آگئی ---- میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا ----

وہ مسکراتے ہوئے بولی "کس نے مجھے یاد کیا ----"

میں بے ساختہ بولا "دل نے تجھے یاد کیا ----"

"دیکھو راج" وہ میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ آج اس کا موڈ کچھ خوشگوار تھا ----

"ہوں" میں میز کے گرد گھوم کر اس کے قریب چلا آیا۔ اس کے اس طرح قریب آنے میں میرا اپنا کوئی دخل نہیں تھا ---- یوں لگا تھا ---- جیسے کسی مقناطیسی کشش سے میں اس کی طرف کھینچ آیا ہوں۔

میں میز کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا ----

اس نے اپنی کرسی ذرا پرے کھسکالی۔

میں دھیرے سے مسکرا دیا ----

"اتنے دن کہاں تھے" اس نے شاید ماحول کا رومانی طلسم توڑنا چاہا۔

"تم کہاں تھیں ----"

"جہاں تم تھے۔"

ہم دونوں اس بے معنی بات پر بڑے بامعنی انداز میں ہنس دیئے۔

"باہر چلو گے" اس نے پوچھا ----

"کہاں۔"

"کہیں چائے وائے پینے۔"

"ایک گھنٹہ فری ہے ---- چاہو تو یہیں چائے پی لیتے ہیں ---- چاہو تو باہر چلتے ہیں ----"

"ایک گھنٹہ کیوں۔"

"رحمان صاحب دوسری فیکٹری دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔ وہ ایک گھنٹہ تک آئیں گے۔ پھر ن مجھے وہاں جانا ہے۔"

"تم ضرورت سے زیادہ ہی محنت کرنے لگے ہو۔"

"اس لیے کہ یہ تمہارا کام ہے ---- اور تمہارے لیے میں اس سے زیادہ محنت کر سکتا ہوں۔ میں نے بے ساختہ یہ بات کہی تھی۔ اس نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے مجھے مرعوب ہو کر دیکھا ----

وہ چند لمحے چپ رہی۔ سر جھکائے اپنے پنجے ایسے ہاتھ سے میز کی چکیلی سطح کو کھرچتی رہی۔ پھر سر اٹھایا ---- مجھے دیکھا ---- ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی ---- اور بے حد سنجیدگی سے بولی

"راج ---- کیا تم جو کچھ کہتے ہو سچ کہتے ہو۔"

میں بڑا جذباتی ہو کر بولا "تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے ---- یقین کیوں نہیں آتا۔"

"ہاں مجھے یقین نہیں آتا۔"

"اچھی بات ہے۔"

"دیکھو راجو خفا نہ ہونا۔"

"تمہاری باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ خفا نہ ہوؤں؟"

"میں کیا کروں۔"

"یقین کرو ---- اعتماد کرو ----"

"اپنا آپ مجھ سے چھپا نہیں راج ---- میں بہت بدصورت ہوں"

میں نے بڑے جذباتی انداز میں اپنے مضبوط ہاتھ اس کے لکڑی ایسے سخت کندھوں پر رکھ دیئے ---- اور جوش جذبات سے مغلوب آواز میں بولا "میں نے کب کہا ہے ---- کہ تم خوبصورت ہو ---- انسان کا ظاہری تو سب کچھ نہیں ہوتا ---- تمہارا یہ خول بدصورت ہی سہی۔ لیکن اس خول کے اندر ایک خوبصورت لڑکی ہے ---- جو مخلص ہے پیار کرنے والی ہے ---- پیار چاہتی ہے ---- میں اس لڑکی کو ٹوٹ کر چاہنے لگا ہوں۔"

"راج ----" وہ ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگی۔

اور مجھے جانے کیا اور کیوں سوجھی ---- کہ ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچا ---- دوسرے لمحے وہ میرے بازوؤں میں تھی ---- اور اس کا سر میری چھاتی سے لگا تھا ---- وہ ٹھہر ٹھہرے غیر متوازن سانس لے رہی تھی اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

سوکھی دھواں کھائی لکڑی جیسے میرے سینے میں چبھنے لگی ---- میں نے جلدی سے اسے الگ کر دیا ---- الگ ہونے میں خود اس نے بھی کوشش کی ---- یہ جو کچھ ہوا تھا۔ اس کی توقع مجھے تھی ---- نہ اسے ---- میں گھوم کر آیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا ---- میرا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا ----

وہ بھی جیسے کھڑا رہنے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔ آہستگی سے کرسی پر بیٹھ گئی ----

چند لمحے ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکے۔ پھر میں نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا.....

اس کے چہرے پر بڑی حسین و دلکش صبح کی سی پاکیزگی اور نور پھیلا ہوا تھا..... میں حیرانگی سے اسے تکنے لگا..... جذبوں کا حسن چہرے کی بدصورتی پر حاوی تھا..... وہ مجھے اس وقت واقعی اچھی لگ رہی تھی.....

میں نے کچھ ہی دیر میں اپنے آپ پر قابو پالیا..... ساجدہ شاید ابھی تک لطف و انبساط کے جذبوں میں گھری تھی..... ہولے ہولے مسکرا رہی تھی..... نگاہیں تفاخر سے اٹھ رہی تھیں ..... لکیرایسے پتلے پتلے ہونٹوں میں چمکیلی مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔.....

ایک بار پھر میرے اندر کا انسان جھک گیا۔ اور میں جو خبیث اور شیطان تھا۔ اس کی اس حالت پر تمسخر سے مسکرانے لگا۔

کسی کی معصومیت سے کھیلنا شاید دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے۔ لیکن میں نے یہ بات ذہن سے جھٹک دی۔

"باہر چلیں" میں نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے ساجدہ سے پوچھا۔

"کہاں" وہ اب تک شرمائے جا رہی تھی۔

"چائے وائے پینے۔"

"چلیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی..... سہمی سہمی کمی کمی میرے ساتھ باہر آگئی۔

○ ☆ ○

رحمت دین دروازہ کھول کر اندر آیا۔ مجھے سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا

"آؤ رحمت۔"

"سر آپ کو بڑے صاحب نے بلایا ہے۔"

"ابھی۔"

"جی ہاں۔"

"کوئی کام۔"

"پتہ نہیں سر....."

"کہاں ہیں۔"

"اپنے دفتر کے باہر کھڑے تھے۔ شاید دوسری فیکٹری گئے ہوئے تھے۔"

"اچھا..... چلو میں آتا ہوں۔"

میں نے آدھ جلا سگریٹ ماربل کی ایش ٹرے میں آخری لمبا سا کش لینے کے بعد بجھا دیا۔ اپنے سامنے پھیلے کاغذات پر پیپر ویٹ رکھا اور سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا.....

بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا..... پل اوور کو ٹھیک کیا اور آفس سے باہر آگیا..... کوریڈور سے ہوتا رحمان صاحب کے دفتر کی طرف بڑھا..... دو تین کلرک اور سپروائزر دفتر کے باہر فائلیں لیے کھڑے تھے..... انہوں نے مجھے بڑی تعظیم سے سلام کیا..... اور میرے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

میرا سینہ شان تفاخر سے کچھ تن سا گیا۔ سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتا میں دفتر کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

رحمان صاحب لمبی چوڑی چمکیلی سطح والی خوبصورت آفس ٹیبل کے دوسری طرف ریوالونگ چیئر پر بیٹھے تھے..... کام میں مصروف تھے۔

میں نے سلام کیا۔

تو سر اٹھا کر مجھے دیکھا..... سلام کا جواب بڑے تپاک سے دیتے ہوئے آنکھوں سے نظر کا

چشمہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پن بھی بند کیا۔

"آؤ سراج بیٹھو۔۔۔۔"

انہوں نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔۔۔۔ میں میز کے دوسری طرف ان کے عین سامنے بیٹھ گیا۔۔۔۔

انہوں نے اپنا پائپ اٹھایا۔۔۔۔ ڈبیہ کھولی اور تمباکو بھرنے لگے۔

"آپ ابھی فیکٹری گئے ہوئے تھے۔"

"ہاں۔"

"کام ہو رہا ہے۔"

"تمہاری کارکردگی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔"

"شکریہ۔۔۔۔ سر یہ میرا فرض ہے۔"

"دو یونٹ تو پورے طور پر کام کرنے لگے ہیں۔"

"باقی دو یونٹ بھی اسی ماہ شروع کر دیں گے۔"

"شکر ہو گے۔"

"ضرور۔"

"پھر تو وقت بہت بچ گیا۔"

"پروڈکشن اپریل کے شروع میں شروع ہونی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ پانچ کی پروڈکشن پورے طور پر میرے اندازے کے مطابق اپریل میں شروع ہو جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال ٹھیک ہو۔۔۔۔ ویسے ممکن نہیں لگتا۔ ابھی دو تین ماہ تو فیکٹری سیٹ کرنے میں لگ جائیں گے۔۔۔۔ پھر پروڈکشن کا مسئلہ ہو گا۔"

"نہیں سر"

"سر نہیں انکل۔"

میں نے رحمان صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کش لگا رہے تھے۔

ہم آدھ گھنٹہ تک فیکٹری کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ چند امور ایسے تھے۔ جن پر تبادلہ خیال ضروری تھا۔ کچھ میں نے رحمان صاحب سے کہا۔ کچھ انہوں نے مجھ سے۔۔۔۔ بہر حال وہ مجھ سے پوری طرح مطمئن تھے۔ اور ہی فیکٹری کا سارا کام مجھے سونپ دیا تھا۔۔۔۔

"میرا خیال ہے۔ اب میں یہاں دفتر آنے کی بجائے فیکٹری ہی جایا کروں" میں نے رائے ظاہر کی۔

"لیکن ابھی آفس ڈیکوریٹ نہیں ہوا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔ مجھے کام کرنا ہے۔ ڈیکوریٹڈ آفس میں تو نہیں بیٹھنا۔۔۔۔ پھر میرا وہاں حاضر ہونا ضروری بھی ہے۔ ورکرز سے کام اسی صورت لیا جا سکتا ہے کہ میں سر پر موجود رہوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔۔۔۔ ویسے تمہاری وجہ سے میرا آدھا بار بٹ گیا ہے۔"

"شکریہ۔۔۔۔ آپ مجھے ہمیشہ مخلص پائیں گے۔۔۔۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے۔"

ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ رحمت دین چائے کی ٹرے لے آیا۔ میں نے اپنے اور رحمان صاحب کے لیے چائے بنائی۔

میں کام پوری لگن ایمانداری اور محنت سے کر رہا تھا۔ قسمت بھی شاید یاور تھی۔ غیر متوقع طور پر فیکٹری وقت اور اندازے سے پہلے چالو ہو گئی تھی۔ کچھ یونٹ کام کر رہے تھے۔ کچھ نے کام شروع کرنا تھا۔ ہر کام بڑے نظم و ضبط سے ہو رہا تھا۔۔۔۔ میری دلی خواہش تھی۔ کہ یہ فیکٹری خوب چلے اور کاروبار منفعت بخش ہو۔۔۔۔ اس لیے میں دفتری اوقات کے علاوہ بھی کام کر رہا تھا۔ کئی کئی دن تو رات کے دس دس گیارہ گیارہ بجے تک وہیں رہتا اور اپنی نگرانی میں کام کرواتا۔۔۔۔ بزنس کی مجھے کوئی سوجھ بوجھ تو نہ تھی۔ لیکن جب سے میں نے یہ کام سنبھالا تھا۔ نکتے خود بخود سمجھ میں آتے جاتے تھے۔ ذہن میں خاصہ تھا۔۔۔۔ پڑھا لکھا بھی تھا۔۔۔۔ اس لیے بزنس کے مسائل حل کرنے کا اہل تھا۔ کچھ وہی بات۔۔۔۔ کہ قسمت بھی یاور تھی۔۔۔۔ مٹی کو ہاتھ ڈالتا اور سونا بننے والی بات معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔

رحمان مجھ پر بے حد خوش تھے۔۔۔۔ میری تنخواہ میں انہوں نے اتنا اضافہ کر دیا تھا۔۔۔۔ کہ حیرانی بھی حیران رہ گئی تھی۔۔۔۔

اور

میں جانتا تھا کہ اس کے پیچھے ساجدہ کا ہاتھ ہے۔۔۔۔ ساجدہ پر میں جتنی لطف و انبساط کی بارش کرتا تھا۔ مجھے اتنا ہی مالی فائدہ مل رہا تھا۔۔۔۔ سارے امور پر تبادلہ خیال ہو چکا۔۔۔۔ تو میں نے رحمان صاحب سے اجازت چاہی۔۔۔۔

"سنو راج" وہ بولے۔

"جی۔"

"تمہارے لیے میں نے نئی گاڑی خریدی ہے۔"

جی؟؟؟"

وہ مسکرائے۔۔۔۔ میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔۔ اس خبر سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ نئی گاڑی کا

نشہ ہی اور ہوتا ہے ---- لیکن میں نے خوشی کا اظہار نہیں کیا ----

"انکل ---- گاڑی اچھی بھلی تو تھی میرے پاس ---- آپ نے خواہ مخواہ نئی گاڑی کے لیے روپیہ ضائع کیا۔"

وہ میری بات سے خوش ہوئے ---- پھر سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں بھئی نئی گاڑی ضروری تھی۔"

"ایسی ضروری بھی نہ تھی کام چل رہا تھا----"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ رحمان بزنس مین تھے۔ نئی گاڑی پر اتنی بڑی رقم خرچی تھی۔ جانتے تھے پرانی گاڑی سے بھی کام چل رہا ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ نئی گاڑی کے لیے ساجدہ نے اصرار کیا ہو گا---- اور ساجدہ کے اصرار کے سامنے انہیں انکار کی کبھی ہمت نہ ہوئی تھی ----

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے برخوردار ----" رحمان پائپ کا دھواں نکالتے ہوئے مسکرائے----

"آپ کی نوازش ہے، بہت بہت شکریہ ---- ویسے میں اسے پیسے کا ضیاع سمجھتا ہوں۔" میں نے ان پر لاشعوری طور پر رعب ڈالنے کے لیے کہا۔

"ہوں۔"

"پھر---- بات یہ ہے ---- کہ ----" میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔

"کیا----"

"نئی گاڑی کی قسط مجھے تنخواہ سے کٹوانا پڑے گی ----" میں نے کہا۔ چند لمحے رکا اور پھر بولا "میرے والد فوت ہو چکے ہیں۔ اور پورے خاندان کا بار میرے کندھوں پر ہے ---- پرانی گاڑی ٹھیک ٹھاک تھی ----"

وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر مسکرا دیئے "تمہیں اقساط نہیں دینا پڑیں گی۔"

"جی" میں اچھل پڑا۔"

گاڑی فیکٹری کی طرف سے تمہیں دی گئی ہے۔ تم فیکٹری کے لیے اتنی جان مار رہے ہو ---- یہ اس کا صلہ ہے۔"

میں چپ ہو گیا---- اس بات سے مجھے کچھ خاص خوشی نہ ہوئی۔ گاڑی فیکٹری کی ملکیت تھی۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ رجسٹریشن میرے نام کی ہو ---- بالکل ذاتی گاڑی ہو۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ رحمان بولے "گاڑی فیکٹری کی طرف سے ہو گی۔ لیکن ہو گی تمہاری ---- رجسٹریشن تمہارے نام کی ہو گی ----

میں سٹپٹا سا گیا۔ یوں لگا رحمان صاحب نے میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا----

لیکن وہ اپنی رو میں کہے جا رہے تھے ---- مجھ پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہو رہے تھے -----

موقع سے فائدہ اٹھانے میں تو میں طاق ہو چکا تھا---- بڑی انکساری کا اظہار کیا---- کئی بار پرانی گاڑی ہی رہنے دینے کو کہا۔

رحمان مجھ سے بے طرح مرعوب ہو گئے-----

میں اٹھنے لگا تو بولے "آج ساجدہ کے ساتھ جا کر گاڑی دیکھ لینا جو رنگ پسند ہو لے لینا----"

میں مجسم شکریہ بنا تھا---- من ہی من میں پھول رہا تھا۔

ابھی جانے نہیں پایا تھا---- کہ فون کی گھنٹی بجی ---- رحمان صاحب نے فون اٹھا لیا----

فون ساجدہ کا تھا---- رحمان نے اس سے چند باتیں کیں ---- پھر میری طرف دیکھا اور اس سے بولے۔

"راج یہیں ہیں ---- تم ان سے وقت طے کر لو ---- ہاں ---- ٹھیک ہے ---- آ جائیں گے۔ ہر حال میں پوچھ لوں ---- تم خود ہی بات کر لو-----"

رحمان صاحب نے فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو میاں خود ہی بات کر لو ----- ساجدہ ہے ----" وہ خود اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے -----

میں نے فون لے لیا---- علیک سلیک کے بعد ساجدہ نے گاڑی کے متعلق بتایا۔

"بھئی کیا ضرورت تھی نئی گاڑی کی ---- اچھا بھلا کام چل رہا تھا۔" میں نے اس سے زیادہ رحمان صاحب پر رعب ڈالنے کو کہا۔

"تم آج دوپہر کو ہمارے ہاں ہی آ جاؤ ----" اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا ---- "کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ -----"

"کیوں ---- کوئی خاص ڈش بنائی ہے۔"

"ہاں صرف تمہاری خاطر---- آؤ گے نا۔"

"ضرور۔"

"ڈیڈی کے ساتھ ہی آ جانا کھانے کے بعد گاڑی دیکھنے جائیں گے۔ ویسے تمہیں کون سا رنگ پسند ہے۔-"

"جو تمہیں پسند ہے۔"

"اپنی پسند کوئی نہیں۔"

"میری پسند تمہاری پسند کے تابع ہے۔"

"اوہو ----"

"سچ کہتا ہوں۔ گاڑی کا جو رنگ تمہیں پسند ہو۔ وہی لوں گا۔"

"مجھے تو سلور گرے پسند ہے۔"

"ٹھیک ہے ----"

"ایک گاڑی تھی سلور گرے ----"

"وہی لے لیں گے ----"

"کل میں اور ڈیڈی دیکھنے گئے تھے۔ میں نے یہ گاڑی تمہارے لیے پسند بھی کر لی تھی۔ پھر بھی تمہاری پسند کا پوچھنا تو تھا ----"

"شکریہ۔"

"تکلف جانے دو ---- آؤ گے نا ڈیڈی کے ساتھ۔"

"حضور سر کے بل آؤں گا۔"

"چاپلوسی مت کرو ----"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ دل ہی دل میں کہا "تمہاری تو ساری تمہارے باپ کی بھی چاپلوسی کروں گا۔ یہ ٹھاٹھ باٹھ ایسے ہی تھوڑا ملتے ہیں ----"

ساجدہ کے ساتھ کھانے کا وعدہ کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے بہت سارا کام کرنا تھا ---- اس لیے اپنے کمرے میں آگیا۔

○ ☆ ○

گھر میں کافی رونق اور گہما گہمی تھی ---- پھپھو جمیلہ مع بچوں کے آئی ہوئی تھیں۔ بڑی پھپھو بھی صبح آگئی تھیں ---- رانی اور تائی اماں بھی تھیں۔ قمو اور اس کا میاں بھی آئے ہوئے تھے۔ نعیمہ پھپھو تو پاس ہی تھیں ---- جب سب جمع ہوتے تو ان کو بھی بلا لیا جاتا ---- اور زیبی نے تو آنا ہی ہوتا تھا ----

امی نے قرآن پاک ختم کروایا تھا ---- محلے کی بی بیاں تو ختم کے بعد چائے مٹھائی اور پھل کھا کر چلی گئی تھیں۔ رشتہ دار عورتیں یہیں تھیں۔ دوپہر کے کھانے پر امی نے سب کو روک لیا تھا ----

خوب شاندار دعوت کا اہتمام ہوا تھا ---- اب گھر میں مستقل نوکرانی بھی آگئی ہوئی تھی۔ باورچی خانے کا سارا کام وہی کرتی تھی۔ امی تو اب صرف نگرانی کیا کرتی تھیں۔

ہمارے گھر کے حالات اب بالکل بدل گئے تھے ---- بیٹھک ڈرائینگ روم بن گئی تھی ---- قالین' صوفے' پردے اور آرائشی چیزیں خریدی گئی تھیں۔ کچن کے سامنے والا کمرہ ڈرائینگ روم بنا دیا گیا تھا ---- اس کمرے کا سارا فرنیچر میں نے نیا خریدا تھا ---- سامنے والے دالان میں دو نئے پلنگ بھی ڈالے گئے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل بھی بنوایا تھا۔ اب دیوار کے ساتھ وہ چھوٹا سا شیشہ نہیں تھا۔ جس میں سارا گھر اپنا چہرہ دیکھا کرتا تھا ---- بیضوی شیشے والی خوبصورت سنگھار میز وہاں رکھی تھی ----

اپنے کمرے میں بھی میں نے نیا بیڈ ڈلوایا تھا۔ فرش قالین سے ڈھانپا تھا ---- اور قالین کی مناسبت سے خوش رنگ پردے بھی لگوائے تھے ----

کھانے کے بعد سب بڑے دالان میں آبیٹھے تھے۔ تائی' پھپھو نعیمہ اور امی دوسرے کمرے میں تھیں ---- دونوں سمدھنیں جوڑے جانے کیا پلان بنا رہی تھیں ----

میں بھی دالان میں آبیٹھا ---- دونوں پلنگوں پر پھپھو جمیلہ اور بڑی پھپھو رانی اور قمو آڑی ترچھی لیٹی تھیں ---- زیبی پلنگ سے ٹیک لگائے ٹانگیں ٹکائے بیٹھی تھی ---- میں اندر آیا تو وہ سمٹ سی گئی ---- حیادار نظروں سے مجھے دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں ---- اس کی یہ ادا بڑی ظالم

تھی۔ میں اس کے عین سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"اوں ہوں" پھپھو جمیلہ نے شوخی سے آواز نکالی۔ میں جو پورے انہماک سے زیبی کو تک رہا تھا---- پھپھو کی آواز پر چونک گیا۔

"کیوں پھپھو" میں نے ان کی طرف دیکھا۔

وہ پلنگ میں اٹھ بیٹھیں اپنا بھاری وجود سمیٹتے ہوئے ہنس کر بولیں "تجھے کسی اور کا بھی ہوش ہے ندیدوں کی طرح اسے ہی تکے جا رہا ہے----"

"تو کیا آپ کو تکا کروں۔"

"بالکل----"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا---- زیبی شرما گئی----

"اے راجو" پھپھو دوپٹہ رانی کے کندھوں تلے سے کھینچتے ہوئے بولیں۔

"ہوں۔"

"تجھے کوئی احساس و خیال ہے میرا۔"

"کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ نئی گاڑی ملی ہے اور مجھے ایک بار بھی تو نے اس میں بٹھا کر سیر نہیں کرائی۔"

"بالکل بالکل" بڑی پھپھو بولیں۔

"کیا فائدہ اس بے مروت بھتیجے کی گاڑی کا۔"

"اللہ مبارک کرے" بڑی پھپھو بولیں "ویسے راجے تجھے سب کو سیر ضرور کرانا چاہئے۔"

"کیوں جی" میں نے شوخی اور شرارت سے زیبی سے پوچھا---- جیسے اجازت چاہی ہو ---- زیبی تو سرخ ہو گئی---- پھپھو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئیں----

یہی میں چاہتا تھا---- پھپھو جمیلہ سے میری دوستی بھی بہت تھی۔ اور لڑائی بھی خوب ہوتی تھی---- ذرا سا چھیڑ دیا۔ بس شروع ہو گئیں ---- ہم نوک جھونک کرنے لگے۔ سب اس سے خوب محظوظ ہو رہے تھے----

"تو تو ابھی سے جورو کا غلام بن گیا ہے۔ پھپھو کو سیر کرانے کے لیے منگیتر کی اجازت لے رہا ہے----"

"بری بات ہے کیا---- میں اور وہ دو تو نہیں" ---- میں نے شوخ ہوتے ہوئے بے باکی سے کہا----

زیبی تو شرم سے دوہری ہو گئی---- پھپھو بولیں۔ "بہت بے شرم ہو گیا ہے تو----"

"بے شرمی کی کیا بات۔"

"وہ بے چاری شرما رہی ہے اور تو پٹر پٹر بولے جا رہا ہے۔"

"ایکٹنگ کر رہی ہے۔ شرماتی ورماتی نہیں----"

"ایکٹر تو تم ہو" رانی نے شوخی سے مجھے دیکھا۔

"واقعی" قمو نے جواب دیا۔

خوب پر لطف چھیڑ چھاڑ ہوتی ہی۔

سب نے رات پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا---- نئی گاڑی کی خوشی میں سب یہ ٹریٹ لے رہے تھے۔

"اتنے لوگ گاڑی میں کیسے آئیں گے" زوبی نے کہا۔

"دو چکر لگائے گا" پھپھو بولیں----

"ایک چکر تو صرف آپ کے لیے لگانا پڑے گا----" میں نے پھپھو کو چھیڑا۔ جو ان دنوں کچھ زیادہ ہی موٹی ہو رہی تھیں ---- میری بات پر سب ہنس پڑے

"ایک چکر رانی کے لیے" پھپھو نے رانی کو چھیڑا---- اس کے بچہ ہونے والا تھا۔ وہ بھی خوب موٹی ہو رہی تھی----

"ٹھیک ہے جی" میں نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے---- آج سب کی ڈرائیوری کر لیں گے۔ لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا" سبھی بولیں۔

"ہر پھیرے میں زیبی میرے ساتھ رہے گی۔"

زیبی نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے سرزنش کیا---- اس کے گال گلابی ہو رہے تھے----

سب خوب چہک رہے تھے ---- باتوں سے باتیں نکل رہی تھیں موضوع کبھی شوخ اور کبھی سنجیدہ ہو جاتا----

پھپھو میری اس نوکری کے بارے میں پوچھنے لگیں ---- میری خوش نصیبی پر وہ نازاں تھیں----

"نوکری کیا ملی ہے الہ دین کا چراغ مل گیا ہے اسے تو" رانی نے ہنستے ہوئے کہا

"خدا نظر بد سے بچائے" قمو بولی۔

"آمین" رانی نے کہا۔

"ماشاء اللہ دنوں ہی میں خدا نے سن لی" پھپھو نے کہا۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ نوکری نہیں الہ دین کا چراغ ملا ہے اسے" رانی ہنس رہی تھی

-----اتنی جلدی تو ترقی کہیں بھی نہیں ملتی۔"

"محنت کرتے ہیں جناب محنت-----" میں نے سینہ تان کر کہا۔ "باس کو ہم ایسا آدمی کہاں ملا تھا کبھی-----"

اور

رانی بے خیالی ہی میں آچانک بولی "کہیں باس کا کچھ اپنا مطلب تو نہیں ----- جو دنوں میں نوازشات-----"

ہنس کر قمو بولی "اس کی کوئی بیٹی ویٹی تو نہیں-----" میرا دل دھک سے رہ گیا۔

اور زیبی کا چہرہ ایک دم ویران سا ہو گیا۔

میں جلدی سے بولا "پاگل ہو تم لوگ۔"

"یونہی بات کی ہے ----- باس کی اتنی مہربانیاں ----- کہیں کسی مقصد کے تحت نہ ہوں۔ اکثر فلموں اور کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے نا" رانی نے چھیڑا-----

بات میرے دل میں تیر کی طرح لگی تھی۔ لیکن سچائی کا اعتراف میں کیوں کر کرتا-----

زیبی کی نگاہوں میں شک رینگنے لگا تھا ----- اس لیے میں جلدی سے بولا "رانی ----- تم سدا کی بیوقوف ہو ----- تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے۔ کہ میرے باس کی کوئی بیٹی ہے نا بیٹا-----"

"اکیلا ہے بالکل" قمو حیرت سے بولی۔

"ہاں" میں بولا ----- صاف جھوٹ بولتے ہوئے میں ذرا بھی نہ ہچکچایا۔

"پھر ٹھیک ہے-----" پھپھو نے کہا۔ "چمٹے رہو اس کے ساتھ۔ کیا پتہ اس کی ساری دولت تمہارے نصیب ہی میں ہو-----"

میں نے پھپھو کے مذاق پر منہ بناتے ہوئے کہا "میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا پھپھو۔ حق حلال کی کمائی میں یقین رکھتا ہوں۔ جتنی زیادہ محنت کروں گا۔ اتنا ہی پھل پاؤں گا۔ ویسے میرا باس بہت اچھا آدمی ہے۔ کام کی قدر ضرور کرتا ہے-----"

"یہ قدر دانی ہی کا تو کمال ہے" پھپھو نے گردو پیش پر نگاہ ڈالی

"ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں-----" میں بولا-----

"جب اس کا بیٹا ہے نہ بیٹی ----- پھر دولت کو سر مارے گا

پھپھو نے ہنس کر کہا "بس تیری عیش ہو گی' دیکھ لینا-----"

"میں صرف اپنی محنت کے معاوضے پر نظر رکھتا ہوں پھپھو-----"

"خدا زندگی دے ----- پھلو اور پھولو-----"

"آمین" رانی اور قمو بڑی پھپھو نے کہا۔

زوبی گلابی شیر چائے بنا لائی تھی۔ اس نے سفید سفید بالائی والی گلابی چائے کے پیالے سب کو پیش کئے ----- الائچیوں والی چائے خوب گرم اور مزے دار تھی۔

چائے پی کر میں اٹھ کھڑا ہوا-----

"کہاں جا رہے ہو" رانی نے پوچھا-----

"فیکٹری۔"

"آج چھٹی نہیں"

"چھٹی ہے۔ پر مجھے نہیں"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"جناب ترقی یونہی نہیں ملتی۔ کام کرنا پڑتا ہے۔ دن رات-----"

"خدا ہمت دے۔"

"آمین"

"فیکٹری جا کر بھول نہ جانا" میں مڑا تو پھپھو کی آواز آئی۔

"کیا" میں نے پوچھا۔

"رات فلم پہ لے جانا ہے ہمیں" پھپھو نے یاد دلایا-----

"زیبی سے پوچھ لیں ----- لے جانے پر راضی ہے تو ٹھیک ہے" میں نے کمرے سے نکلتے نکلتے پھپھو کو چھیڑا-----

اور-----

پھپھو حسب عادت برا بھلا کہنے لگیں۔

میں خوشی و مسرت سے جھومتا باہر آ گیا۔ انہیں رات پکچر دکھانے کا پکا پروگرام بنا لیا تھا۔

○ ☆ ○

نئی گاڑی کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اور خاص کر اس وقت جب برابر والی سیٹ پر اک نوجوان لڑکی بیٹھی ہو ---- نشہ در نشہ ہو جاتا ہے۔ رات میں گھر کے سب بچوں کو جن میں پھپھو جمیلہ کے بچے اور خالہ زہرہ کی دو بیٹیاں بھی شامل تھیں سیر کے لیے لے گیا تھا۔ زیبی اور زوبی کو بھی ساتھ لیا تھا ---- دونوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ زیبی نے پہلے زوبی کو بٹھایا تھا۔ لیکن میں نے گھور کر اسے دیکھا تھا ---- نگاہوں کا مفہوم وہ سمجھ گئی تھی۔ اور چپ چاپ زوبی کو دوسری طرف کر کے میرے قریب بیٹھ گئی تھی ---- میں اب ایک ماڈرن منگیتر تھا ---- اور میری خوشنودی زیبی تو کیا پھپھو فہمیدہ کو بھی منظور تھی ---- میں جوں جوں اونچا جا رہا تھا۔ پھپھو فہمیدہ میں خاص طور پر بڑی واضح تبدیلی محسوس کر رہا تھا ---- اک وقت تھا۔ کہ وہ شاکے نڈے کو مجھ پر ترجیح دینے پر تلی ہوئی تھیں ---- اور ایک یہ وقت تھا کہ گلی محلے اور برادری کی بندشوں میں جکڑے ہونے کے باوجود میری ہر بات پر رضامندی کا بلا چون و چرا اظہار کر دیتی تھیں۔ مجھے دیکھ دیکھ پھولی نہ سماتی تھیں۔ اور میری تعریفیں کرتے کرتے ان کی زبان نہ تھکتی تھی۔

میں زیبی کو سب کے ساتھ پکچر دکھانے لے گیا تھا۔ رات سیر کے لیے بھی اسے ساتھ لیا تھا۔

پھپھو نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ اب میں کبھی زیبی کو اکیلے بھی سیر کے لیے لے جانا چاہوں تو وہ اعتراض نہ کریں گی۔ اتنی اعلیٰ پوزیشن پر فائز داماد ---- جو دنوں میں ترقی کر رہا تھا ---- جس کا مستقبل بڑا تابناک تھا ---- اس کی بات ٹالنے کی ان میں ہمت کیسے ہو سکتی تھی ---- زمانے کے انقلابات ہی تھے نا ---- میں دل ہی دل میں مسکراتا تھا ---- یہ مایا بڑی ظالم شے ہے ---- دلوں اور ذہنوں کا خدا ہے۔

رات ہم لمبی ڈرائیور پہ نکل گئے تھے۔ زیبی میرے پہلو میں تھی۔ کبھی کبھی اس کی معطر زلفیں ہوا کے جھونکوں سے اڑ کر میرے چہرے اور کندھے کو چھو جاتیں ---- کبھی کسی موڑ پر میرا جسم اس کے سنہرے نرم و گداز بدن سے چھو جاتا ---- میرے حواس پر نشہ سا چھا جاتا ---- زیبی کی شرمیلی ادائیں من میں ہلچل مچا دیتیں۔

سڑک کے کنارے کار روک کر ہم چند منٹ رکے بھی تھے۔ چاندنی رات بڑی خنک تھی ---- بچے گاڑی سے اچھل کود کر باہر نکلے ----

"بچو صرف پانچ منٹ۔" میں نے گھڑی دیکھ کر بچوں سے کہا۔ "درختوں تلے دوڑ بھاگ سکتے ہو ----"

زیبی بھی اترنے لگی۔ تو میں نے اس کے بازو میں ہولے سے چٹکی بھری "بیٹھی رہو" زوبی باہر نکل گئی تھی۔ اس نے زیبی کو بھی بلایا۔

"تم بچوں کا دھیان رکھو ---- سڑک پر نہ آئیں" میں نے زوبی سے کہا۔ وہ بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

میں زیبی سے باتیں کرنے لگا ---- میں نے بے تکلفی سے اس کا نرم و گداز ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا ---- وہ شرمائے جا رہی تھی ---- شرمیلی ادا کتنی پیاری تھی ---- میرا جی چاہ رہا تھا اسے بازوؤں میں بھر لوں ----

"زیبی" ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا۔

"ہوں۔"

"ہماری شادی کب ہو رہی ہے؟"

میرے اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر وہ شرم سے سرخ ہو گئی ---- میں نے پوری جذباتی قوت سے اس کا ہاتھ دبایا ---- میں خود ہی بولا "پھپھو فہمیدہ کا خیال ہے شادی ایک سال بعد کریں گی' امجد دوبئی سے واپس آئے گا تو پھر ----"

"ہاں" وہ شرمیلے لہجے میں بولی۔

"اتنا طویل عرصہ۔"

"گزر ہی جائے گا۔"

"گزارنا مشکل ہو گا۔"

وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ اور میں لطف و انبساط کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا ---- میں سرشار سے لہجے میں بولا زیبی تم بڑی لکی ہو ---- جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے ---- لہر بحر ہو گئی ہے ----"

"خدا نے اتنی اچھی نوکری دے دی ----" زیبی مسرور لہجے میں بولی ----

میرا ضمیر شاید مر چکا تھا ---- میں نے اثبات میں سر ہلایا ---- پھر بولا "آگے آگے دیکھتی جاؤ ---- سیٹھ کی ساری دولت اپنی ہو گی۔"

"تمہیں بیٹا بنا لیا ہے اپنا ----" وہ معصومیت سے بولی۔

"ہاں ---- یہی سمجھو----"

"بیچارے کا کوئی نہیں----"

"نہیں۔"

میں صاف جھوٹ بول گیا۔ میں نے پہلے بھی گھر والوں کے سامنے جھوٹ بولا تھا---- رحمان صاحب کی بیٹی کو سرے سے غائب ہی کر دیا تھا---- اور کمال تو یہ ہے کہ جھوٹ بولتے وقت مجھے ملال ہوا تھا نہ افسوس ---- حالانکہ میری تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ ہی میں نے آج تک کسی مفاد کے پیش نظر جھوٹ بولا تھا----

لیکن

اب تو مجھے جانے کیا ہوتا جا رہا تھا---- اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت سمجھتا ہی نہیں تھا---- مفاد کی خاطر جھوٹ اور اداکاری کو قطعاً برا نہ سمجھتا تھا----

ہم دو گھنٹے کی پر لطف سیر کے بعد واپس لوٹے تھے---- زیبی کا انگ انگ خوشیوں سے ناچ رہا تھا---- اور میری خوشیوں کا ٹھکانہ بھی کہاں تھا۔ زیبی میرے دل و دماغ پر چھائی تھی----

دوسرے دن میں فیکٹری گیا---- فیکٹری کا کام میں پوری تندہی اور جانفشانی سے کر رہا تھا ---- پروڈکشن شروع تھی ---- اور آرڈرز کی بھرمار تھی ---- شفٹوں میں کام ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ اتنے مال کی سپلائی ناممکن تھی----

پہلی شفٹ ختم ہو گئی تھی ---- اور دوسری شفٹ کے لوگ آ رہے تھے۔ میں ان کی نگرانی کے لیے ابھی فیکٹری ہی میں تھا---- کہ ساجدہ کا فون آ گیا۔ میں شیڈ میں کھڑا تھا---- کہ چوکیدار نے اطلاع دی۔

"سر آپ کا فون"

میں جلدی سے دفتر کی طرف لپکا---- دفتر اب تقریباً مکمل ہی تھا---- میں نے دانستہ اسے بعد میں مکمل کروایا تھا۔ فیکٹری چالو کرنے اور پروڈکشن کی اہمیت زیادہ تھی۔ اس بات سے رحمان مجھ سے زیادہ ہی مرعوب ہوئے تھے----

"ہیلو" میں نے فون اٹھایا---- بھونڈی آواز کانوں میں اتری۔

"ساجدہ۔"

"ہوں۔"

"کیا حال ہے۔"

"تم کہو---- کہاں غائب رہتے ہو۔"

"آپ کی یہ فیکٹری لے بیٹھی ہے۔"

"آفس ٹائم ختم ہو چکا ہے۔"

"لیکن میری ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔"

"راجو تم بہت زیادہ کام کر رہے ہو۔"

"تم خوش نہیں ہو۔"

"ہوں تو ---- لیکن۔"

"لیکن کیا----"

"اوور ورک ٹھیک نہیں ہوتا----"

میں ہنس کر بولا ---- فکر نہ کرو۔ میں بڑا مضبوط اور صحت مند آدمی ہوں بیمار نہیں پڑوں گا----"

"ہائے اللہ۔ ایسی باتیں مت کرو----"

میں شوخی سے بولا "اور کبھی کام کی زیادتی سے بیمار پڑا---- تو خدمت کے لیے جو نرس رکھوں گا جانتی ہو کون ہو گی۔"

"کون" اس کی آواز میں سرور تھا۔

"مس ساجدہ ڈوگر" میں ہنس کر بولا----

"خدا نہ کرے جو تم کبھی بیمار پڑو ----" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے تم میری خدمت سے گریزاں ہو" میں ہنسا۔

وہ ہنسی ---- پھر بات بدلتے ہوئے بولی "راج ---- آج آؤ گے۔"

"کہاں۔"

"ہمارے ہاں۔"

"خیریت۔"

"نئی گاڑی کی ٹریٹ نہ دو گے۔"

"اوہ ہاں۔ ضرور ضرور ----"

"تو پھر آجاؤ ---- کہیں گھومیں پھریں گے۔"

"بہتر۔"

"کب آؤ گے۔ میں تیار رہوں۔"

"ایک گھنٹے تک۔"

"ابھی کیوں نہیں۔"

"بھئی کام ہے ---- کام کروا کے آؤں گا۔"

"اچھا---- میں تیار ہو جاؤں گی جب تک۔"

"شاندار سا ڈریس پہننا----" میں نے تمسخر سے کہا۔ جسے وہ حسب معمول سچ سمجھی ---- اقرار کر لیا---- میں نے شیطانی مسکراہٹ لبوں میں چھپائے ہوئے اس سے چند باتیں اور کیں۔ میک اپ کرنے اور اپنی من پسند پرفیوم استعمال کرنے کا کہا۔

پھر فون بند کر کے میں کام کی طرف متوجہ ہو گیا---- کام کچھ زیادہ ہی تھا---- کچھ مال ڈسپیچ ہونا تھا۔ ٹرک لوڈ کروانا تھا۔ اور کچھ نئی شفٹ والوں کو ڈیوٹی سمجھانا تھا۔ میرا اسسٹنٹ طارق بھی کافی محنتی اور ایماندار آدمی تھا۔ یہ سارے کام وہ بھی کروا سکتا تھا۔ کرواتا بھی تھا۔ لیکن میں بھی اپنی اہمیت اور اپنا آپ منوانے کے در پہ رہتا تھا۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی کام میں الجھا رہتا----

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ تو ساجدہ کا پھر فون آ گیا۔ وہ خاصی برہم تھی ---- اور جانے کیوں مجھے اس کی برہمی اچھی لگی ----

"غصہ گلہ جانے دیں سرکار---- بندے سے غلطی ہو گئی۔ ابھی حاضر خدمت ہوتا ہوں۔"

وہ بدستور برہم تھی یہ ابھی کتنے گھنٹوں کی ہو گی۔"

میں ہنس پڑا----

وہ چڑ کر بولی "ابھی آجاؤ---- نہیں آئے تو میں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ پھر کبھی۔"

"نہ نہ ---- نہ ---- یہ ظلم نہ کرنا----" میں نے جلدی سے کہا۔

"مر جاؤں گا۔"

"اونہہ ---- بڑے آئے۔"

"سچ کہتا ہوں۔"

وہ اترانے لگی---- نرمی سے بولی "میں دیر سے بیٹھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں----"

"بس ابھی آیا----"

"پھر ابھی کہا ہے۔"

"لو حضور آ گیا----"

میں نے فون رکھا---- اور طارق کو ضروری باتیں سمجھا کر گاڑی میں بیٹھا----

چند منٹ بعد میں مال پر گاڑی اڑائے ساجدہ کی طرف جا رہا تھا۔

بے حد مسرور اور بے حد شاداں----

"شکر ہے فرصت مل گئی---- کب سے تیار ہو کر بیٹھی ہوں

ساجدہ نے شکوہ کیا۔

"آہا----" میں نے گاڑی بند کرتے ہوئے اس کے سراپا پر نگاہ ڈالی۔ وہ کچھ لجا گئی۔

اس نے آج بڑا خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ جو اس کے جسم کی ساری بدصورتی کو اجاگر کر رہا تھا---- چہرے پر کچھ الٹے سیدھے کاسمیٹکس بھی آزمائے تھے۔ جو بے ہودہ لگ رہے تھے۔ میں نے ہی تو اسے تاکید کی تھی ---- بے چاری میرے تمسخر کو کہاں سمجھتی تھی۔ وہ تو سنجیدگی سے میری محبت میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

"بہت دیر کر دی۔ مجھ سے انتظار نہیں ہوتا----" وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

"بے صبری اچھی نہیں ہوتی جان من" میں بے تکلفی سے مسکرایا۔ میرے طرز تخاطب پر وہ کچھ سرخ سرخ ہو گئی۔

"کہاں لے جاؤ گے" اس نے میرے گاڑی سے باہر آتے ہی پوچھا۔

"جہاں سے واپس نہ آ سکیں۔"

"بڑے خوش ہو ---- بہک رہے ہو۔"

"تمہیں دیکھتے ہی نہ جانے کیوں بہکنے لگتا ہوں۔"

"چلو زیادہ باتیں نہیں بناؤ----" وہ گاڑی سے پرے ہٹتے ہوئے بولی پھر میرے سراپا پر نظر ڈالی۔

میرا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے کچھ خود خراب کر لیا تھا۔ باپ بیٹی پر رعب ڈالنے کے لیے۔

"تم بہت زیادہ کام کرنے لگے ہو راج۔ دیکھو تو حالت کیا بنا رکھی ہے۔"

"یہ کام مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے ---- میری جان ---- اس لیے کہ یہ تمہارا کام ہے۔"

میں نے اسے خوب ہوا دی ---- خوب پھلایا---- اسی میں میرا مفاد تھا۔ میں دانستہ ایسا کر رہا تھا----

"چلو اندر۔ منہ ہاتھ تو دھو گے" اس نے خوشی سے پھولتے ہوئے کہا۔

"ضرور دھوؤں گا اور کپڑے بھی بدلوں گا۔"

"کپڑے؟"

"جی حضور ---- مانا کہ آپ کا ملازم ہوں لیکن آپ یوں بن ٹھن کر جائیں۔ تو مجھے بھی صاف ستھرے کپڑے پہننے کا حق ہے۔"

وہ بڑے انداز سے مسکرائی ---- اور اس کی یہ مسکراہٹ مجھے بے حد خوبصورت لگی۔

بھدے اور بدصورت چہرے پر اتنی خوبصورت مسکراہٹ ----- میں حیران سا ہوا ----- لیکن جذبے شاید خوبصورت ہی ہوتے ہیں ----- محبت کے پاکیزہ جذبے ----- میں اندر ہی اندر کانپ سا گیا-----

میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ٹنگا اپنا پیل اوور قمیض اور پتلون والا ہینگر نکالا-----

ساجدہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا ----- "اچھا تو جناب کپڑے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ گویا کہ پہلے سے پروگرام تھا-----"

"ضرور تھا-----"

"نئی گاڑی کی ٹریٹ؟"

"اوہ خدایا ----- نئی گاڑی ----- مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مس ساجدہ ڈوگر صاحبہ ----- نئی گاڑی کی خوشی میں کپڑے ساتھ لے کر نہیں آیا تھا-----"

"تو-----"

"تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے کا پکا پروگرام تھا----- اس لیے۔"

"واقعی۔"

اس کی چندھی چندھی آنکھوں میں خیرہ کن چمک تھی ----- ان لمحوں وہ کس قدر مسرور نظر آ رہی تھی ---

میں ہینگر اٹھائے اس کے ہمراہ اندر چلا آیا ----- ڈرائینگ روم سے ملحقہ گیسٹ روم تھا ----- مجھے ساجدہ نے وہیں جا کر کپڑے بدلنے کو کہا۔

ڈرائینگ روم میں رحمان صاحب بیٹھے تھے۔ دو تین دن سے رحمان صاحب سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس لیے میں چند لمحے رک گیا۔

"آؤ بھئی ----- آؤ -----" وہ تپاک سے بولے "بیٹھو بیٹھو-----"

"پہلے انہیں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لینے دیں" ساجدہ جلدی سے بولی "دیکھیں تو سہی ----- کیا حلیہ بنا ہوا ہے ان کا-----"

میں شوخی سے مسکرایا ----- رحمان نے بڑی شفقت بھری نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا "راج بیٹے ----- تم جس تندہی سے کام کر رہے ہو۔ میں تمہارا ممنون احسان ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل۔"

"سچ پوچھو تو تمہاری یہ لگن دیکھ دیکھ کر مجھے کسی وقت شرمندگی بھی ہوتی ہے۔۔"

رحمان جانے کیا سوچتے ہوئے بولے۔

میرے کسی جواب سے پہلے ہی ساجدہ دھم سے ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی ----- اور

روٹھے روٹھے شاکی انداز میں بولی "بس ڈیڈی۔ آپ صرف یہی کہتے رہیں گے ----- آپ کو عملی کام بھی کرنا چاہیے ----- صرف زبانی زبانی-----"

میں کچھ نہ سمجھا ----- رحمان مسکرائے اور بیٹی کو بازو کی لپیٹ میں لے کر بولے' تمہارا کہا اٹل ہوتا ہے بیٹے ----- تمہاری بات نہیں مانوں گا تو اور کس کی بات مانوں گا۔"

"لیکن کب-----"

رحمان نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میں باپ بیٹی کی باتوں اور رویے سے کچھ نہ سمجھ سکا تھا ----- ہونقوں کی طرح دونوں کا منہ تکنے لگا۔

"بھئی راج" وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"جی" میں ہمہ تن گوش ہوا-----

"بھئی ساجدہ کی اک تجویز ہے" وہ مسکرائے-----

"کیا" میں نے ساجدہ کی طرف دیکھا۔

"کہ تمہاری تنخواہ بند کر دی جائے" وہ شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولے۔

"جی -----" میرے منہ سے ایک لمبی جی نکلی ----- ساجدہ اور رحمان دونوں مسکرا دیے۔

میں اپنے استعجاب کو چھپانے کے لیے ان کی سنگت میں مسکرا دیا-----

"اچھی تجویز ہے" میں نے جبر کر کے کہا۔

"بغیر تنخواہ کے کام کریں گے؟" ساجدہ بھی شوخی سے بولی۔

"بالکل ----- مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنی ذاتی فیکٹری چلا رہا ہوں" میں نے کہہ دیا-----

"جیتے رہو ----- جیتے رہو" رحمان نے بلند آواز میں کہا ----- ساجدہ بھی جھوم گئی -----

"دیکھا" اس نے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

رحمان مجھ سے مخاطب ہوئے -----" راج بیٹے ----- ساجدہ کی تجویز یہ ہے ----- کہ فیکٹری میں تمہیں شیئر ہولڈر بنایا جائے -----"

میں گنگ ہو گیا ----- ساجدہ کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔ پھر رحمان کی طرف ----- وہ دونوں بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔

میں نے چند لمحے اس تجویز پر غور کیا ----- پھر انکساری سے بولا "آپ کا بہت بہت شکریہ انکل ----- لیکن مجھے افسوس ہے -----"

"کس بات کا" ساجدہ نے میری بات اچک لی۔

"میرے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ شیئر ہولڈر بننے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ساجدہ اطمینان سے مسکرائی ---- پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "شیئر ہولڈر ڈیڈی نے شاید غلط لفظ استعمال کیا ہے۔"

"پھر۔"

"پرافٹ ہولڈر-----"

"کیا؟۔"

"بھئی۔" رحمان صاحب ساجدہ سے پہلے بول اٹھے "ساجدہ مصر ہیں کہ اس نئی فیکٹری کے پرافٹ میں آپ کو شیئر دیا جائے یعنی کچھ فیصد-----"

میں حیران سا دونوں کا منہ تکنے لگا۔

"کم از کم ٹونٹی پرسنٹ" ساجدہ نے مسکرا کر ڈیڈی کی طرف دیکھا-----

وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکرانے لگے۔

اور

میں

میں

تو جیسے ہونے اور نہ ہونے کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔

"کل دفتر میں بات کریں گے" رحمان میری حالت سے بے خبر سے تھے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ساجدہ صوفے میں پھیل کر متبسم نظروں سے انہیں دیکھتی ہوئی بولی "کھل کر بات ہو گی ڈیڈی ---- آپ اس بات کو قانونی شکل دینے کی بات کریں۔"

"اچھا بھئی اچھا کل ہی میں اپنے وکیل سے بات کروں گا-----"

رحمان باہر نکل گئے -----

میں ہینگر دوسرے صوفے پر پھینک کر ساجدہ کے قریب آ بیٹھا ---- اور اس کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "یہ تمہیں کیا سوجھی؟"

"کیوں" وہ اعتماد سے مسکرائی۔

"لیکن ساجدہ---- میں یہ بات مناسب نہیں سمجھتا۔"

"کیوں۔"

"میں ملازم ہوں۔ مالک نہیں۔"

"راج ---- تم فیکٹری چلا رہے ہو۔ چلاؤ گے۔ دن رات اس کے لیے کام کرو گے ----- میرے خیال میں تو تمہیں ففٹی پرسنٹ پرافٹ لینے کا حق ہے۔"

میرا دل دھک کرنے لگا۔

میں چند لمحے چپ رہا---- پھر سر اٹھا کر سنجیدگی سے اس بدصورت شکل لیکن خوبصورت دل والی لڑکی نماشے کو دیکھا۔

"ہاں راج ---- یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ڈیڈی نے انوسٹمنٹ کی ہے۔ تم کام کر رہے ہو ---- پرافٹ ففٹی ففٹی ہونا چاہئے -----"

"نہیں ساجدہ -----"

"میں ڈیڈی کو اس پر بھی رضامند کر لوں گی ---- لیکن تمہیں کام پھر اسی طرح کرنا پڑے گا۔ جیسے یہ تمہاری ذاتی فیکٹری ہو -----"

"کام میں کوتاہی میں اب بھی نہیں کر رہا۔"

"میں جانتی ہوں ---- تم محنتی ہونے کے ساتھ لکی بھی ہو ---- تمہاری وجہ سے فیکٹری کو اتنا کام مل رہا ہے-----"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"پھر میری تجویز بھی ٹھیک ہے۔ فی الحال ٹونٹی پرسنٹ ---- پھر ففٹی ففٹی۔"

"ساجدہ۔"

وہ بڑے تفاخر سے مسکرائی-----

میں نے بے اختیارانہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ---- یہ ہاتھ ---- جی چاہا چوم لوں ---- غیبی خزانے کی کنجی تھی یہ ہاتھ --- ٹونٹی پرسنٹ پرافٹ !!!

"یا خدا۔"

"کیا چھپڑ پھاڑ کر دے رہا ہے مجھے۔"

میں نے دونوں ہاتھوں میں ساجدہ کا سوکھا اور مڑا تڑا ہاتھ دباتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

ساجدہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ آہستگی سے میرا ہاتھ پرے کیا۔ اور اپنا ہاتھ میرے دوسرے ہاتھ سے نکالتے ہوئے بولی۔

"چلو تیار ہو جاؤ ---- ہم نے تو کہیں چائے وائے پینے کا پروگرام بنایا تھا۔"

"ضرور ---- ضرور -----"

میں اٹھا ---- ہینگر اٹھایا ---- اور گیسٹ روم میں چلا گیا ---- میرے قدم ڈول رہے تھے۔

خوشیوں کا بار سنبھالا نہ جا رہا تھا۔ ٹونٹی پرسنٹ پرافٹ کا حصہ دار ہونا۔ اف میری تو کایا ہی پلٹ رہی تھی -----

میرا جی چاہ رہا تھا۔ اڑ کر گھر پہنچوں اور یہ مژدہ جانفزا سب کو چیخ چیخ کر سناؤں۔

لیکن

میں ابھی گھر نہیں جا سکتا تھا۔ ابھی تو میں نے غیبی خزانے کی اس کنجی کو گھمانے پھرانے لے جانا تھا۔ اس پر اپنی چاہتوں اور محبتوں کا بھرپور اظہار کرنا تھا۔

مجھے اس وقت شکیل بے طرح یاد آ گیا ---- ساجدہ کو زینہ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کا خط آیا تھا۔ اور اس نے شوخی سے ساجدہ کی بجائے زینہ ہی لکھ کر اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ میں نے بھی جواب میں لکھا تھا۔ "زینہ خوب ہے اور میں سوچ سمجھ کر اس پر جما جما کر قدم رکھ رہا ہوں ----"

تیار ہو کر باہر نکلا ---- ساجدہ میرے انتظار میں بیٹھی تھی ---- مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی ----

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے باہر آئے ---- گاڑی میں بیٹھے ---- اور پھر تار کول کی چکنی سڑکوں پر گاڑی فراٹے بھرنے لگی ----

میں نے اپنا ایک ہاتھ ساجدہ کی کمر کے گرد لے جاتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی ---- میں نے اسے اور قریب کیا۔

اور

پھر

میں نے اسے بازو میں لپیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا ---- سوکھی لڑکی کی ہڈیاں میرے بدن میں چبھ گئیں ---- میں کسی لطف کی کیفیت سے دو چار نہ ہوا ---- دو چار ہونا بھی کب چاہتا تھا ---- دو چار کرنا چاہتا تھا۔

سو میں نے کر لیا۔

ساجدہ سوکھی سڑی لکڑی سی ہونے کے باوجود سیال سی شے بن کر میرے بازو میں جیسے بہہ گئی۔

یہ آج خوش کن بات کا خراج عقیدت تھا۔ میں نے ساجدہ کو پیش کر دیا ---- وہ مجھے اور ٹوٹ کر چاہنے لگی ---- اور مجھے چاروں طرف فوائد ہی فوائد بکھرے نظر آنے لگے۔

اف

میں کس قدر مادہ پرست ہو گیا تھا ----

○ ☆ ○

ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔

لان میں نرم نرم دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ ہوائیں سبک خرام تھیں۔ پھولوں کے سینوں میں محفوظ خوشبوؤں کو یہ ہوائیں چرا کر فضا میں بکھیر رہی تھیں۔ معطر معطر سی فضا سنہری دھوپ میں بڑی نکھر رہی تھی۔

میں اور ساجدہ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے ---- مجھے آج کچھ مسائل جن کا تعلق نئی فیکٹری سے تھا رحمان صاحب اور ساجدہ سے ڈسکس کرنا تھے۔ میں ان دنوں ایکسپورٹ کے پیچھے پڑا ہوا تھا ---- مڈل ایسٹ اور افریقہ کے کچھ ملکوں میں ہماری پائپ کی کھپت بڑے معقول پرافٹ پر ہو سکتی تھی ---- میں خط و کتابت کر رہا تھا ---- لیکن خط و کتابت ان معاملوں میں اتنی موثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہاں خود جا کر بات طے کریں۔ بڑی بڑی پارٹیوں سے ملیں اور اپنے مال کی کھپت کے مواقع کا جائزہ لیں۔

میں اور ساجدہ یہی باتیں کر رہے تھے ---- ساجدہ نے تو ان دنوں فیکٹری کا کام بالکل ہی چھوڑ دیا تھا ---- وہ دونوں فیکٹریوں کے نظم و ضبط کے لیے میری ذات پر بھروسہ کرنے لگی تھی۔ اور یہ حقیقت تھی۔ کہ میں اپنی بساط سے بڑھ کر کام کر رہا تھا ---- نئی فیکٹری تو پوری میری ذمہ داری پر چل رہی تھی ---- پہلی فیکٹری کا بھی ڈھیر سارا کام میرے ذمہ ہی تھا ---- میں نے کہا نا ---- کہ میں کام میں ہیرا پھیری یا بے ایمانی نہیں کرتا تھا ---- بے ایمانی تو صرف ساجدہ سے کر رہا تھا ----

ساجدہ!

جسے اپنی چاہتوں اور محبتوں کے جال میں الجھا کر میں اتنے مالی فوائد حاصل کر رہا تھا ---- کہ میری اور میرے خاندان کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ صرف حالت ہی نہ بدلی تھی۔ ذہن بھی بدل گئے تھے۔ اب ہم ماڈرن لوگ بنتے جا رہے تھے۔ خاص کر میں ----

رحمان صاحب ابھی گھر نہیں آئے تھے ---- میں ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ساجدہ ان باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہی تھی ----

"ڈیڈی آئیں گے تو ان سے بات کرنا ----- مجھے کیا پتہ ----- کیا کرنا چاہیے۔"

"تم فیکٹری کی مالک ہو۔"

"نہیں بھئی ----- میں نے یہ درد سری چھوڑ دی ہے۔"

"تمہیں دلچسپی لینی چاہیے۔"

"اوں ہوں ----- ہاں چائے منگواؤں۔"

"ضرور-----۔"

ساجدہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ملازم کو آواز دی۔ ملازم کی جگہ ملازمہ باہر آگئی۔ موٹی تازی ادھیڑ عمر کی عورت۔ میں نے ان کے ہاں آج پہلی مرتبہ دیکھی۔

"راجاں۔"

"جی بی بی جی۔"

"سیفو کہاں ہے۔"

"بازار گیا ہے جی۔"

"تو تم چائے بنا لاؤ -----"

"اچھا جی۔"

"دیکھو چائے خوب تیز ہو اور دودھ بھی ٹھنڈا نہ لے آنا۔"

"نہیں بی بی جی -----" وہ پیلے پیلے دانت نکال کر مسکرائی۔

"جاؤ جلدی سے بنا لاؤ چائے ہم دونوں کے لیے۔"

"اچھا جی۔"

وہ مڑ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ میں نے ساجدہ سے پوچھا "نئی ملازمہ رکھی ہے؟"

"سیفو کی بیوی ہے-----"

"خانساماں کی۔"

"ہاں۔"

"پہلے کبھی دیکھا نہیں اسے۔"

"گاؤں میں رہتی تھی ----- اب انہیں پچھلا کوارٹر دے دیا ہے۔ بال بچوں سمیت یہیں آگئی ہے ----- ویسے اس کے آنے سے کچھ رونق ضرور ہو گئی ہے۔ اس کی بیٹی بھی ہے۔ میرے چھوٹے موٹے کام وہی کر دیتی ہے۔"

"اچھی بات ہے ----- تمہیں گھر پہ کچھ کمپنی ملنے لگی" میں ہنس کر بولا۔

"واقعی راج----- تم سوچ بھی نہیں سکتے ----- کہ اکیلے رہتے ہوئے میں کتنی بور ہوتی تھی

----- اس کی بارہ تیرہ سالہ لڑکی تو خاصی باتونی ہے۔ خوب باتیں کرتی رہتی ہے۔ یہ خود بھی مزے کی عورت ہے۔ ہنسنے ہنسانے کا فن اسے خوب آتا ہے۔ ویسے بھی جب مجھے پیار کرتی ہے تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے -----"

ساجدہ نے ایک لمحہ کو آنکھیں بند کر کے جیسے اس سکون کو محسوس کیا----- میرا دل پسیج گیا ----- مجھے اس اکیلی لڑکی پر بے حد ترس آیا-----

ساجدہ نے آنکھیں کھول دیں ----- کرسی میں ٹھیک ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈی نے آج دیر لگا دی-۔"

"آتے ہی ہوں گے-----"

"فون کروں فیکٹری۔"

"تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں۔ کوئی بات نہیں مجھے کہیں جانا نہیں ----- یہیں بیٹھا ہوں۔"

وہ مسکرائی ----- اور اس کے چوڑے دہانے کے پتلے پتلے ہونٹ بے نقطے کی بے بناتے ہوئے پھیل گئے-----

ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے ----- آج میں نے ساجدہ کی گھریلو زندگی کے متعلق کچھ باتیں کیں ----- اس کی ماں کے متعلق پوچھا۔

اس کے عزیز و اقارب کے بارے میں کچھ جاننا چاہا----- اس نے وضاحت سے سب کچھ بتا دیا ----- رشتہ دار کوئی تھے ہی نہیں۔ والد تو بالکل ہی اکیلے تھے۔ ماں کی طرف سے دور پار کی عزیز داری تھی۔ جو ماں کے مرنے کے بعد تقریباً ختم ہی تھی ----- رحمان صاحب نے یہ بزنس بالکل چھوٹے پیمانے پر شروع کی تھی ----- جو ان کی محنت' ہمت اور قسمت سے اس طرح پھیل گئی تھی-----

"میرے ڈیڈی بڑے عظیم انسان ہیں" اس نے عقیدت سے کہا۔ پھر چند لمحے چپ رہ کر بولی "مجھ جیسی لڑکی کے لیے انہوں نے اپنی جوانی گنوا دی ----- میری ممی جب میں دو سال کی تھی فوت ہو گئی تھیں -----"

میں بے حد متاثر ہوا-----

"ڈیڈی بہت ہی اچھے ہیں راج----- وہ میرے صرف باپ ہی نہیں ٹوٹ کر چاہنے والے دوست بھی ہیں۔ انہیں پتہ ہے ----- بدصورتی میرا مقدر ہے ----- اس لیے انہوں نے ہر ممکن کوشش سے اس کا مداوا کیا ہے۔ تاکہ مجھے اس کمپلیکس سے نجات دلا سکیں ----- وہ میری ہر بات مانتے ہیں کہ کہیں میرا دل اور نہ دکھ جائے ----- میں بھی اب اتنی نازک طبع ہو گئی ہوں

-----کہ دل دکھنا برداشت ہی نہیں کر سکتی-----"

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

میں اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا----- میرے دل میں اس کے لیے جذبہ ترحم پھیل رہا تھا----- ان لمحات میں وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی----- میں اس کی طرف تکے جا رہا تھا-----

ملازمہ چائے لے آئی----- درمیانی میز پر اس نے چائے کی ٹرے رکھ دی----- ایک پلیٹ میں بسکٹ بھی رکھے تھے-----

چائے آنے سے باتوں کا موضوع بھی بدل گیا----- لیکن فضا میں گھمبیر سی سنجیدگی چھائی رہی-----

ساجدہ نے دو پیالیوں میں چائے بنائی----- ایک پیالی میرے سامنے رکھ دی دوسری اپنے سامنے-----

پھر بسکٹوں والی پلیٹ میری طرف بڑھائی-----

"نہیں شکریہ" میں نے کہا "صرف چائے پیوں گا-----"

"کوئی نمکین چیز منگواؤں۔"

"نہیں----- چائے پیوں گا خالی۔"

میں نے چائے کی پیالی اٹھا کر لبوں سے لگائی----- ایک گھونٹ لیا۔ چائے اچھی بنی تھی-----

"اچھی چائے بنی ہے" میں نے کہا۔

"اسے میں نے بنانی سکھائی ہے" وہ اترائی-----

"تمہیں کام کرنا آتا ہے۔" میں نے شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیوں نہیں۔ یہ بسکٹ میں نے خود بنائے ہیں۔"

"نہیں۔"

"سچی۔"

"واقعی۔"

"ہاں----- چکھ کر دیکھو۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا----- ایک بسکٹ اٹھایا----- بسکٹ منہ کی طرف بڑھایا پھر دانتوں سے کاٹا-----

بسکٹ مزیدار تھا۔ لیکن میں نے ساجدہ کو چھیڑنے کے لیے منہ بنایا----- خلاف توقع وہ میرے منہ بنانے پر نہیں مسکرائی----- میں نے دیکھا----- وہ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔ اور اس

کی نظریں میرے ہاتھ پر تھیں۔

"کیوں----- کیا ہوا؟" میں شوخی بھول کر اس کے متغیر چہرے کو تکتے ہوئے بولا-----

پھر میں نے اپنے ہاتھ پر نگاہ ڈالی----- کوئی بات سمجھ نہ آئی----- وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر بیٹھ گئی-----

"کیوں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"تم شادی شدہ ہو" اس نے اچانک انگریزی میں پوچھا۔

میں حیران سا ہوا----- پھر ہنس پڑا----- "یہ کیا سوجھی تمہیں-----"

وہ مطمئن نہ ہوئی پھر اسی لہجے میں انگریزی میں بولی' "منگنی ہوئی ہے۔"

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

شاید میرے چہرے پر اک لمحہ کو ہوائیاں بھی چھوئیں۔

لیکن

میں جلد ہی سنبھل کر بولا "تمہیں کیا ہو رہا ہے۔"

"میری بات کا جواب دو۔"

"یہ خیال تمہیں کیوں کر آیا۔"

"تمہارے ہاتھ میں رنگ دیکھ کر۔"

"اوہ۔"

میں لمحہ بھر کو گڑبڑایا۔ لیکن جلدی سے چائے کی پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ نگل لیا۔

پھر پیالی واپس رکھتے ہوئے میں قدرے سنبھل چکا تھا۔ ساجدہ کا چہرہ بے رونق اور ویران تھا----- میں نے اس موقعہ سے نپٹنے کا سوچ لیا۔

میں ہولے سے مسکرایا۔ ساجدہ کی طرف دیکھا۔ میرے اندر کا شیطان جاگ اٹھا تھا-----

ساجدہ پر منگنی کا انکشاف کرنا ترقی کے زینے سے اوندھے منہ گرنے کے مترادف تھا-----

"رنگ دیکھ کر شادی شدہ بنا دیا----- منگنی کر دی میری" میں چالبازی سے بولا۔

"یہ رنگ-----" وہ ہراساں سی تھی۔

میں نے جلدی سے بات بنائی۔ "یہ رنگ میرے ابا جی کی یادگار ہے----- ان کے مرنے کے بعد امی نے مجھے پہنا دی----- یہ سرپرست کی نشانی ہی سمجھ لو۔"

میں نے دیکھا میرے جھوٹ سے وہ پوری طرح مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کی چہرے پر صبح کی تازہ دم روشنی پھیل گئی۔

اور

میں اپنی مکاری عیاری اور اداکاری پر مسکرا دیا۔

میں کتنا گھاگ ہو چکا تھا۔ زیبی اور گھر والوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ ----- سیٹھ بے اولاد ہے ----- اور ساجدہ سے جھوٹ گھڑ کر اسے اطمینان دلا دیا تھا ----- کہ انگوٹھی منگنی کی نہیں ----- والد کی نشانی ہے ----- ایسا کہتے ہوئے مجھے ذرہ بھر ملال نہیں ہوا تھا -----

شاید اس لیے کہ میں ساجدہ سے مخلص نہیں تھا -----

مخلص تو میں شاید زیبی سے بھی نہیں تھا -----

ان دنوں میں بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے کی بھی تو کوشش کر رہا تھا -----

زیبی کا دیوانہ بھی بنا ہوا تھا۔

اور

ساجدہ کو بھی محبت کے جالوں میں پھانس لیا تھا ----- اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے لگتا تھا ----- میں ساجدہ سے بھی محبت کرنے لگا ہوں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا۔ میں اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا ہوں ----- اس بدصورت لڑکی کے اندر کی خوبصورتی مجھے جکڑ رہی ہے ----- اور میں تن من سے اس کا ہو رہا ہوں۔

لیکن

عجب بات تو یہ تھی کہ یہ کیفیت عارضی ہوتی تھی -----

شاید

یہ احساس میری مفاد پرستی ہی کا ایک پہلو تھا۔

○ ☆ ○

امی اور پھپھو فہمیدہ نے کسی عزیز کی عیادت کے لیے میو ہسپتال جانا تھا۔ میں بھی تیار ہو رہا تھا۔ پانچ بجے رحمان صاحب سے ملنا تھا۔ ایکسپورٹ کے لیے جن پارٹیوں سے گفت و شنید ہو رہی تھی انہی کے متعلق طے کرنا تھا -----

امی نے مجو کو تانگہ لانے کے لیے کہا تو میں جلدی سے کمرے سے باہر نکل آیا "میں آپ کو چھوڑ آؤں گا امی۔"

"تم تو کام پہ جا رہے ہو نا دیر نہ ہو جائے۔"

"نہیں ہوتی -----"

"فہمیدہ نے بھی جانا ہے۔"

"انہیں بھی بلا لیں ----- کیا یاد کریں گے آپ لوگ بھی ----- یہ فسٹ کلاس گاڑی ہو اور آپ تانگے میں جائیں۔"

"اللہ نصیب کرے میرے بچے ----- قدرت کی نوازشوں کا شکر ادا کیا کرو ----- کب کبھی سوچا تھا کہ قسمت یوں مہربان ہو گی -----"

"اوہ میری ماں ----- یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے" میں نے امی کے گلے میں بازو حمائل کر دیئے -----

امی خوش ہو کر دعائیں دینے لگیں۔

ان دنوں وہ کس قدر خوش رہتی تھیں ----- میری ترقی پر پھولی نہ سماتی تھیں ----- ابا جی کے مرنے کے بعد تو وہ مایوسی سے دوچار رہتی تھیں ----- رنج و غم کے سائے ان کے چہرے پر چھائے رہتے تھے۔

لیکن

اب ----- یوں لگتا تھا۔ انہیں نئی زندگی مل گئی تھی۔ نئی زندگی۔ جو خوشیوں سے بھرپور ہے۔ جس میں مالی تفکرات نہیں ----- جس میں فکر رنج و غم کچھ بھی نہیں۔ سکون اور اطمینان ہے۔

سکون و اطمینان تو میرے گھر کے ہر فرد کو میسر آگیا تھا ---- زوبی مجو ناجا تو پھولوں کی طرح کھل رہے تھے۔ جس چیز کی فرمائش کرتے مل جاتی تھی ---- رانی اور قمو کو بھی اب میکے کی اہمیت ملی تھی ---- دو چار دن رہ کر جاتیں ---- تو میں انہیں کپڑوں پھل مٹھائی سے جیسے لاد کر واپس بھیجتا ---- رانی کی بیٹی کی پیدائش پر تو میں نے اسے اتنا کچھ دیا تھا۔ کہ اس کی کوئی حسرت نہ رہی تھی ---- میرے پاس پیسے کی کمی تھوڑا ہی تھی ---- جو اپنی بیاہتا بہنوں کے ارمان پورے نہ کرتا ---- بڑا بھائی تو باپ کی جگہ پر تھا نا ---- میری بہنوں کے سر سسرال میں فخر سے اونچے تھے ----

نمیدہ پھپھو بھی آگئیں ---- مجھے پیار کیا بلائیں لیں ---- بچھی جاتی تھیں وہ تو ---- ان کی بیٹی میرے گھر کی رانی بننے والی جو تھی۔

امی کو نمیدہ پھپھو کو میں ہوسپٹل چھوڑنے گیا ---- وہیں سے مجھے رحمان صاحب سے ملنے جانا تھا ----

میں نے دونوں کو ہوسپٹل کے گیٹ پر اتارا ---- اور گاڑی واپس موڑی ---- وہاں رش کافی تھا ---- میری احتیاط کے باوجود گاڑی ایک ریڑھے سے جا لگی ----

نئی گاڑی کی سائیڈ لگ گئی تھی۔ کافی بڑا ڈینٹ پڑ گیا ---- میرا پارہ چڑھ گیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا کے ریڑھے والے کی جان چھڑالی ---- میرا موڈ آف ہو گیا ---- گاڑی میری ذاتی ملکیت تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی افسوس ہوا ----

میں رحمان صاحب کے ہاں گیا۔ تو موڈ اپ سٹ تھا ---- لیکن ضروری امور پر تبادلہ خیال کرنا ضروری تھا ----

رحمان صاحب جرمن جا رہے تھے۔ مشینری کے سلسلہ میں وہاں کچھ کام تھا۔ میں نے ان کا پروگرام یوں ترتیب دیا تھا۔ کہ وہ مڈل ایسٹ اور افریقہ کے ان ملکوں کا دورہ بھی کرتے آئیں۔ جن سے میری خط و کتابت ہو رہی تھی۔ اور جن پارٹیوں سے بڑے بڑے آرڈر ملنے کی توقع تھی ----

پروگرام بن چکا تھا۔ اب چند باتیں ڈسکس کرنا تھیں۔ رحمان تین ماہ کے ٹور پر جا رہے تھے ----

میں وہاں پہنچا تو رحمان لان ہی میں مل گئے ---- ساجدہ کسی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کے لیے تیار ہو رہی تھی ----

میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی تھی ---- ساجدہ تیار ہو کر باہر نکلی تو اس کی نظر میری گاڑی کے تازہ تازہ ڈینٹ پر پڑی۔

"راج ----" اس نے میری طرف دیکھا۔

"ہوں" میں لان کی طرف بڑھ رہا تھا ----

"گاڑی لگ گئی۔"

"اوہ ہاں ---- کافی بڑا ڈینٹ پڑ گیا ہے۔"

میں مڑ کر اس کے قریب آگیا ---- ہم دونوں ڈینٹ دیکھنے لگے۔

"کیسے لگی۔"

"بس کچھ اپنا اناڑی پن ---- کچھ رش ----"

"شہر میں گاڑی چلانا بے حد مشکل ہے۔ اسی لیے تو کبھی ادھر گاڑی لے جاتی نہیں۔"

"شہر میں رہتے ہوئے شہر کی ان تکالیف کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

ساجدہ نے میری طرف دیکھا اور پھر ایک دم بولی "راج ---- تم شہر میں کیوں رہ رہے ہو۔"

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا اور بولا "وہاں میرا گھر ہے۔"

"گھر کسی صاف ستھرے علاقے میں لے لونا" وہ بولی ----

میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا ---- مسکرایا ---- اور پھر بولا "خدا کرے رحمان صاحب کا دورہ انتہائی کامیاب ہو ---- اور اس سے اتنا پرافٹ ہو۔ کہ میں کسی پاش علاقے میں گھر خرید سکوں ----"

وہ زیر لب مسکرائی ---- اس کی مسکراہٹ بڑی زندہ تھی ---- ہولے سے بولی "گھر اس سے پہلے بھی خریدا جا سکتا ہے۔"

"نہیں بھئی ---- ابھی ہمت نہیں۔"

"ڈیڈی خریدیں گے۔"

میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ گاڑی کی طرح گھر بھی مجھے مل سکتا تھا۔ ذرا ساجدہ کے گوش گزار کرنے کی ضرورت تھی ---- اور مجھے اب اس کے گوش گزار کرنے کا فن آگیا تھا ----

میں چہرے پر مایوسی اور حسرت سی لاتے ہوئے بولا "بھئی آپ کے ڈیڈی کی کیا بات ایک چھوڑ کئی گھر خرید سکتے ہیں ---- میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔"

"تمہیں فیکٹری کی طرف سے گھر ملنا چاہیئے۔"

"شکریہ۔"

"اور جلدی ملنا چاہیئے ---- ورنہ تم گاڑی کو بہت جلد چھکڑا بنا لو گے۔"

میں ہنس پڑا.....

"میں آج ہی ڈیڈی سے بات کروں گی۔" وہ بولی اور پھر اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے بولی "میں دو گھنٹے تک آجاؤں گی۔ تم یہیں ہو گے نا....."

"حکم کریں جناب..... انتظار میں دو گھنٹے کیا چار گھنٹے بھی بیٹھا رہوں گا....."

میری بات پر وہ خوشدلی سے مسکرائی.....

"جلدی آجاؤں گی" اس نے مسکرا کر یوں کہا۔ جیسے میرے لیے انتظار کا لمحہ لمحہ بھاری ہو گا.....

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا..... گھر کا جو قصہ اس نے چھیڑا تھا..... اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا۔ کہ میں اس کے ذہن میں یہ بات پوری طرح بٹھا دوں..... کہ مجھے شہر میں رہتے ہوئے تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میرا ذہن اس نئے پلان پر تیزی سے کام کرنے لگا.....

ساجدہ کے جانے کے بعد میں لان میں رحمان صاحب کے پاس آبیٹھا..... بہت جلد ہم کاروباری امور پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔

"جرمنی جانا ضروری نہ ہوتا۔ تو میرا خیال تھا مڈل ایسٹ اور افریقی ملکوں کے ٹور پر تمہیں بھیجتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے زیادہ اچھی کنوینسنگ کر سکتے ہو" رحمان پائپ کا کش لیتے ہوئے بڑے یقین سے بولے۔

"آپ کی نوازش ہے انکل....." میں نے عجز و انکساری کا مجسمہ بنتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں اپنے آپ کو ابھی اتنا اہل نہیں سمجھتا..... میں تو ابھی طفل مکتب کی طرح ہوں۔ آپ کی سوجھ بوجھ اور تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔"

وہ مسکرائے اور بولے "اب اتنی انکساری سے بھی کام نہ لو میاں..... خدا نے تمہیں بے انتہا صلاحیتیں بخشی ہیں..... اور تم ان کا صحیح استعمال بھی کر رہے ہو۔ تمہاری وجہ سے نئی فیکٹری شروع ہوتے ہی منافع دینے لگی ہے..... میں بے حد مطمئن اور خوش ہوں۔ تم نے میرا بہت سارا بار اپنے سر لے لیا ہے۔"

"شکریہ انکل۔"

"اگلا ٹور تم کرو گے"

"انشاء اللہ۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔ باتیں کاروبار سے ہٹ کر ذاتی زندگی کی ہونے لگیں۔ رحمان مجھ سے میری فیملی کے متعلق پوچھتے رہے اور میں جہاں جہاں کانٹ چھانٹ ضروری تھی۔ کانٹ

چھانٹ کر کے انہیں اپنے خاندان کے متعلق بتانے لگا۔ میں متوسط طبقے کے ایک آبرو مند خاندان کا فرد تھا۔ اس بات سے رحمان کو گونا اطمینان ہوا..... یہ اطمینان ان کے چہرے سے چھلکنے لگا۔

پھر

وہ

اپنی باتیں کرنے لگے..... ساجدہ کی امی کے متعلق بتانے لگے اپنی جدوجہد اور مسلسل کاوش کا ذکر کرنے لگے..... ساجدہ کے متعلق کچھ زیادہ ہی گرمجوشی اور تفصیل سے مجھے بتاتے ہوئے بولے۔

"میری بچی دل کی بہت اچھی ہے راج....."

میں نے سر جھکائے آہستگی سے ہوں کی۔

وہ ایک گہری آہ بھر کر بولے "اس نے بڑے دکھ جھیلے ہیں راج..... خدا نے جانے کیوں اسے ایسی شکل دی..... حالانکہ میں خود اتنا بدصورت نہیں اور نہ ہی اس کی ماں اتنی بدصورت تھی..... شاید یہ بدصورتی اس نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی فرد سے وراثت میں پائی ہے....."

میں بالکل گنگ سا بیٹھا تھا۔

وہ خود ہی بول رہے تھے "لیکن راج ساجدہ جتنی بدصورت ہے اس کا من اتنا ہی خوبصورت ہے..... وہ کسی کا برا نہیں سوچ سکتی۔

کسی کے متعلق غلط رائے قائم نہیں کرتی..... اس کے اندر ایک من موہنی لڑکی چھپی بیٹھی ہے....."

میں اب بھی چپ رہا

وہ مضطرب ہو کر کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولے "اس من موہنی لڑکی کے بھی تصورات ہیں۔ خواہشیں ہیں ارمان ہیں..... وہ جیون ساتھی چاہتی ہے..... گھر چاہتی ہے..... گھر کی رونقیں اور خوشیاں چاہتی ہے....."

"جی" میرے منہ سے نکل گیا۔

میں نے دیکھا رحمان میری جی سے خوش ہو گئے تھے.....

وہ باتیں کرتے رہے..... ساجدہ کی ساجدہ کے خوشگوار مستقبل کی۔ میں ان کی باتیں سن رہا تھا..... ہوں ہاں بھی کر رہا تھا

دو ایک دفعہ میں نے اعترافاً یہ بھی کہا۔

"واقعی ساجدہ کا من خوبصورت ہے۔"

لیکن

سارا وقت میرا ذہن اس پلان میں ہی الجھا رہا۔ جو میں گھر کے متعلق بنا رہا تھا۔ مجھے کسی پاش علاقے میں خوبصورت سا بنگلہ لینے کی حسرت تھی۔ میں جب بھی جدید طرز کی خوبصورت کوٹھیاں اور بنگلے دیکھتا تھا۔ تو میرے من میں ان علاقوں میں ان گھروں میں رہنے کی تڑپ جاگ اٹھتی تھی۔ شکیل کے ہاں میں جب بھی آتا۔ میرے لاشعور میں ایسے گھروں میں رہنے کا ارمان مچل رہا ہوتا-----

اب ساجدہ نے خود ہی بات کی تھی ----- پاش علاقے میں خوبصورت سا گھر لینے کی ----- وہی یہ گھر مجھے دلا سکتی تھی۔

رحمان جب لان سے اٹھ کر چلے گئے انہیں راشد سلمان کے ہاں جانا تھا ----- میں وہیں رہا -----

مجھے ساجدہ کی واپسی کا انتظار تھا ----- میں اس انتظار میں شدت پا رہا تھا-----

رحمان چلے گئے۔ تو میں اٹھ کر اندر چلا آیا ----- گھر میں نوکروں کے سوا کون تھا ----- میں ہر کمرے میں بے دھڑک گیا ----- میری حیثیت نوکر بھی جانتے تھے۔

میں ایک سے دوسرے کمرے میں گیا۔ کمروں کا جائزہ لیتا رہا ----- میں نے رحمان صاحب کے کمرے میں ان کی شادی کی تصویر بھی دیکھی ----- ساجدہ کی امی اچھی خاصی خوش شکل عورت تھیں -----

میں ساجدہ کے کمرے میں بھی گیا ----- مجھے حیرت سی ہوئی۔ ساجدہ کا کمرہ بڑی نفاست سے آراستہ تھا ----- خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا ----- سلیقے کا مظہر تھا-----

سات بجے کے قریب ساجدہ کی گاڑی پورچ میں رکنے کی آواز آئی ----- میں لپک کر ادھر گیا اور آتے ہی شکوہ کر دیا۔ "مجھے یہاں بٹھا گئیں اور جنابہ دوستوں میں وقت گزار -----"

"اللہ راج -----" میری بات کاٹتے ہوئے وہ جلدی سے بولی "ان لوگوں نے چائے میں دیر کر دی ----- ورنہ میرا کون دوست تھا وہاں ----- جس کے لیے بیٹھی رہتی -----"

"چائے پینا ضروری تھی نا" میں نے روٹھتے ہوئے کہا۔

وہ ہنس پڑی "کچھ ایٹی کیٹس بھی ہوتے ہیں نا-----"

میں اس کے گاڑی بند کرنے سے پہلے ہی اندر چلا آیا-----

وہ جلدی سے میرے پیچھے پیچھے آ گئی ----- وہ مسکرا رہی تھی۔ میں منہ بنا رہا تھا۔ اس پر یوں ظاہر کر رہا تھا۔ جیسے ایک ایک لمحہ اس کے بغیر گزارنا مشکل تھا۔

ہم دونوں قریب قریب صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ کتنی خوش تھی۔ مجھے مناتے ہوئے اس کی باریک لکیروں ایسی آنکھیں روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں -----

"اس طرح روٹھنا تھا۔ تو بہتر تھا مجھے جانے ہی نہ دیتے-----"

"روک لیتا۔"

"ہاں۔"

"رک جاتیں تم۔"

"تم ایک دفعہ روکتے تو راج۔ تمہاری کوئی بات بھی میں کبھی رد کر سکی ہوں۔"

"ساجدہ" میں نے اس کا سوکھا سڑا ہاتھ بڑے جذباتی انداز میں اپنے ہاتھ میں لے لیا-----

وہ جذباتی لمحوں میں سیال سی شے بن جاتی تھی۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے سے لگا کر آہستگی سے کہا "راج ----- تم میرے لیے کیا ہو ----- تمہیں کیسے بتاؤں ----- کیسے ----- بتاؤں۔"

"ایسے" میں نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو کھینچا اور وہ میری آغوش میں آ گئی ----- میں نے بڑے والہانہ پن بڑی بے اختیاری اور بڑے ہی جذباتی پن سے اسے اپنی چھاتی میں سمو لینے کی کوشش کی -----

آج اس کا پنجر بھی مجھے نہیں چبھا۔

اور

میں نے لطف و انبساط بھی اپنے سینے میں موجزن محسوس کیے۔

○ ☆ ○

زیبی سے ملتا تو رہتا ہی تھا۔ کبھی وہ ہمارے گھر آئی ہوتی۔ کبھی میں ان کے گھر پہنچا ہوتا۔ مجھ پر کوئی پابندی یا روک ٹوک تو سرے سے تھی ہی نہیں ---- کچھ تو رشتہ داری کا واسطہ تھا۔ اور کچھ میری موجودہ ترقی یافتہ صورت کا ---- سب مجھ سے مرعوب تھے ---- مرعوب ہونے والی بات تو تھی ہی ---- میں جو معراج ترقی کی طرف چھلانگیں لگاتے ہوئے بڑھ رہا تھا----

زیبی سے ملنے میں ان کے گھر گیا---- آج اس سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اچٹتی اچٹتی ملاقاتیں بے صبری کا باعث بن رہی تھیں----

میں ان کے گھر آیا۔ وہ تو نیچے بیٹھک ہی میں تھی ---- شاید بیٹھک صاف کر رہی تھی---- کیوں کہ سارا سامان الٹ پلٹ کر رکھا تھا۔

"اے" میں نے سگریٹ کا آخری ٹوٹا زمین پر پھینک کر جوتے کی نوک سے مسلتے ہوئے زیبی کو مخاطب کیا۔

"اوہ ---- تم ----"

"جی ---- میں۔"

"کیسے آئے۔"

"تمہیں ملنے"

"شکر ہے فرصت مل گئی----"

زیبی روٹھے روٹھے لہجے میں بولی۔ مجھے اس کی اس ادا پر پیار آگیا۔ میں بیٹھک کے اندر چلا گیا---- اور ایک خالی صوفے پر پھیل سا گیا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اوپر چلو----"

"کیوں۔"

"صفائی کر رہی ہوں۔ ساری چیزیں دھول مٹی سے اٹی پڑی ہیں۔"

"اوپر کون ہے۔"

"امی۔"

"اور۔"

"حیراں۔"

"بس پھر میں یہیں بیٹھوں گا----"

"چلو میں بھی اوپر چلتی ہوں۔ صفائی بعد میں کر لوں گی۔"

"اوپر پھپھو ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔"

"آج میں صرف اور صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔"

میں نے دیکھا زیبی کی سنہری رنگت شہابی ہو گئی تھی----

پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے تکنے لگی----

"ادھر آؤ" میں نے اسے اپنی طرف بلایا----

اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا----

"بات نہیں مانو گی۔"

"نہیں۔"

"میں زبردستی بھی کر سکتا ہوں" میں اٹھنے کو تھا----

"نہیں راجو----" اس نے ہاتھ ہلائے----

"تو پھر ادھر آکر بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔"

وہ ہچکچائی۔ لیکن پھر ہاتھ میں پکڑا جھاڑن مروڑتے ہوئے میرے عین سامنے آ بیٹھی----

میں بڑی بے باکی سے اسے نگاہوں میں نگلنے لگا----

وہ چند لمحے بیٹھی رہی ---- پھر محجوب سی مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر بولی "کیا تک رہے ہو----"

"تمہیں تک رہا ہوں۔"

"پہلے نہیں دیکھا کبھی۔"

"اس انداز سے نہیں دیکھا۔"

"مجھے شرم آتی ہے۔"

اس نے اتنی معصومیت سے کہا۔ کہ میں اس پر ہزار جان سے فدا ہو گیا----

میں کچھ دیر زیبی سے دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کرتا رہا----

"چائے نہیں پلاؤ گی۔"

"اوہ ---- باتوں میں الجھا لیتے ہو ---- چائے یاد ہی نہیں رہتی۔"

"ذرا ہوش میں رہا کرو محترمہ ----- گھر آئے مہمان کی خاطر تواضع کرنا سیکھو۔ صرف ادائیں دکھانے سے کام نہیں چلتا۔"

"ہائے راجو۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔"

"شرم آنے لگتی ہے۔"

"اور نہیں تو کیا ----- بہت بے باک ہوتے جا رہے ہو۔"

"ہرج کیا ہے ----- اپنی ہونے والی بیگم صاحبہ سے ہر طرح کی بات کرنے کا حق ہے ہمیں

اس نے اک مسکراتی نگاہ مجھ پر ڈالی ----- وہ اٹھ کھڑی ہوئی ----- میں اسی انداز سے صوفے پر پڑا رہا -----

"چائے نیچے ہی لاؤں۔"

"جیراں کو بلاؤ۔ وہی چائے دے جائے۔"

"اوپر ہی چلو نہ

"نہیں۔"

"اچھا میں جاتی ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی۔ کہ سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز آئی -----

وہ جیراں تھی ----- زیبی اوپر چلی گئی۔

جیراں بازار سے کوئی چیز لینے جا رہی تھی ----- میں نے پھپھو کے متعلق پوچھا ----- تو وہ بولی

"بی بی جی تو رابعہ بی بی کے ہاں بیٹھی ہیں -----"

رابعہ ماسی ساتھ والے گھر میں رہتی تھی۔ اور چھت پر سے ہی ان کے ہاں جانے کا راستہ تھا۔

میدان صاف دیکھ کر میں صوفے سے اٹھا اور دھما دھم سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ گیا۔ زیبی ابھی سامنے والے دالان ہی میں پہنچی تھی ----- میں نے پیچھے سے جا کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے اپنا چہرہ اس کے کندھے پر رکھ کر اپنا گال اس کے گال سے لگا دیا -----

زیبی بے طرح گھبرا گئی ----- وہ میرے بازوؤں میں مچھلی کی طرح پھسلی ----- لیکن میرا موڈ آج زیبی کو ٹوٹ کر پیار کرنے کا بن رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ کئی دنوں سے میرا ساتھ ساجدہ سے رہا تھا ----- میں لاشعوری طور پر اس سے مرعوب ہو رہا تھا ----- اس کی ذہانت اس کا تجربہ اس کا مشاہدہ اور ان سب صلاحیتوں کے ساتھ اس کا انداز سپردگی ----- شاید میں اندر ہی اندر ڈر رہا تھا۔ کہ ان سب باتوں کی وجہ سے میں زیبی سے دور نہ ہو جاؤں ----- ساجدہ میرا ان داتا تھی -----

کبھی کبھی عقیدت کے طور پر بھی تو ہم اپنے حقوق اور اپنی خواہشات سے دستبردار ہو جاتے ہیں نا -----

زیبی چکنی مچھلی کی طرح میرے بازوؤں سے پھسل کر پرے جا کھڑی ہوئی اس کا سنہری رنگ شہابی ہو گیا تھا اور اس کی سیاہ گہری گہری آنکھوں میں چاندنی اتر آئی تھی۔

بظاہر وہ مجھ پر خفا ہو رہی تھی ----- لیکن میرے ہاتھوں اور جسم کے لمس سے اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

شاید میرا بھی یہی حال تھا ----- یوں لگ رہا تھا جیسے نشے کی حالت میں ہوں -----

زیبی جلدی سے صحن میں آ گئی ----- میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا ----- پھر اپنے آپ پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے صحن میں بچھے تخت پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

زیبی کچن میں تیل کے لوہے کے چولہے پر چائے بنا رہی تھی ----- اس چولہے کو دیکھ کر مجھے گیس کا وہ ککنگ رینج یاد آ گیا۔ جو اس کوٹھی میں لگا تھا۔ جو میرے لیے خریدی جا رہی تھی -----

کتنا بڑا اور کتنا خوبصورت کچن تھا ----- اور ککنگ رینج بھی نیا اور چار چولہوں والا تھا -----

"زیبی" میں نے اسے پکارا۔

"ہوں۔"

"کچھ پتہ ہے۔"

"کیا۔"

"فیکٹری کی طرف سے مجھے کوٹھی مل رہی ہے۔"

"سچی۔"

"ہاں ----- بالکل نئی ----- جدید طرز کی -----"

"جھوٹے۔"

"پاگل کہیں کی ----- پہلے کونسا جھوٹ بولا ہے۔ گاڑی نہیں ملی۔ پرافٹ میں شیئر نہیں ملتا؟ ----- اور اب کوٹھی -----"

زیبی خوشی سے پھول سی گئی ----- چمکتی نگاہیں مجھ پر ڈالیں اور بولی "نوکری تو تمہیں کیا ملی ہے اللہ دین کا چراغ مل گیا ہے۔"

میں ہنس کر بولا "واقعی۔"

"اتنی جلدی جلدی ترقی اور دوسری مراعات مل رہی ہیں ----- شاید اس لیے کہ سیٹھ بے اولاد ہے ----- تمہیں بیٹا بنانا چاہتا ہو گا -----"

زیبی کی لا علمی پر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے خود ہی تو جھوٹ گھڑا تھا۔۔۔۔

"چائے نہیں بنی ابھی" میں نے جلدی سے بات بدل دی۔ میں نہیں چاہتی تھا۔ کہ زیبی اس موضوع پر کوئی اور بات کرے۔۔۔۔

"بن گئی" وہ بولی۔ پھر پیالی میں چائے ڈال کر وہ باہر لے آئی۔۔۔۔ مجھے پیالی تھما کر وہ دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی۔۔۔۔ بڑے تجسس سے بولی "یہ کوٹھی کہاں ہے۔"

"گلبرگ میں۔"

"راجو۔۔۔۔ ہم کوٹھی میں رہا کریں گے" وہ بے اختیارانہ خوشی سے جیسے جھوم کر بولی۔

"ہاں۔۔۔۔ بالکل" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھ آئے ہو۔"

"ہوں۔"

"کیسی ہے۔"

"بالکل نئی بنی ہے۔ ابھی پالش ہو رہی ہے دروازوں کو۔"

"کرایہ فیکٹری دے گی۔"

"کرائے پہ نہیں رانی صاحبہ۔۔۔۔ خریدی جا رہی ہے میرے لیے۔۔۔۔"

زیبی پر خوش کن حیرانی طاری تھی۔۔۔۔ میں اسے کوٹھی کے کمروں ڈرائینگ روم' ڈائننگ روم' کچن لاؤنج' پورچ اور چمنوں کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔۔۔۔

ساجدہ نے ڈیڈی سے اصرار کر کے انہیں میرے لیے کوٹھی خریدنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ خریدنا تو وہ پہلے ہی چاہ رہے تھے۔۔۔۔ لیکن اب کوٹھی میرے لیے اور میرے نام خریدی جا رہی تھی۔۔۔۔ چند دنوں تک بیعانہ ہو رہا تھا۔۔۔۔ اور ایک ماہ بعد جب رحمان مڈل ایسٹ کے دورہ پر ہونا متوقع تھے رجسٹری کروائی جانی تھی۔۔۔۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے وکیل کو سارے اختیارات دے دیئے تھے۔۔۔۔

میں اور زیبی نئی کوٹھی میں نئی زندگی شروع کرنے کی باتیں کر کر کے خوش ہونے لگے۔۔۔۔

چائے پی کر میں اٹھا۔۔۔۔ آج مجھے گجرات رانی کے پاس بھی جانا تھا۔۔۔۔ امی کئی دنوں سے کہہ رہی تھیں۔ کہ رانی کو لے آؤ۔۔۔۔ بچی کی پیدائش کے بعد وہ جب سے گجرات گئی تھی۔ اس کا یہاں آنا ہی ہو نہ سکا تھا۔۔۔۔

میں نے زیبی کو گجرات جانے کا بتایا تو وہ بولی "کون ساتھ جا رہا ہے۔"

"چاہو تو تم چلی چلو۔"

"میں اکیلی۔"

"زوبی کو ساتھ لے لیں گے۔"

"امی سے پوچھ لوں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ کھانے کے بعد یہاں سے چلیں گے۔"

"رات واپس آجاؤ گے۔"

"تو اور۔۔۔۔"

"بس ٹھیک ہے۔ میں اور زوبی بھی چلیں گے۔"

"زوبی بیچاری کا تو خواہ مخواہ کہہ رہی ہو۔۔۔۔ کہو کہ میں اور تم چلیں گے۔"

"ہٹو بھی۔"

میں زیبی سے شوخ شوخ باتیں کرتا واپس گھر آگیا۔

میں بہت خوش تھا۔۔۔۔

○ ☆ ○

یوں لگا آسمان میرے سر پر آن گرا ہے۔ یا زمین نے مجھے نگل لیا ہے۔ کئی لمحے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہوں ہی نہیں ----- میرا اپنا آپ گم ہو گیا ----- مجھے اپنی شناخت اور اپنی پہچان ہی نہ رہی -----

میں جو ایک عرصے سے کھیل رہا تھا۔ تفریح کے موڈ میں ساجدہ کا اعتماد، محبت اور بھروسہ لوٹ لوٹ کر اپنا آپ بنا رہا تھا۔ اپنا گھر بھر رہا تھا ----- روپیہ، پیسہ، عزت و وقار اور اونچا مقام پا رہا تھا ----- انجام و عواقب سے بے خبر بن رہا تھا -----

ساجدہ کو میں نے ایک لڑکی نہیں واقعی زینہ سمجھا تھا۔ یہ زینہ مجھے میری منزل کی طرف لے گیا تھا -----

لیکن

زینہ اور منزل آپس میں مربوط تھے۔ میری آنکھوں میں دولت کی خیرگی تھی۔ میرے ذہن میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ میں نے اس ربط کا سنجیدگی سے جائزہ ہی کب لیا تھا۔ میں تو سونے کی کان کے دہانے پر بیٹھا تھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سونا سمیٹ رہا تھا۔

فیکٹری میں پرافٹ کا قانونی حصہ دار بن گیا تھا۔ گاڑی میرے نام خریدی گئی تھی۔ دونوں فیکٹریوں کی پوری ذمہ داری اور سیاہ و سفید کا بلا شرکت غیرے مجھے امین بنا کر رحمان آج ٹور پر جا رہے تھے۔

دفتر کے چند لوگ انہیں ایئر پورٹ پر چھوڑنے آئے تھے۔ ساجدہ اور میں بھی الوداع کہنے ان کے پہلو میں کھڑے تھے -----

چیک ان ہونے سے پہلے رحمان صاحب نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال کر محبت سے مجھے لپٹا لیا ----- اور پھر بڑے ہی جذباتی انداز میں گویا ہوئے "راج بیٹے ----- میں تمہارا کتنا احسان مند ہوں۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے ----- تم نے ساجدہ کو قبول کر کے میرا بہت بڑا بار بہت بڑا دکھ بانٹ لیا ہے -----"

میں سر تا پا کانپ گیا۔

لیکن وہ بولے گئے "کوٹھی چند دنوں تک خرید لی جائے گی۔ اس کی ڈیکوریشن ساجدہ خود کرے گی ----- میں تو چاہتا تھا۔ شادی کے بعد وہ میرے پاس ہی رہتی۔ لیکن وہ اپنا گھر الگ بسانا چاہتی ہے ----- اور میں اس کی خواہش کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں گا ----- میری واپسی تک وہ گھر فرنش کر لے گی ----- انشاء اللہ واپس آتے ہی میں تم دونوں کو نئے گھر میں آباد کر کے مطمئن ہو جاؤں گا -----"

میرے سر پر آسمان آن گرا۔

مجھے

چند لمحے کچھ پتہ نہ چلا میں کہاں ہوں۔

کہیں ہوں بھی کہ نہیں ----- جان ہی نہ سکا -----

رحمان خود ہی مجھ سے لپٹے ----- ساجدہ کو لپٹایا اور ہم دونوں کو سینے سے بھینچ کر خوشگوار مستقبل کی دعا کی -----

اس کے بعد وہ دوسرے لوگوں سے مل کر اندر چلے گئے -----

میں

پتھرایا سا کھڑا رہا -----

ساجدہ شرمائی سی سمٹی رہی -----

کئی لمحوں بعد مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوا ----- تو اپنی جگہ سے ہلا ----- ساجدہ میرے ساتھ ہی مڑی -----

میں لاؤنج سے باہر گاڑی کی طرف آیا۔

"اس طرف نہیں چلو گے راج ----- ڈیڈی کو جہاز میں سوار ہوتے دیکھ ہیں" ساجدہ نے کہا -----

میں چپ چاپ اس کے ساتھ بیرونی جنگلے کی طرف چلا آیا۔ میرے حواس پر ابھی تک آسمان گرا ہوا تھا -----

کافی دیر ہم وہاں کھڑے رہے ----- ساجدہ نے ہی دو تین دفعہ مجھ سے بات کی ----- میں چپ ہی تھا -----

رحمان جہاز کی طرف گئے۔ ہمیں ہاتھ ہلایا۔ ہم نے جواباً ہاتھ ہلائے پھر وہ سیڑھی چڑھ کر جہاز کے اندر چلے گئے -----

ساجدہ ان کے اندر چلے جانے کے بعد بھی جنگلے سے لگی کھڑی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ کچھ جذباتی سی ہو رہی تھی ----- اس کی باریک لکیر ایسی آنکھوں میں شاید آنسو آ گئے تھے -----

جنہیں وہ اپنے ذبح کی ہوئی مرغی کے پنجوں ایسے ہاتھوں سے پونچھ رہی تھی ۔۔۔۔۔

مجھے پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا ۔۔۔۔ جی چاہا ۔۔۔۔ ساجدہ کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹخ دوں ۔۔۔۔۔ اس کی بدصورتی ان لمحوں میں مجھے بے طرح کھل رہی تھی ۔۔۔۔ اس کی گردن مروڑ دینے کو جی چاہ رہا تھا ۔۔۔۔ شاید میں اپنے اندر کی مایوسی کا یہ ردعمل چاہ رہا تھا ۔۔۔۔

میں بمشکل اپنے آپ کو اندر ہی اندر سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا ۔۔۔۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے گاڑی میں آبیٹھے ۔۔۔۔

ساجدہ کو گھر ڈراپ کر کے مجھے فیکٹری جانا تھا ۔۔۔۔

لیکن

میرا تو سر گھوم رہا تھا ۔۔۔۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں ۔۔۔۔ جسم کبھی سلگ اٹھتا تھا۔ کبھی یخ بستہ ہو جاتا تھا ۔۔۔۔ رحمان کے الفاظ کانوں میں سیال آگ کی طرح بار بار اتر رہے تھے ۔۔۔۔ وہ واپسی پر ہماری شادی کرنے کا کہہ گئے تھے ۔۔۔۔

اف خدایا ۔۔۔۔

اس مریل کریہہ المنظر لڑکی سے شادی !!

اور

پھر

اس حالت میں کہ میں زیبی سے وابستہ تھا ۔۔۔۔ زیبی سے منگنی ہو چکی تھی ۔۔۔۔

سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا ہو گا ۔۔۔۔

انکار

لیکن

انکار کیسے ۔۔۔۔ انکار کی صورت میں تو یہ سب ۔۔۔ حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ جیسے جادو کی چھڑی گھما کر سب کچھ غائب کر دیا جاتا ہے۔

یہ

مقام

یہ

ٹھاٹھ باٹھ۔

یہ

شرف و وقار ۔۔۔۔

سب آناً فاناً ختم ہو جائے گا ۔۔۔۔

میں جھلایا سٹپٹایا گاڑی چلا رہا تھا ۔۔۔۔ ساجدہ شاید مستقبل کے حسین جال بن رہی تھی۔ وہ میرے بہت قریب کھسک آئی تھی۔ اتنا قریب کہ اس کے پنجر ایسے جسم کو میں اپنے گوشت پوست کے وجود سے مس ہوتے محسوس کر رہا تھا۔

وہ باتیں بھی کر رہی تھی ۔۔۔۔ جب بھی کوئی جملہ میرے ہوش میں آئے حواس سے مس ہو جاتا ۔۔۔۔ مجھ پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ۔۔۔۔ اور میرے ہاتھ سٹیرنگ پر کانپ جاتے ۔۔۔۔

ساجدہ کی آواز جذبات سے مغلوب تھی ۔۔۔۔ گاڑی ذرا سنسان سڑک پر آئی ۔۔۔۔ تو اس نے بے تکلفی سے اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا ۔۔۔۔ اور بھرائی بھرائی آواز میں بولی "تم کتنے اچھے ہو راج۔ کتنے عظیم ہو ۔۔۔۔ تم نے مجھے نئی زندگی اور نیا حوصلہ دیا ہے۔ ۔۔۔۔ میں کب کسی سے محبت کرنے کا سوچ سکتی تھی ۔۔۔۔ شکل و صورت کے کمپلیکس نے میرے سارے جذبات منجمد کر دیئے تھے ۔۔۔۔ لیکن راج ۔۔۔۔ راجو ۔۔۔۔ تم نے تو سورج کی تازہ دم کرنوں کی طرح ان منجمد جذبات کو پگھلا دیا ہے ۔۔۔۔"

وہ چند لمحے رکی ۔۔۔۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اور بڑے والہانہ پن سے اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی ۔۔۔۔

میں تو اس شہزادے کی طرح پتھر کا بن چکا تھا۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر جن کے قبضے میں کنوئیں سے پانی لینے گیا۔ لیکن بلاؤں نے پیچھے سے آوازیں دیں ۔۔۔۔ تو مڑ کر دیکھا ۔۔۔۔

اور

مڑ کر دیکھنا ہی تو ممنوع تھا ۔۔۔۔ اس لیے وہیں پتھرا گیا۔

"راج" وہ چند لمحوں بعد بولی اب اس نے اپنا استخوانی پنجہ میرے بازو پر گاڑ لیا تھا ۔۔۔۔"

"تم عظیم ہو۔ تم نے میری ظاہری شکل و صورت کو نہیں دیکھا ۔۔۔۔ تم نے میرے اندر کی چھپی ہوئی عورت کو ٹٹولا ۔۔۔۔ اسے دیکھا' اسے چاہا' تمہیں میری بے شمار اور بے پناہ دولت کی پرواہ نہیں ۔۔۔۔ تم صرف اور صرف مجھے چاہتے ہو ۔۔۔۔ مجھے ۔۔۔۔ جو ۔۔۔۔"

"ساجدہ ۔۔۔۔" میں نے جانے کیوں اور کیسے کہہ دیا

"راجے ۔۔۔۔" وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ جذباتی ہو گئی ۔۔۔۔

میں چڑ گیا ۔۔۔۔

لیکن

کچھ نہیں بولا ۔۔۔۔ میری سوچ و سمجھ کی صلاحیتیں تو جانے کہاں روپوش ہو گئی تھیں ۔۔۔۔ ساجدہ کی باتیں ۔۔۔۔ میرے ضمیر پر تازیانے برسانے لگی تھیں ۔۔۔۔ اف ۔۔۔۔ میرا دماغ چکرانے لگا ۔۔۔۔

"راجو ---- مجھے تو اپنی قسمت پر رشک آتا ہے" اس نے میرے بازو کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا----

میرے نتھنوں سے خود بخود ہوں کی آواز نکلی ---- جسے ساجدہ نے اپنی بات کا جواب سمجھا ---- بڑی گہری اور ڈوبتی آواز میں بولی "تم جیسا خوبصورت مرد مجھے یوں ٹوٹ کر چاہے گا میں نے کب سوچا تھا راجو ---- مجھے ہمیشہ اسی طرح پیار کرو گے نا ---- اسی طرح چاہتے رہو گے نا ---- یقین مانو تمہاری چاہت اور پیار ہی میری زندگی ہے ---- یہ نہ رہے تو میں بھی نہ رہوں گی۔"

میرا ہاتھ اسٹیئرنگ سے آپوں آپ اٹھا اور ساجدہ کے کندھے پر آ گیا ---- جانے کیوں میں نے اسے آہستگی سے تھپتھپا دیا ----

شاید ابھی تک میرا ظاہر اور باطن ایک نہیں تھا ---- اپنے مفاد کی خاطر ہر جائز اور ناجائز پر جھک جانے والا ظاہر باطن کی گرفت سے تاحال دور تھا ----

ساجدہ کو میں نے اس کے گھر ڈراپ کیا۔

"آؤ تھوڑی دیر بیٹھو ---- چائے پیو گے؟" اس نے کہا۔

"نہیں۔"

"کیوں۔"

"فیکٹری جانا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی "اب تو ایک نہیں دونوں فیکٹریوں کی دیکھ بھال تمہیں کرنا پڑے گی ---- لیکن فکر نہ کرو ---- میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی ----"

اس نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں زمانے بھر کی محبت سمیٹ کر مجھے خدا حافظ کہا۔

اور

میں اپنے دماغ کی نسوں کو چٹختا محسوس کرتے ہوئے فیکٹری چلا آیا----

○ ☆ ○

خطا کی سزا ملتی ہے۔ لیکن میری خطا کی اتنی اندوہناک اور ایسی کرب آمیز سزا ہو گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ---- میں تو غرض کا پتلا بنا ہوا تھا۔ میرے پیش نظر صرف اور صرف میرا اپنا آپ تھا ---- اس اپنے آپ کی غلامی کر رہا تھا۔ اس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ میں نے اخلاق و کردار کی سب قدریں بھلا دیں تھیں۔ ضمیر کو منوں بوجھ تلے دبا دیا تھا ---- مسرور تھا۔ خوش تھا۔ دنیاوی خوشیاں سمیٹ رہا تھا ---- اور کسی محاسبے کسی پوچھ پڑتال اور کسی گرفت کا احساس بھی ذہن میں نہ لاتا تھا۔

لیکن

رحمان جاتے جاتے جو کچھ کہہ گئے تھے۔ میرا اپنا آپ تھرا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ یہ اپنا آپ بھربھری مٹی کا بت ہے۔ جو جھوٹے سہاروں پر کھڑا ہے۔ حقیقت اور سچائی کے ایک ہی تھپیڑے سے یہ بت بکھرنے لگا ہے۔

میں ساجدہ کو ڈراپ کر کے فیکٹری چلا آیا۔ لیکن اس قدر الجھا ہوا تھا۔ کہ کوئی کام نہ کر سکا۔

اس دن میں نے اپنے اکاؤنٹنٹ جمیل درانی کو بلا وجہ ڈانٹا۔

رحمت دین چپراسی تھا۔ ہمیشہ مودب اور حکم کا بندہ بنا ہوتا۔ لیکن وہ بھی میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں نے سارا غصہ جیسے اس پر نکالنے کی ٹھان لی تھی۔

فیکٹری کے دوسرے افراد بھی مجھ سے نہ بچ پائے۔ میں نے تو اس دن کام کرتے مزدوروں پر بھی اندر کا لاوا اگلا ----

سب ششدر تھے۔ حیران تھے۔ میں جو مزدوروں سے بڑے پیار اور محبت سے کام لیتا تھا۔ جو اپنے جونیئرز سے شفقت سے پیش آتا تھا۔ اور معمر رحمت دین کو تو کبھی چپراسی نہیں کہا تھا۔ ہمیشہ چاچا رحمت دین کہہ کر پکارتا تھا۔ آج اپنے اندر کی چوٹ سے تلملا کر ان بے قصور لوگوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بنا رہا تھا۔

میں آج وقت سے پہلے ہی آفس سے نکل آیا۔

ریسٹورانٹ میں کچھ دیر بیٹھا رہا ---- چائے منگوائی ---- لیکن سوائے سگریٹ پھونکنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی ---- شام ڈھلے میں گھر کی جانب چل دیا ---- لیکن آج گھر سے خوف آ رہا تھا۔ امی ضرور پوچھیں گی۔ کہ میں پریشان کیوں ہوں۔ زوبی سوال کرے گی' تاجا اور مجو استفسار کریں گے ---- ہو سکتا ہے زیبی بھی آئی ہو ----

زیبی کے نام سے مجھے جھرجھری آ گئی ----

گھر پہنچا تو طبیعت انتہائی پریشان اور بے سکون تھی۔ میں چاہتا تھا سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاؤں ---- اور دروازے کھڑکیاں بند کر کے پڑ رہوں ----

لیکن

ایسا نہ کر سکا۔ گھر میں کافی مہمان آئے بیٹھے تھے۔ رانی تائی اماں اور فاضل بھائی آئے ہوئے تھے۔ قمو اور وسیم بھی تھے ---- رانی کی ننھی منی بچی کو زیبی اٹھائے پھر رہی تھی ----

میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی پوری کوشش کی۔ تھوڑی دیر اپنے ان عزیزوں کے ساتھ بیٹھا بھی رہا ---- فاضل بھائی اور وسیم سے باتیں بھی کیں ---- زیبی سے بھی ہم کلام ہوا ----

لیکن

یوں لگ رہا تھا۔ یہ میں نہیں ہوں ---- جو ان سب کے درمیان ہوں۔

کھانے کے فوراً بعد میں اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرا جی بے حد گھبرا رہا تھا ---- دماغ بھی بالکل سن ہو جاتا اور کبھی تپنے لگتا ----

میں کپڑے تبدیل کئے بغیر پلنگ پر آڑا پڑ گیا۔ میرے بوٹ پاؤں میں تھے ---- اور میں پاؤں پر پاؤں رکھے اضطراب سے انہیں ہلاتے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔

جانے کتنے لمحے بیت گئے ----

"راجو۔" زیبی کی آواز نے چونکا دیا۔ یہ آواز نہیں مدھم سی سرگوشی تھی۔ لیکن میں اس سرگوشی کو لاکھوں آوازوں سے الگ کر سکتا تھا۔ پہچان سکتا تھا۔ سننے سے زیادہ محسوس کر سکتا تھا ----

میں نے آنکھیں کھول دیں ---- دروازے میں زیبی کھڑی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے مجھے پکارا تھا۔

میں سویا ہوا تو نہیں تھا۔ جو ہڑبڑا کر اٹھتا اور چند لمحے ہتھیلیوں سے آنکھیں مل مل کر روشنی اور اندھیرے کی تفریق مٹاتا ---- میں نے اپنی انگارہ سی آنکھیں کھول دیں ----

میں نے دیکھا زیبی کچھ مضطرب کچھ بے چین تھی ----

نیچے آنگن میں اب کچھ زیادہ شور نہیں تھا ---- شاید سب کمروں میں جا چکے تھے ---- یا بیٹھک میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

میں زیبی کو اس وقت اپنے کمرے کی دہلیز پر دیکھ کر حیران سا ہوا۔

"کیوں" میں نے پٹی پر بیٹھے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے؟" اس نے پوچھا ----

"نہیں ----"

جھوٹ بولتے ہو ---- بہت پریشان ہو۔"

میں نے بھرپور نگاہ زیبی پر ڈالی ---- مجھے اپنی آنکھوں میں جلن کا واضح احساس ہو رہا تھا ----

"کیا بات ہے۔" وہ بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"بہت الجھے الجھے اکھڑے اکھڑے ہو۔"

"نہیں زیبی۔ تمہیں وہم ہو رہا ہے۔"

"اوں ہوں۔"

"کہہ دیا نا ---- کچھ نہیں وہم مت کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں --"

اس نے پیار برساتی نگاہیں مجھ پر ڈالیں ---- آہستگی سے بولی "مجھ سے کیوں چھپاتے ہو اپنی پریشانی ---- میں نے تو پہلی نظر ہی میں بھانپ لیا تھا ---- تم گھر میں داخل ہوئے تو مضطرب و پریشان تھے۔"

میں تلخی سے ہنس دیا ---- لیکن یہ ہنسی کھوکھلی اور بے جان تھی۔ وہ بھی ہولے سے مسکرائی اور بولی "کسی کو گاڑی تلے تو کچل نہیں آئے --"

"فی الحال تو خود ہی گاڑی تلے کچلا گیا ہوں" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

زیبی کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ دو قدم اندر آتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گئی ----

پھر جلدی سے بولی "میں نے غلط تو نہیں کہا نا ---- تم پریشان ہو۔"

"اوہ کوئی بات نہیں" میں نے بالوں میں انگلیاں الجھا لیں ----

"کوئی کاروبار کی بات ہے" وہ بولی۔

"ہاں ---- ہاں" اور جیسے زیبی نے خود ہی میرے فرار کا رستہ دکھا دیا۔

"کیا ہوا۔"

"لیبر نے بہت پریشان کر رکھا ہے ---- جائز و ناجائز مطالبات منوانے پر تل گئے ہیں ---- سیٹھ بھی آج بیرون ملک دورے پر چلا گیا ہے۔ ساری ذمہ داری مجھ پر ہے ----"

میں نے زیبی کو کہانی گھڑ کر سنا دی ---- لیکن جھوٹ بولتے وقت میرا ضمیر جو جانے کیسے بیدار ہو گیا تھا ---- میرے تازیانے لگانے لگا۔ زیبی مجھے تسلی دیتی رہی ---- میری پریشانی بانٹنے کو وہ یہی کر سکتی تھی ---- کرتی رہی ---- اس نے مجھے ایک پیالی تیز سی چائے کی بنا کر بھی لا دی۔ وہ میرے پاس بیٹھنا چاہ رہی تھی ---- مجھ سے باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ میری پریشانی بانٹ رہی تھی۔

لیکن

لیکن مجھے جانے کیا ہو رہا تھا۔ میرے تحت الشعور میں بڑا اضطراب تھا۔ تذبذب تھا۔ کشمکش تھا میں جھلایا ہوا تھا ---- میرا جی چاہ رہا تھا۔ تنہا ہو جاؤں ایسا تنہا کہ اپنا آپ بھی نہ ہو ----

انہی لمحوں جانے زیبی نے محبت بھرے لہجے میں کیا کہا۔ کہ میرا موڈ بدل گیا۔ پارہ چڑھ گیا اور میں انتہائی تلخی اور بڑی ہی بدتمیزی سے بولا "زیبی دماغ نہیں چاٹو۔ کس نے بلایا تھا تمہیں یہاں ---- چلی جاؤ ---- چلی جاؤ نیچے ----"

زیبی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے ہونٹ تک نیلے پڑ گئے ---- وہ مجھے پوری آنکھیں کھول کر تکنے لگی ----

میں نے پیالی پوری قوت سے دیوار سے دے ماری ---- پیالی ریزہ ریزہ ہو گئی ---- کچھ پیالی ہی کی طرح زیبی کا دل بھی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ دوسری پیالی پر ----

اور

پھر اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

آنسو اس نے آنکھوں ہی میں پی لیے ---- کرسی سے تیزی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی ----

"اوہ میرے خدا" میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا اور جس کرسی پر سے زیبی اٹھی تھی۔ اسی پر بیٹھ گیا۔

رات میں نے ویلیم فائیو کی دو گولیاں کھائیں۔ نیند تو آ گئی ---- لیکن پریشان اور بے سکون سی ----

میں کئی دن ذہنی ابتلا میں مبتلا رہا۔ کشمکش نے نڈھال کر دیا ---- فیکٹری میں اکھڑا اکھڑا رہتا ---- کام ٹھیک طرح سے نہ کر پاتا۔ گھر میں ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی ---- زیبی کو ناراض کیا۔ تو منانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ادھر ساجدہ مسلسل ذہن و ضمیر پر تازیانے برسا رہی تھی۔ وہ تو جیسے

میری راہوں میں بچھی جاتی تھی ---- اس کے بدصورت بے رونق اور ویران چہرے پر ان دنوں کتنی چمک اور کیسی جاذبیت ابھر رہی تھی ---- میں کبھی اس کی طرف دیکھتا تو خود ہی حیران رہ جاتا ---- اس کے اندر کی عورت اپنے تمام تر خلوص پاکیزگی اور پیار کے جذبے لیے اس کے ظاہری وجود پر چھا رہی تھی ----

اور

یہی بات میرے دل و دماغ پر آرے چلاتی تھی ---- ساجدہ جب بھی عجز و انکساری کا مرقع بن کر مجھ سے باتیں کرتی۔ میری برتری مانتی مجھے عظمت کا مینار قرار دیتی' میرے ظرف کو اعلیٰ جان کر تعریف کرتی۔

تو

میں

اندر ہی اندر سلگ جاتا ---- اپنا مجرم بن کر اپنے ضمیر کے کٹہرے میں گھسیٹا جاتا ---- اور احتساب کے عمل میں پس جاتا۔

○ ☆ ○

"ڈیڈی ----- ڈے ----- ڈی -----"

ساجدہ اپنا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑے آنکھیں بند کیے بے اختیارانہ چیخ رہی تھی ----- وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دیوانہ وار چیخنے لگتی اور کبھی چیخ چیخ کر بے ہوش ہو جاتی -----

گھر کے نوکر چاکر کمرے کے باہر جمع تھے اور سیفو کی بیوی ساجدہ کے پاس تھی ----- سب رو رہے تھے۔ اور جب ساجدہ چیخ چیخ کر ڈیڈی ڈیڈی کرتی ----- تو نوکروں کی گھٹی گھٹی روتی آوازیں بھی بلند ہو جاتیں۔

میں دفتر پہنچا ہی تھا ----- کہ میرا کیشیئر حمید واجدی بھاگا بھاگا میری طرف آیا -----

میں گاڑی سے بریف کیس نکالنے کے بعد گاڑی بند کر رہا تھا۔

"سر ----- سر" وہ حواس باختہ سا تھا۔

"کیوں ----- خیریت ----- حمید ----- بہت گھبرائے ہوئے ہو۔"

"سر ----- کل آپ نے نیوز سنی تھیں -----"

"کونسی۔"

"وہ ----- وہ جو طیارہ تباہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں -----"

میں قدم اٹھا کر آگے بڑھنے کو تھا ----- کہ یکدم چونک کر حمید کی طرف دیکھا -----

"سر ----- رحمان صاحب اسی طیارے میں تھے -----"

"نہیں -----"

"سر وہ اسی طیارے میں تھے۔ اور طیارے کا کوئی فرد نہیں بچ سکا"

"کیا کہہ رہے ہو۔"

میرا سارا وجود کانپ گیا ----- اور مجھے یوں لگا جیسے میں زمین کے اندر دھنسا جا رہا ہوں۔

"سر ان کی ٹیلکس فرینکفرٹ سے آئی تھی نا ----- اس طیارے سے وہ جدہ آ رہے تھے

-----"

"لیکن -----"

میرا سر چکرانے لگا۔ حمید نے آگے بڑھ کر میرا بریف کیس پکڑ لیا اور مجھے سامنے والے کمرے میں لے گیا۔ جہاں پہلے سے لوگ بیٹھے تھے -----

میرا اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ اور دوسرے سرکردہ لوگ اس المناک حادثے کی باتیں کر رہے تھے۔

میرے داخل ہوتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ سوگوار چہرے اور جھکے ہوئے سر بتا رہے تھے۔ کہ رحمان کے طیارے میں تباہ ہونے کی خبر غلط نہیں ہے۔

میں کل کام ہی کے سلسلے میں پورا دن فیصل آباد گزار کر رات گئے واپس آیا تھا۔ کل صبح کی خبروں میں طیارے کی تباہی کی خبر سنی تھی۔

لیکن

خبر صرف خبر کے طور پر سنی تھی ----- طیارہ کئی ہزار فٹ کی بلندی پر پھٹ کر تباہ ہوا تھا ----- اور اس کے عملے اور مسافروں سے کوئی بھی نہ بچ پایا تھا ----- یہ کب پتہ تھا۔ کہ اس طیارے میں رحمان بھی ہلاک ہو گئے ہیں۔

میں کرسی میں گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس المناک خبر نے کچھ دیر کے لیے واقعی میرے حواس گم کر دیئے تھے۔

سب باتیں کر رہے تھے۔

"لیکن" میں نے اس خبر کو بے یقین بنانے کے لیے کہا "طیارے کے حادثے میں رحمان صاحب -----"

"سر" منیجر اسد بولا ----- "کل ہی تو ان کی ٹیلکس ملی تھی ----- سوری کل نہیں پرسوں۔"

"ہاں۔"

"پھر کل کنفرم بھی تو ہو گیا ہے ----- ہوٹل میں ٹیلکس دی ہم نے ----- ایئرپورٹ پر رابطہ قائم کیا۔ رحمان اسی طیارے میں سوار ہوئے تھے -----"

"کنفرم ہو گیا۔"

"ہاں جی ----- کل آپ تو یہاں تھے نہیں اک قیامت مچی تھی۔ آج صبح سویرے تصدیق ہو گئی ہے۔ اور باقاعدہ اطلاع بھی مل گئی ہے۔"

"اوہ -----"

میں ایکدم اٹھ کھڑا ہوا ----- مجھے اچانک ہی ساجدہ کا خیال آ گیا۔ رحمان کا تعلق صرف

فیکٹری ہی سے تو نہ تھا ----- ساجدہ پر کیا بیتی ہو گی ----- اس کا کیا حال ہو گا۔

میں نے گھبرا کر سوچا ----- اور حمید سے بریف کیس گاڑی میں رکھنے کا کہہ کر اسسٹنٹ منیجر اسد سے بولا "فیکٹری بند کر دی جائے۔"

"جی بہت اچھا-----"

میں نے اسد کو کچھ اور ضروری ہدایات دیں۔ عجلت میں اکاؤنٹنٹ کو کئی کام سونپے اور تیز تیز قدم اٹھاتے گاڑی کی طرف آیا -----

"سر سب لوگ مس رحمان ڈوگر سے افسوس کے لیے ان کے گھر جانا چاہتے ہیں -----"

میں نے سر ہلایا اور جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں گاڑی اڑاتے رحمان کے گھر پہنچا ----- گاڑی رکتے ہی میرے کانوں میں ساجدہ کی چیخوں کی آواز اتری -----

میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح دروازے میں داخل ہوا۔ کوریڈور عبور کیا لاؤنج میں کھڑے نوکروں اور ساتھ والی کوٹھیوں سے آئے کچھ لوگوں کے درمیان سے گزرا -----

ساجدہ کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میرا سارا وجود پسینہ پسینہ تھا۔ اور رواں رواں کانپ رہا تھا۔ شاید میرا رنگ بھی فق تھا۔ میں نے دروازے کے پٹ کا سہارا لیا۔

ساجدہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ کبھی چیخ اٹھتی اور کبھی بے دم ہو جاتی -----
سیفو کی بیوی کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی ----- سیفو کی بیوی بھی ہچکیوں سے رو رہی تھی -----
شاید تسلی دینے کو اس کے پاس الفاظ ہی نہ تھے۔

ساجدہ کی تڑپ مجھ سے دیکھی نہ گئی -----

میں بے اختیارانہ آگے بڑھا -----

"ساجدہ" میں نے دونوں بازو پھیلا دیئے -----

"راج ----- راجو ----- میرے ڈیڈی کی -----" وہ تڑپی اور میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

وہ چیختے چیختے روتے روتے اور ڈیڈی ڈیڈی کرتے میرے بازوؤں میں بے ہوش ہو گئی۔

"ساجدہ ----- ساجدہ -----" میں نے گھبرا گھبرا کر اسے پکارا ----- لیکن وہ بے سدھ تھی-----

میں نے اسے بیڈ پر ڈال دیا ----- خود اس پر جھک گیا۔ سیفو کی بیوی نے پانی کا گلاس مجھے تھما دیا۔

میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے ----- اس کے دانت سختی سے بند تھے۔ وہ گہری بے ہوشی میں جا چکی تھی -----

لاؤنج میں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ سیفو اور رحمت دین کی اونچی آواز میں رونے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں -----

میں ساجدہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چند خواتین کمرے میں آ گئیں۔ شاید یہ اردگرد کی کوٹھیوں میں رہنے والے ہمسائے تھے۔

"کیسے خبر ملی۔"

"کب ملی۔"

"تصدیق کروانا تھی۔"

"کنفرم ہو گیا کہ رحمان اسی طیارے میں تھے؟"

وہ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں۔ ساجدہ کی حالت دیکھ کر دو ایک کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں -----

ساجدہ کی بے ہوشی کسی طرح ٹوٹ ہی نہ رہی تھی۔ میں اسے بلا بلا کر پانی کے چھینٹے دے دے کر کر تھک گیا -----

مجھے اس بے ہوشی سے تشویش ہونے لگی ----- لپک کر گیا اور ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ ان کا فیملی ڈاکٹر منہاس تھا ----- اور چند کوٹھیوں کے فاصلے پر رہتا تھا ----- ڈاکٹر گھر ہی پہ مل گیا۔ میں نے انہیں رحمان کی ہلاکت کی خبر سنائی ----- اور ساجدہ کی حالت سے آگاہ کیا -----

"فوراً پہنچ رہا ہوں۔" اس نے کہا ----- میں نے ریسیور پٹخا اور بھاگ کر ساجدہ کے کمرے میں آیا۔

کچھ عورتیں اس کے بیڈ کے گرد تھیں۔ دو ایک اس پر جھکی تھیں اور ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں -----

مجھے ان میں سے کسی سے بھی پہلے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ شاید انہوں نے بھی مجھے پہلے نہیں دیکھا تھا -----

میں بیڈ کی طرف بڑھا ----- تو سب جھجک کر پرے ہٹ گئیں۔
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔
ڈاکٹر کے آنے تک میں ساجدہ کو ہوش میں لانے کی مسلسل جدوجہد کرتا رہا ----- لیکن
وہ تو کسی طور ہوش میں آ ہی نہ رہی تھی -----
ڈاکٹر منہاس آ گیا۔ رحمان کی موت کی خبر نے اسے خاصہ پریشان کر دیا تھا ----- اس کی آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی -----

اس نے ساجدہ کو ہوش میں لانے کی تگ و دو شروع کر دی۔ میں باہر لاؤنج میں آگیا اور اردگرد سے آئے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر رحمان صاحب کی اس حادثاتی موت پر افسوس کا اظہار کرنے لگا-----

ساجدہ کو کئی گھنٹے بعد ہوش آیا۔ تو وہ اتنی نقاہت محسوس کر رہی تھی کہ آواز نہ نکل پائی تھی-----

میں نے بے تابی سے آگے بڑھ کر اس پر جھکتے ہوئے کہا "صبر کرو ساجدہ ----- صبر کرو -----"

اور اسے صبر کی تلقین کرتے ہوئے جانے خود مجھے کیا ہوگیا۔ میری آواز رندھ گئی ----- اور الفاظ حلق میں اٹک گئے ----- میں نے دونوں ہاتھوں پر اپنا چہرہ گرا لیا۔ اور ساجدہ کے بیڈ کے کنارے پر ساجدہ کی طرف کمر کرکے بیٹھ گیا۔

ساجدہ صورت حال سے باخبر ہوتے ہی پھر زور زور سے چیخنے لگی ----- صدمہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا ----- وہ برداشت بھی کیسے کرتی ----- اور پھر بے چاری کا اس دنیا میں اور تھا بھی کون -----

اک باپ تھا۔ جس کا اسے سہارا تھا۔ وہ سہارا ٹوٹ گیا چھوٹ گیا----- بے سہارا لڑکی گرتی پڑتی تھی -----

اسی رات ساجدہ کو دل کا دورہ پڑ گیا ----- ڈاکٹر منہاس بے طرح گھبرا گیا----- پہلے ہی وہ اتنی کمزور اور نحیف سی تھی۔ اب تو ہاتھوں سے نکل رہی تھی -----

اٹیک معمولی تھا۔

لیکن

ساجدہ پر غیر معمولی بن کر ٹوٹا -----

میں نے وہ ساری رات ساجدہ کے سرہانے بیٹھ کر گزار دی۔ وہ اتنی کمزور تھی۔ کہ اسے ہوسپٹل لے جانا بھی مشکل تھا۔ ڈاکٹر منہاس سے جو کچھ بن رہا تھا ----- کر رہا تھا -----

کئی دن ساجدہ سنبھل نہ سکی۔ میں دن رات اس کے قریب رہا----- نرس خدمت پر مامور ہونے کے باوجود میں خود اس کی خدمت میں پیش پیش رہا----- اس قربت اور خدمت نے ساجدہ کو زندہ رہنے اور زندگی سے پیار کرنے کا حوصلہ دیا -----

وہ اکثر میرے کندھے پر سر رکھ کر جذباتی انداز میں کہتی۔ تم مجھے سہارا نہ دیتے تو میں مر جاتی راج ----- میں تمہارے سہارے زندہ ہوں ----- تمہارے سہارے ----- ورنہ ڈیڈی سے بچھڑ کر میں کیسے جی سکتی تھی -----"

میں اسے تھپتھپا دیتا -----

○ ☆ ○

رحمان کے مرنے کا مجھے بلاشبہ بہت صدمہ ہوا تھا۔ کئی دن میں پریشان رہا تھا۔

لیکن

مجھے سچائی کے اعتراف میں باک نہیں تھا۔ کہ ان کی اچانک موت نے میرے دل و دماغ سے بوجھ اتار دیا تھا۔ میری تذبذب والی کیفیت ختم ہوگئی تھی ----- کشمکش اور ذہنی انتشار سے چھٹکارا مل گیا تھا ----- اب ان کی واپسی کا ڈر نہیں تھا۔ اور کوئی خطرہ مجھے اپنے سر پر منڈلاتا محسوس نہ ہوتا تھا -----

اب میں پورے کاروبار کا مالک تھا ----- ساجدہ نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا ----- وہ خود اب اس قابل بھی کہاں تھی کہ کاروبار اپنے کندھوں پر ڈالے۔ پھر مجھ پر اسے بھروسہ اور اعتماد تھا۔

یہ بھروسہ

اور

اعتماد

اس کی بیماری اور میری خدمت گزاری نے اتنا مستحکم اور مضبوط کر دیا تھا۔ کہ مجھے ساجدہ اگر خدا نہیں تو خدا کا سایہ سمجھنے لگی تھی -----

میں پوری لگن سے کاروبار میں مصروف تھا ----- ساجدہ کبھی کبھار دفتر کا چکر لگا جاتی ----- اس کو ڈاکٹر نے زیادہ کام کرنے سے منع کر دیا تھا ----- ہاں ایک کام وہ بڑے شوق سے کر رہی تھی ----- تین بیڈ روم کی کوٹھی جو رحمان صاحب کے جانے کے دو تین ہفتے بعد خرید لی گئی تھی ----- اور جس کو سجانے بنانے میں وہ مصروف تھی ----- اب پھر وہ کام شوق سے کر رہی تھی۔

لیکن

اب

میں بالکل مطمئن اور بے فکر تھا -----

اس دن میں کام میں مصروف تھا ----- باہر کی ایک بہت بڑی پارٹی سے کام ملا تھا ----- یہ کام

اتنا منافع بخش تھا۔ کہ لوہے کا سونا بننے والی بات تھی۔

میں یہ خوش کن خبر ساجدہ کو سنانے کے لیے اسے رنگ کرنے کا سوچ رہا تھا۔ لیکن نمبر ڈائیل بھی نہ کر پایا تھا۔ کہ وہ خود ہی آگئی ......

وہ کمزور نظر آتی تھی۔ رنگت اب بالکل نیلاہٹ لیے زرد تھی۔ ہونٹ پہلے سے بھی زیادہ باریک لگتے تھے۔ چہرہ بے رنگ و ویران تھا۔ بال شاید بنانا ہی چھوڑ دیے تھے۔ یا کٹنگ نہیں کروائی تھی۔ بکھرے ہوئے لگتے تھے۔ انسان سے زیادہ وہ بھتنی لگ رہی تھی۔

جب سے رحمان فوت ہوئے تھے۔ ساجدہ نے لباس وغیرہ سے بھی لاپرواہی برتنا شروع کر دی تھی۔ اب بھی اس نے بے رنگ و بے ترتیب سا لباس پہن رکھا تھا۔

"آؤ آؤ ...... میں تمہیں رنگ کرنے ہی والا تھا" میں نے خوشی سے کہا۔

"کیا بات۔"

"بہت بڑا آرڈر ملا ہے۔ بڑا منافع بخش......"

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی ۔اس خبر پر اس نے کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہ کیا......

"بولی میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

"کہاں۔"

"بازار۔"

"اس وقت۔"

"کیوں ...... بہت مصروف ہو۔"

"کچھ زیادہ نہیں ...... کام ہو گیا ہے ...... اس خوشی میں اب چھٹی بھی کر سکتا ہوں" میں نے جھوم کر کہا۔ سگریٹ سلگایا اور دھواں آہستہ آہستہ نگلنے اگلنے لگا۔

"تو چلو۔"

"کیا لینا ہے بازار سے۔"

"پردے ......"

"پردے۔"

"ہاں ماسٹر بیڈ روم کے پردے ...... کپڑا میں دیکھ آئی تھی ...... چلو تم بھی اپنی پسند بتا دو ...... کچھ رائے تو دو گے نا......"

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ساجدہ کی طرف دیکھا...... میری نظروں میں طنز و تمسخر تھا...... جسے وہ سمجھ نہ پائی ...... کیونکہ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ شرما گئی تھی......

ایک لمحہ کو میرا دل اچھلا......

لیکن دوسرے لمحے میں پر سکون تھا......

ساجدہ نے پھر کہا "چلو نا......"

"اچھا ...... چند منٹ ریٹائرنگ روم میں بیٹھو ...... میں ایک چکر فیکٹری کے اندر لگا آؤں۔"

"دیر کر دو گے۔ چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے ...... کام ہو رہا ہے آخر تمہارے اسسٹنٹ کس مرض کی دوا ہیں......"

"بہت بہتر جناب......"

میں نے فون اٹھایا اور اسسٹنٹ منیجر اسد کو ضروری ہدایات دینے لگا۔

فارغ ہوتے ہی میں نے مسکرا کر ساجدہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک فائیل اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔

"کیا دیکھا جا رہا ہے۔"

"کچھ نہیں۔"

"کسی کسی دن آڈٹ کے لیے آجایا کرو۔"

"ہٹو بھئی۔"

اس نے فائیل واپس رکھ دی ...... پھر میری طرف اپنی باریک آنکھوں کو پورا کھول کر دیکھتے ہوئے بولی "تم سیاہ و سفید کے مالک ہو۔"

"آڈٹ میں کیوں کروں گی راج......"

"شکریہ شکریہ" میں نے سر جھکا کر ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا "لیکن محترمہ میں سیاہ و سفید کا مالک کیوں کر ہو گیا۔ بندہ جنابہ کا خادم ہے خادم۔"

میری شوخ بیانی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی

"ڈیڈی کی وصیت تم پڑھ چکے ہو۔"

میں بھی اب سنجیدہ ہو گیا ...... ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا' مرحوم شاید اس بات سے آگاہ تھے ...... کہ لوٹ کر واپس نہیں آئیں گے" وہ روہانسی ہو گئی۔ آہستگی سے بولی۔

"وصیت سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ مجھ سے تو انہوں نے ذکر تک نہیں کیا تھا......"

"ان کے وکیل نے مجھے بتایا ہے......"

"ہاں میرے سامنے ہی بتا رہے تھے۔"

"لیکن ......"

"کیا۔"

"یہ وصیت اب بدلنا پڑے گی۔"

"کیا مطلب۔"

"بھئی ساجدہ۔"

"ہوں۔"

"رحمان مرحوم نے جو کچھ چھوڑا ہے۔ وہ سب تمہارا ہے۔ میں اس میں حصہ دار بننے کا حق نہیں رکھتا۔"

"ڈیڈی مرحوم کی خواہش تھی۔ کہ تمہیں حصہ دار بناتے ---- کیا تم اس کے برعکس کر کے ان کی روح کو بے چین کرنا چاہتے ہو۔"

میں چپ رہا۔ یہ چپ بڑی مضطرب تھی۔ حقیقتاً میں ایسا نہیں چاہتا تھا ---- جو وہ وصیت میں لکھ گئے تھے۔

وہ بولی "فرق کیا پڑتا ہے راجو ---- جو کچھ میرا ہے وہ تمہارا ہے ---- میں تو بقیہ حصے کو بھی قانونی طور ----"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ رحمت دین نے کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع دی تھی ----

اس نے کارڈ میری طرف بڑھایا ---- کوئی مسعود میر تھے ---- سکریپ کا کام کرتے تھے۔

ہم نے فیکٹری کے لیے سکریپ کا اشتہار دیا ہوا تھا۔ وہ غالباً اسی سلسلہ میں آئے تھے ----

میں نے ساجدہ سے کہا "پلیز تم ریٹائرنگ روم میں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ ---- میں ان صاحب سے مل لوں ----"

وہ اچھا کہہ کر اٹھی ---- اور میری پشت پر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر جانے سے پہلے بولی "زیادہ دیر نہ لگا دینا ---- آج میں نے ضرور پردے خریدنا ہیں۔"

"اچھا اچھا" میں نے کہا اور رحمت دین کو ملاقاتی کے اندر بھیجنے کا کہہ دیا ----

مسعود میرا اندر داخل ہوا ---- تو میں اسے دیکھتے ہی اچھل پڑا ---- وہ میرا کالج کا ساتھی تھا۔ ہم دونوں نے چار سال اکٹھے پڑھا تھا ---- بی اے کے بعد دونوں الگ الگ راہوں پر چل پڑے تھے۔ وہ ان دنوں سکریپ کا کام کر رہا تھا۔

ہم دونوں تپاک سے بغلگیر ہوئے۔ اور دیر تک ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خوشی کا اظہار کرتے رہے ----

"مجھے کیا پتہ تھا ---- کہ فیکٹری منیجر تم ہو" مسعود کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ----

"اب تو پتہ چل گیا" میں نے ہنس کر کہا ----

"اب تو اپنی فیکٹری ہوئی ----"

کام کیسا ہے۔"

"بہت اچھا۔ خوب چل رہا ہے۔ تمہارا اشتہار دیکھا تو سوچا اس فیکٹری سے بھی بات کر لوں ----"

میں نے رحمت دین سے چائے لانے کا کہا اور اعلیٰ برانڈ کا سگریٹ اسے پیش کیا ----

"شکریہ" اس نے جیب سے اپنا سگریٹ نکالا "میں اس کے علاوہ کوئی برانڈ نہیں پی سکتا۔"

"بڑے ٹھاٹھ ہیں"

"تمہارے تو مجھ سے بھی زیادہ ---- کیا شاندار آفس ہے ---- خود بھی پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئے ہو۔"

میں نے تفاخر سے گردن اکڑائی اور ہنس کر بولا "پہلے سے زیادہ کا کیا مطلب؟ میں تو پیدائشی خوبصورت ہوں جناب ----"

"اب پر وقار بھی ہو گئے ہو" اس نے سگریٹ کا دھواں اڑایا۔

پھر ہم دونوں پرانی باتیں کرنے لگے۔ پرانے دوستوں کا حال احوال پوچھنے لگے۔ رزاق ---- جمشید ---- اسلم ---- درانی اور طاہر نودھی وغیرہ ہمارے کلاس فیلو تھے۔ کسی کے متعلق مجھے اب علم نہیں تھا۔ کسی کو مسعود میر بھلا بیٹھا تھا۔ پرانی باتیں یاد کر کر کے ہم بے حد محظوظ ہوئے۔

"شادی وادی کر لی" میں نے مسعود سے پوچھا ----

"ہاں ماشاء اللہ دو بچوں کا باپ ہوں۔"

"واقعی۔"

"ہاں ---- اور تم ----"

"ابھی تک تو یہ غلطی نہیں کی۔"

"پاگل ہو ---- اوہ ---- سچ تمہاری تو اپنے رشتہ داروں ہی میں بات ہونا تھی نا ----"

میں ایک دم گھبرا گیا ---- میں نہیں چاہتا تھا اس سلسلہ میں کوئی بات ہو ---- ساجدہ ریٹائرنگ روم میں بیٹھی تھی نا ----

رحمت دین چائے لے آیا ---- میں نے دل ہی دل میں شکر کیا چائے کے آ جانے سے باتوں کا موضوع ہی بدل گیا۔

چائے کے بعد ہم کاروباری باتیں کرنے لگے ---- سکریپ ہمیں بھاری مقدار میں درکار تھا۔ مسعود میر جتنا سپلائی کر سکتا تھا۔ اس نے بتا دیا ---- ریٹ اور دیگر شرائط بھی طے ہونا تھیں اس لیے ہمیں کافی دیر لگ گئی۔

"معاف کیجئے گا" میری پشت سے ساجدہ کی آواز آئی۔ وہ کمرے میں آ رہی تھی۔

مسعود میر نے اسے دیکھا۔ ایک لمحہ کو یوں لگا جیسے اس نے کھلی آنکھوں سے چڑیل دیکھ لی ہے .....

میں کرسی میں ذرا سا اٹھتے ہوئے بولا "آجائیے ....."

پھر میں نے مسعود سے ساجدہ کا تعارف کروایا ....." مس ساجدہ رحمان ..... ان دونوں فیکٹریوں کی ڈائریکٹر....."

مسعود ہکا بکا سا تھا۔ بمشکل وہ اٹھا اور تعظیماً سرخم کر کے ساجدہ کو سلام کیا ..... "مسعود میر" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

ساجدہ نے اسے بیٹھنے کو کہا ..... خود کھڑے کھڑے میری طرف دیکھا۔

"ساجدہ ..... مسعود میر میرے دوست ہیں ..... ہم دونوں نے بی اے اکٹھے ہی کیا....."

میں نے مسعود کے کاروبار کے متعلق اسے مختصر بتایا ..... "آپ فارغ ہیں اب" ساجدہ نے ساری باتیں سن کر کہا۔

"بس چند منٹ....."

"میں گاڑی میں بیٹھتی ہوں ..... تم فارغ ہو کر آجاؤ....."

وہ کمرے سے نکل گئی ..... جاتے وقت اس نے سر کی جنبش سے مسعود کو بھی خدا حافظ کہا .....

اس کے جاتے ہی مسعود نے آنکھوں کو شوخی سے گھمایا اور شرارت سے بولا "یہ کیا بلا پال رکھی ہے۔"

"میرے مرحوم باس کی بیٹی ہے۔ میں نے کہا.....

"اب یہ تمہاری باس ہے۔"

"ہاں ..... یہی سمجھ لو....."

"کوئی اور چکر تو نہیں۔"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا ..... اور وہ خود ہی بولا "تم جیسا حسین اور حسن پسند بھلا اس شے سے کیا رغبت رکھے گا" وہ اپنی بات پر آپ ہی ہنس پڑا.....

"تم کل آسکتے ہو" میں نے مسعود سے کہا.....

"کیوں نہیں۔"

"پھر باقی باتیں کل کریں گے ..... مجھے ابھی جانا ہے۔"

"ضرور ضرور ....." وہ اٹھتے ہوئے بولا.....

میں بھی اٹھا.....

ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے۔ میری شان میرے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر مسعود میر متعجب تھا ..... گو وہ خود بھی اب خاصہ مالدار تھا۔ شاندار گاڑی میں آیا ہوا تھا۔ لیکن میرے رنگ ڈھنگ سے مرعوب ہو رہا تھا۔

مصافحہ کر کے وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھا اور میں ساجدہ کے پاس آگیا۔ مسعود آنکھوں ہی آنکھوں میں مضحکہ خیز اشارے کر رہا تھا۔

○ ☆ ○

ماجد دوبئی سے آ رہا تھا۔ گو اس کے آنے میں ابھی دو اڑھائی ماہ تھے۔ لیکن شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگی تھیں۔

اس کی آمد پر میری اور زیبی کی شادی ہونا تھی۔۔۔۔ پھپھو فہمیدہ تو جب سے منگنی ہوئی تھی۔ جہیز بنانے میں مصروف تھیں۔۔۔۔ بلکہ اس سے بھی پہلے سے بنا رہی تھیں ایک ہی ایک بیٹی تھی۔۔۔۔ بڑی دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ پورے پورے ارمان نکالنا چاہتی تھیں۔

اس روز میں دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آیا تو امی صحن میں تخت پر بیٹھی تھیں زوبی کالج جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اب میں اسے راستے میں ڈراپ کیا کرتا تھا۔۔۔۔

"تیار" میں نے زوبی سے پوچھا۔۔۔۔

"جی" وہ بولی۔۔۔۔ میں نے اس کے سراپا پر نگاہ ڈالی۔ کتنی بڑی ہو گئی تھی وہ بھی۔۔۔۔ خوشحالی اور فراغت کا اثر اس کے چہرے سے عیاں تھا۔۔۔۔

"راجے" امی نے مجھے اپنی طرف بلایا۔۔۔۔

"جی۔"

"کچھ پیسے چاہئیں۔"

"کتنے۔"

امی نے جو رقم بتائی وہ خاصی بڑی تھی۔ "اتنے پیسے کیا کرنے ہیں۔"

"زیبی کے لیے زیور بنانا ہے۔۔"

"اوہ۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔ لیکن امی اتنا زیادہ۔"

"میرا بس چلے تو اسے سونے میں پیلی کر کے لاؤں۔"

"امی۔۔۔۔ پیلی تو اب بھی ہو جائیں گی" زوبی مسکرائی "اتنے بڑے بڑے سیٹ تو آپ نے بنوا لیے۔۔۔۔ چوڑیاں کڑے چھج۔۔۔۔"

"تو گننے بیٹھ جا" امی ناراضگی سے بولیں "اللہ نظر بد سے بچائے۔۔"

میں ہنس دیا۔۔۔۔

"آج لے آنا پیسے" امی نے مجھ سے کہا۔

"بہت اچھا۔۔۔۔ جاتے ہی بنک سے نکلوا دوں گا۔۔۔۔"

میرا بنک بیلنس اب اتنا تھا۔ کہ اتنی بڑی رقم ہو سے یا نہ، کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔۔ لیکن بات یہ تھی۔ کہ میں اپنے لیے زمین خریدنے اور گھر بنوانے کا سوچ رہا تھا۔ اس لیے نہیں چاہتا تھا۔ کہ شادی پر زیادہ ہی فضول خرچی کی جائے اس لیے امی سے۔۔

"امی زیور کپڑے پر زیادہ پیسہ نہ ہی لگائیں۔"

"کیوں۔"

"اس سے زیادہ ضروری گھر ہے۔ میں زمین خرید رہا ہوں۔۔۔۔ گھر بنوانا چاہتا ہوں۔۔"

"گھر؟"

"ہاں امی۔"

"تجھے کوٹھی ملی نہیں فیکٹری کی طرف سے۔۔۔۔"

"وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ ملی ہے۔"

"تو پھر۔۔۔۔"

"وہ چھوٹی ہے۔ صرف تین بیڈ روم کی۔۔۔۔ میں پانچ بیڈ روم کی بنواؤں گا۔۔۔۔"

"وہ کس لیے۔"

"ہم سب۔۔۔۔"

"سب کی چھوڑ۔۔۔۔ ہم سب یہیں ٹھیک ہیں۔۔۔۔"

"نہیں امی۔"

"راج بیٹے۔۔۔۔ میں کسی اور جگہ جا کر نہیں رہ سکتی۔۔۔۔ یہ میرا گھر ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔ تیرے لیے جو کوٹھی خریدی گئی ہے۔ تو زیبی کے ساتھ وہاں رہے گا۔ تین بیڈ روم تم دونوں کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔۔۔۔"

میں تین بیڈ روم کی اس کوٹھی کے ذکر سے گریزاں تھا۔ جو خریدی تو میرے لیے اور میرے نام پر ہی گئی تھی۔۔۔۔ لیکن جسے ساجدہ ڈیکوریٹ کر رہی تھی اپنے اور میرے لیے۔۔۔۔

ان دنوں میں کس قدر شقی القلب ہو گیا تھا۔۔۔۔ مجھے قطعاً ملال نہ ہوتا تھا ساجدہ کے متعلق سوچ کر۔۔۔۔ میں اپنی شادی کی تیاریوں کو شوق و مسرت سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ زیبی میرے گھر میں دلہن بن کر آ رہی تھی۔ میں خوشی مسرت سے جیسے باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا۔ کہ ہفتوں کو دنوں اور دنوں کو گھنٹوں کی صورت دے دوں۔

میں نے ساجدہ کے متعلق بھی سوچ لیا تھا ---- میں اس کے سامنے مظلوم بننے کی اداکاری کروں گا۔ منہ بسور بسور کر اسے بتاؤں گا۔ کہ میری ماں میری راہ میں حائل ہو گئی ہے۔ وہ میری شادی اپنی رشتہ دار سے زبردستی کر رہی ہیں۔ میں بیوہ ماں کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا ---- وہ میرے انکار کی صورت میں خودکشی کر لینے کی دھمکی دیتی ہیں۔

میں پلان بنا رہا تھا ---- سوچ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا ---- کہ ساجدہ جیسی لڑکی کو بہلاوہ دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا ---- اداکاری کرنا آتی تھی ---- اس لیے کامیابی کا پورا یقین تھا ----

مجھے ڈر تھا تو صرف رحمان کا ---- اب تو میں آزاد تھا ---- ساجدہ سے کیسا ڈر اور کیسا دھڑکا ---- رحمان کو مرحوم ہوئے مہینوں ہو چکے تھے ----

"بات سن راجو" امی کی آواز پر میں خیالات سے چونکا۔

"جی۔"

"بڑا گھر بنانے کا خیال ابھی چھوڑ دے ---- گلبرگ والی کوٹھی جو تیرے لیے خریدی گئی ہے ---- تم دونوں کے لیے ٹھیک ہے ----"

"یعنی میں اور زیبی وہاں رہیں اور آپ سب یہاں۔"

امی میری بات پر ہنس پڑیں دعائیں دیتے ہوئے بولیں "خدا تم دونوں کو سلامت رکھے اور نئے گھر کی خوشیاں نصیب کرے۔"

میں شوخی سے بولا "آپ بہو کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتیں۔ ساس بن کر سوچ رہی ہیں نا۔"

"چل ہٹ" امی نے سرزنش کی ---- "بہو کوئی غیر ہوتی ---- تو ایسی بات کرتے اچھا نہیں لگتا۔ زیبی تو مجھے بیٹیوں سے بھی پیاری ہے۔۔"

"ہائے امی" زوبی شوخ ہو کر بولی۔ "ہم سے بھی۔"

"ہاں۔ امی نے کہا ----"

"جھوٹ" زوبی بولی "مجھے پتہ ہے میں آپ کو سب سے زیادہ پیاری ہوں۔"

"ہو ---- لیکن زیبی کا اپنا مقام ہے۔ تم تو چلتی ہو گی ----"

"ہاں امی" میں بولا "اس کی فکر بھی کریں اب۔ بہت بڑی ہو رہی ہے۔۔"

"اللہ مالک ہے بیٹے۔ جہاں اس کا نصیبہ ہو گا۔ ہو جائے گا۔"

ہم باتیں کر ہی رہے تھے ---- کہ زیبی آ گئی ---- اس کے ہاتھ میں کوئی کپڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھا۔

یوں لگا صحن میں صبح کی نورانی اور تازہ دم روشنی بکھر گئی ہے۔ وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی

---- مجھے دیکھ کر ذرا جھینپی اور خود ہی بولی "میں سمجھی تم دفتر چلے گئے ہو گے" وہ میرے قریب سے گذری۔

"جھوٹی کہیں کی ----" میں نے آہستگی سے کہا "مجھے دیکھے بنا رہ نہیں سکتی ---- بہانے بہانے چلی آئی۔"

وہ سرخ ہو گئی ---- اور امی کے پاس تخت پر پاؤں ٹکا کر بیٹھ گئی ----

"آپ نے یہ قمیض مانگی تھی نا ----" اس نے امی سے کہا۔

"ہاں ---- یہی ----" امی نے قمیض اس کے ہاتھ سے لے کر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اے" میں زیبی کے قریب آ گیا۔ وہ سمٹ کر امی کے قریب ہو گئی۔

مجھے اس کے ڈرنے کی یہ ادا بے حد اچھی لگی ----

"کیا ہے" اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"سنو۔"

"ہوں۔"

"میری امی سے تم نے کہا۔"

"کیا؟" زیبی کے ساتھ امی اور زوبی بھی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"کہ شادی کے بعد تم یہاں نہیں رہو گی ----" میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر سنجیدہ بنتے ہوئے بولا۔

"زیبی بوکھلا گئی ---- "تم میرے گھر والوں کے ساتھ یہاں نہیں رہنا چاہتیں۔ شادی ہوتے ہی گلبرگ والی کوٹھی میں جانا چاہتی ہو۔"

زیبی روہانسی ہو کر بولی "میں نے کب کہا۔"

میں ہنسی لبوں میں دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ امی کی ڈانٹ پڑی "کیا بکواس کر رہا ہے ----"

پھر زیبی کو گلے سے لگاتے ہوئے بولیں "ہراساں کر دیا میری بچی کو ---- مذاق کر رہا ہے بچی ----"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا ---- زیبی خونخوار نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اور امی نے مجھے ایک ہی زبان میں کئی صلواتیں سنا ڈالیں۔

مجھے خوب مزہ آ رہا تھا ---- چند لمحے یہی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی ---- پھر میں نے امی سے سنجیدگی سے کہا "میں اپنی کوٹھی بنواؤں گا امی ---- زمین دیکھ لی ہے دو کنال ---- میرے ایک دوست مسعود میر ہیں۔ ان کی وساطت سے زمین کچھ سستی مل جائے گی۔ کوٹھی بھی وہی بنوائیں

گے۔ میرے پاس تو وقت نہیں ہوتا ----"

"اللہ خیریت رکھے بیٹے ---- جیسے جی چاہے کرنا ---- اگر تجھے بڑی کوٹھی کا شوق ہے تو بنوا لینا ---- لیکن میں رہوں گی یہیں ----"

"کیوں امی" زوبی بولی "یہ ٹھاٹھ سے کوٹھی میں رہیں گے سب۔"

"نہیں بیٹی ---- یہ میرا گھر ہے ---- میں یہاں ہی بیاہ کر آئی تھی ---- ساری عمر ان دیواروں اور چھتوں تلے گزاری ہے۔ میں مر کر ہی اس گھر سے نکلوں گی۔"

"زیبی بڑی خوش ہے آپ کی بات سے" میں نے جان کر زیبی کو چھیڑا۔

وہ جھلا کر بولی "میں کیوں خوش ہونے لگی ----"

"بک بک کئے جا رہے ہو" امی نے سرزنش کی۔

"چلئے نا بھائی جان" زوبی نے ریسٹ واچ دیکھی "دیر ہو رہی ہے مجھے ----"

"چلو ---- چلو ----" میں نے کہا۔ آستین کھینچ کر اپنی گھڑی دیکھی باتوں میں بھی لیٹ ہو رہا تھا ----

زوبی کتابیں لیے میرے قریب آ گئی۔ میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا ---- "خدا حافظ" میں نے امی سے کہا اور زیبی پر پیار بھری نگاہ ڈالی۔ زیبی نے منہ بنا کر میرا منہ چڑایا ----

جی تو چاہا پلٹ کر اس پر جھپٹ پڑوں۔ لیکن امی اور زوبی کی موجودگی میں ایسا کب کر سکتا تھا۔ دانت پیس کر اسے گھورا ---- وہ پھول کی طرح کھل اٹھی ----

زوبی اور میں باہر آ گئے ---- میرا انگ انگ مخمور و سرشار تھا ----

○ ☆ ○

مجھے تین دن کے لیے فیصل آباد منڈی بہاؤ الدین اور سرگودھا جانا تھا ---- وہیں سے کراچی اور واپسی پر سکھر اور حیدر آباد بھی ہو کر آنا تھا۔ کچھ تو ذاتی کام تھے۔ کچھ فیکٹریوں کے۔ کراچی ایک میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ اور سکھر حیدر آباد کی پارٹیوں سے کاروباری لین دین تھا ----

میں نے اپنی غیر حاضری میں ہونے والے کاموں کے متعلق اپنے اسسٹنٹ کو ہدایات دے دی تھیں۔ اکاؤنٹنٹ کو بھی وضاحت سے سمجھا دیا تھا ---- پہلی فیکٹری کا ان دنوں سارا کام احمد خان کے سپرد تھا۔ احمد خان محنتی اور ایماندار آدمی تھا۔ رحمان مرحوم کا اسسٹنٹ تھا۔ اب اس فیکٹری کا سارا کام وہی چلا رہا تھا۔ کسی کسی دن ساجدہ وہاں چلی جاتی تھی ---- اور کام کی دیکھ بھال کرتی تھی ---- وہ فیکٹری بھی کافی پرافٹ دے رہی تھی ---- اس لیے میں احمد خان سے مطمئن تھا ----

اسد اور کلیم کو ہدایات دینے کے بعد میں نے دو ایک جگہ ضروری فون کئے ----

ساجدہ کا نمبر ڈائیل کر ہی رہا تھا کہ مسعود میر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک سال کا کنٹریکٹ ہوا تھا ---- سارا سکریپ وہی سپلائی کر رہا تھا ---- بہت مصروف آدمی تھا۔ لیکن دوستی کے ناطے کبھی کبھی میرے آفس میں آ بیٹھتا اور دلچسپ باتیں کرتا رہتا ----

میں نے نمبر ڈائیل نہیں کیا ----

"آؤ۔ آؤ" میں نے کرسی میں قدرے اٹھتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"آ گیا آ گیا" اس نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "کیسے ہو۔"

"فائن" میں نے کہا "تم کہو۔"

وہ کرسی میں بیٹھ گیا ---- میں نے اپنے سامنے رکھی فائلیں ایک طرف کر دیں۔

"کام میں حارج تو نہیں ہوں" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"حارج بھی [illegible] جاؤ ---- تو میں [illegible] سکتا [illegible]" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ [illegible] سے بھی سگریٹ [illegible] اور سلگاتے ہوئے [illegible]

"[illegible] رہے ہو رجسٹری۔

"تمہاری زمین کی۔"

"ہاں۔"

"آج پیسے ملے، آج ہی ہو جائے گی۔"

"معیانہ کر دیا نا۔"

"ہاں۔"

"معیاد لی ہے۔"

"تین ماہ کی۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

"پیسے نہیں ہیں کیا۔"

"یار ہیں تو ---- لیکن۔"

"لیکن کیا۔"

"شادی کر رہا ہوں۔"

"ہاں ہاں ---- میں نے بھی سنا ہے۔"

"کس سے سنا۔"

"سب سے۔"

"کیا مطلب ---- میری شادی کے متعلق کسی کو علم کیسے ہوا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ---- پھر ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا "بڑے کایاں ہو۔"

"کیوں۔"

"میں نے بات کی تھی تو طرح دے گئے تھے۔"

"کیسی بات ----"

"مس ساجدہ ذوگر سے چکر کی۔"

"اوہ میر صاحب ---- خدا کے لیے۔"

میں ہنستے ہوئے کرسی میں پھیل سا گیا۔

"خیر اچھی بات ہے۔ ہاتھ خوب مارا ہے۔ مزے میں رہو گے۔ پھر دن کی بھی تو بات ہے بڑی کیا چیز والی ----"

"کیا بکتے ہو" میں ہنستے ہوئے بولا۔

"میں کیا بکتا ہوں۔ سب یہی بکتے ہیں۔ فیکٹری کا ہر آدمی کہہ رہا ہے ----"

"کہ میں مس ساجدہ سے شادی کر رہا ہوں۔"

"ہاں۔"

میں نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے میں تمسخر تھا۔ مسعود حیرانگی سے مجھے تکنے لگا۔ چند لمحے چپ رہ کر بولا "کیا یہ بات صحیح نہیں۔"

"کیا یہ بات صحیح ہو سکتی ہے" میں نے دل کھول کر ہنستے ہوئے میز پر ہاتھ مارا ---- تمہاری عقل باور کرتی ہے۔ کہ میں اس لڑکی سے ----"

"لیکن" وہ میری بات کاٹ کر بولا "میں نے تو یہی سنا ہے ---"

"پاگل ہو" میں پھر تمسخر سے ہنسا "میں اور ساجدہ ذوگر سے شادی کروں گا ---- دیکھی ہے کبھی ساجدہ ذوگر ----"

"ہاں۔"

"چڑیل نما شے ہے نا ---- اتنی بدصورت ایسی کریہہ المنظر ---- جسم نہ شکل ----" مجھ میں جیسے شیطانی روح حلول کر گئی تھی ---- برابر ہنس رہا تھا اور ساجدہ کا تمسخر اڑا رہا تھا .... "کبھی ہاتھ دیکھے ہیں، ذبح کی ہوئی مرغی کے پنجے لگتے ہیں۔"

میں نے اپنی بات پر آپ ہی قہقہہ لگایا۔ مسعود ہنسا تک نہیں حیرانگی سے بولا۔

"یہ بات ہے ---- تو تم نے اس کے ساتھ اس قسم کے تعلقات کیوں بنا رکھے ہیں ---- کہ لوگ سمجھنے لگیں تم اس سے شادی کر رہے ہو۔"

میں نے میز پر پھر ہنستے ہوئے ہاتھ مارا اور آگے کو جھکتے ہوئے رازداری کے انداز میں اونچی آواز میں بولا "یہی تو رازداری کی بات ہے یار ----"

"کیا۔"

"بھئی جس مقام پر میں اب ہوں۔ دیکھ رہے ہو نا۔"

"ہاں۔"

"ترقی کے اس مقام پر میں اپنی لیاقت اور کوشش سے اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتا تھا ---- اس مقام کے لیے زینے کی ضرورت تھی ---- زینے کی ---- میں نے ساجدہ کو زینہ بنایا ---- اور دیکھ لو ---- کتنی جلدی ترقی کر لی ---- یہ ٹھاٹھ باٹھ یہ عزت و وقار یہ دھن دولت ----" میں نے پھر قہقہہ لگایا "سب اس زینے کی بدولت ہے۔"

مسعود میری بات سن کر جیسے ششدر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ناگوار سی کیفیت تھی ---- ایسی ناگوار کیفیت۔ جو تعفن اور بدبو سے پیدا ہوتی ہے یا کوڑے کے ڈھیر کے قریب سے گزرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

میں نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔۔ ننھا سا تمسخر بھرا قہقہہ لگایا۔ اور بولا "فیکٹری کے لوگ کیا۔۔۔۔ ساجدہ بھی یہی سمجھتی ہے۔ کہ میں عنقریب اس سے شادی کر رہا ہوں۔۔۔۔ کیا خوش فہمی ہے۔۔۔۔"

"تم نے اسے تاثر دیا ہو گا تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہوئی ہو گی۔۔"

"سب چلتا ہے میرے یار۔۔۔۔ گھی نکالنا مقصود ہے۔۔۔۔ انگلی سیدھی استعمال ہو یا الٹی" میں نے مسکرا کر کہا۔۔۔۔ مسعود کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ بے زاری بھی پھیل گئی۔

میں باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔ اس سلسلے میں شکیل کا ذکر بھی کیا مسعود چپ چاپ حیران سا میری باتیں سن رہا تھا۔۔۔۔ میں اپنے اس جعلی عشق کی باتیں اسے سنا رہا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میری پشت پر کھلنے والا ریٹائرنگ روم کا دروازہ کھلا اور ایک دم بند ہوا ہے۔ "کون تھا" میں نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں مسعود سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "پتہ نہیں۔۔۔۔ شاید ہوا سے دروازہ بند ہوا ہے۔۔۔۔"

مجھے یقین نہ آیا۔ اندر ہی اندر گھبراہٹ ہوتی رہی۔ دھڑکا سا لگ گیا۔ کہ کہیں ساجدہ نہ آئی ہو۔۔۔۔ اور اس نے میری باتیں نہ سن لی ہوں۔ وہ اکثر ادھر ہی سے آتی تھی۔۔۔۔ خاموشی سے۔۔۔۔ چپکے چپکے۔۔۔۔

میں نے چاہا کہ اٹھ کر دیکھوں۔۔۔۔

لیکن۔۔۔۔

مسعود کی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔

مسعود بڑا بیزار بیزار سا بیٹھا تھا۔ لگتا تھا میری باتوں سے میری ذہنیت اس پر عیاں ہو گئی ہے۔ اور وہ ایکا ایکی مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔

ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میرے قہقہے اور ہنسی جانے کہاں ڈوب گئی تھی۔۔۔۔ میرا دل اندر ہی اندر گھبرا رہا تھا۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد مسعود اٹھا۔ میری طرف گہری گہری متنفر نگاہوں سے دیکھا اور سنجیدگی سے بولا "تمہاری باتیں سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ اپنے مفاد کے لیے کسی کے اعتماد کو دھوکہ دینا۔۔۔۔؟ اس سے ذلیل کام شاید دنیا میں اور کوئی ہو گا ہی نہیں۔۔۔۔"

وہ بغیر مصافحہ کئے ہوئے مڑا۔۔۔۔ اور آفس سے نکل گیا۔

مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرے منہ پر جوتا کھینچ مارا ہو۔۔۔۔ سر عام تھوک دیا ہو۔۔۔۔

میں نے کہنیاں میز پر ٹکا کر ہاتھوں کے پیالے میں اپنا سر رکھ دیا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی اس شاندار کرسی سمیت دلدل میں دھنسا جا رہا ہوں۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ سب کچھ میں نے مسعود میر سے کیوں کہہ دیا۔

کیوں اپنے آپ کو اس پر عیاں کیا۔

کیوں اپنی ساری خباثت اسکے سامنے بکھیر دی۔

کیوں اپنے آپ کو اس کے سامنے عریاں کر دیا۔

پھر

پھر

مجھے یوں لگا جیسے میں نے یہ سب کچھ مسعود میر کے سامنے ہی نہیں کہا۔۔۔۔ ساجدہ کے سامنے بھی کہہ دیا ہے۔۔۔۔

گھبرا کر میں نے سر اٹھایا۔۔۔۔

یقیناً۔۔۔۔ یقیناً اس وقت ساجدہ ہی ریٹائرنگ روم میں تھی۔ اس نے میری باتیں سن لی ہوں گی۔

سن لی ہوں گی۔

سن لی ہوں گی۔۔۔۔

میرے دل و دماغ پر تازیانے سے برسنے لگے۔۔۔۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔

میں نے ساڑھے تین بجے کے قریب فیصل آباد روانہ ہونا تھا۔ تین بج چکے تھے۔۔۔۔ میں نے گھڑی دیکھی۔۔۔۔

میں نے ساجدہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فیصل آباد گھنٹہ بھر بعد بھی جا سکتا تھا۔۔۔۔ میں ساجدہ کے ہاں جا کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں اس نے واقعی میری باتیں تو نہیں سن لیں۔۔۔۔

میں اٹھا۔۔۔۔

لیکن

چکر سا آ گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا پھیل گیا۔ کئی لمحے مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں کہاں ہوں۔

میں گرنے کے انداز میں کرسی میں بیٹھ گیا۔

کئی لمحے میری حالت غیر رہی۔

پھر میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی۔۔۔۔ یقین دلایا۔ کہ ساجدہ نے میری باتیں نہیں سنیں۔۔۔۔

میں قدرے سنبھلا۔۔۔۔ اور سوچا کہ فون کر کے ساجدہ کا پتہ کروں۔ نمبر ڈائیل کرنے ہی لگا تھا کہ دوسرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔۔۔۔

"یس سراج سپیکنگ" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے مجو کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "بھائی جان ---- بھائی جان۔"

"کیوں مجو ---- "کیا ہے۔"

"جلدی گھر آیئے۔"

"کیوں" اب میں گھبرا گیا۔

مجو کے منہ سے ٹھیک طرح بات نہ نکل رہی تھی ---- ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولا ----" وہ ---- وہ ---- قمو باجی ---- سخت بیمار ہیں۔ امی کہتی ہیں جلدی گاڑی لایئے ---- ان کو ہسپتال داخل کروانا ہے ---- ایک منٹ ---- بھی دیر نہ کریں بھائی جان ---- جلدی آئیں ---- ان کے سخت ---- بلیڈنگ ----"

"میں آیا" "گھبرا کر میں نے فون پٹخ دیا ---- بریف کیس اٹھایا۔ اور تیزی سے آفس سے باہر نکل گیا۔

رحمت دین نے مجھے سلام کیا۔ اسد اور کلیم بھی کھڑے تھے۔ دونوں نے آگے بڑھ کر آداب کہا۔

میں سراسیمہ سا تیزی سے ہال عبور کر کے باہر چلا گیا ----

قمو کل سے آئی ہوئی تھی ---- وہ اپنے گھر کی سیڑھیوں سے پھسل گئی تھی۔ شاید چھٹے مہینے میں تھی ---- کمر میں درد تھا۔ صبح جب میں آفس آیا تو اس کی رنگت پھیکی پڑی ہوئی تھی ---- شاید تکلیف میں تھی۔

میں گاڑی میں بیٹھا ----

اور تیزی سے گاڑی چلاتا گھر کی جانب چل دیا ---- ساجدہ کے گھر جانے یا فون کرنے کا خیال ذہن سے نکل گیا تھا۔

○ ☆ ○

"ہائے میری بچی" امی نے سینے پر دو ہتڑ مارا ----

"امی خدا کے لیے۔ صبر سے کام لیں" میں نے امی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ---- پھپھو فہمیدہ اور قمو کی ساس دونوں نے امی کو تھام لیا۔

امی صبر و ضبط کیسے کرتیں۔ ماں تھیں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ قمو آپریشن تھیٹر میں تھی تین ڈاکٹرز اس پر جھکے تھے۔ مشہور گائنا کالوجسٹ بھی وہیں تھے ----

ہم سب آپریشن تھیٹر کے بیرونی برآمدے میں جمع تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چلی تھی۔ اور ٹھنڈے برآمدے میں بغیر کسی بھاری کپڑے کمبل یا چادر کے ہم سب ستونوں کی طرح گڑے کھڑے تھے۔

قمو کے میاں ساس اور دو نندیں بھی تھیں۔ امی میں پھپھو فہمیدہ شاہد اور مجو تھے۔ جعفر ماموں اور چھوٹی خالہ بھی تھیں۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کے بار بار منع کرنے کے باوجود یہ سب لوگ برآمدے میں آرہے تھے۔ کافی دیر سب باہر چمن میں بیٹھے رہے تھے۔ لیکن جوں جوں رات ڈھل رہی تھی۔ سردی کا زور بڑھ رہا تھا ---- یہ سب لوگ برآمدے میں آگئے تھے۔

ساڑھے چار بجے کے قریب میں قمو کو گاڑی میں ڈال کر یہاں لایا تھا۔ اس کی حالت مخدوش تھی۔ بلیڈنگ بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ ہوسپٹل میں بڑی دوڑ دھوپ سے اسے داخل کیا گیا تھا ----

اب وہ آپریشن تھیٹر میں تھی۔ کئی گھنٹے ڈاکٹروں نے جدوجہد کی تھی کہ بلیڈنگ بند ہو جائے ---- اور بچہ ضائع نہ ہو ----

لیکن

اب وہ آپریشن پر مجبور ہو گئے تھے۔ بچہ ضائع کرنا ضروری تھا۔ ورنہ قمو کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی ----

امید تو اب بھی کم ہی تھی ---- نرسوں کی دوڑ دھوپ اور ڈاکٹروں کی تگ و دو سے تو ظاہر ہو رہا تھا۔ معاملہ بے حد سیریس ہے۔ ایسی صورت میں امی کی تڑپ نافہم نہ تھی۔ ان سے

برداشت نہیں ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ سب حوصلہ دلاتے تھے۔۔۔۔ لیکن جب کلیجے میں درد کی انی چبھتی تو وہ بلبلا اٹھتیں۔

میں جب سے قمو کو ہوسپٹل لے کر آیا تھا۔۔۔۔ برابر بھاگ دوڑ کر رہا تھا گاڑی پاس تھی۔ اس لیے پھیرے پہ پھیرے لگا رہا تھا۔ کبھی بازار دوڑ رہا تھا۔ کبھی گھر۔۔۔۔ کبھی کسی کو لینے جا رہا تھا۔ کبھی کسی کو۔۔۔۔ میری اپنی حالت بے حد خراب ہو رہی تھی۔۔۔۔ شام سے کسی نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ اور میں نے تو ایک چائے کی پیالی تک حلق میں نہیں اتاری تھی۔۔۔۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔۔۔۔ اور دل سینے میں کسی انجانے خوف اور دہشت سے بیٹھا جا رہا تھا۔۔۔۔

ان کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ بار بار دوپٹہ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھتیں۔۔۔۔ رو رو کر دعائیں مانگتیں اور جب برداشت نہ ہو پاتا تو سینے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے میری بچی۔۔۔۔ میری بچی چلانے لگتیں۔

ہوسپٹل میں اس طرح واویلا کرنا موزوں نہیں تھا۔۔۔۔ میں امی کو بار بار سمجھاتا۔۔۔۔

"راج بیٹے" پھپھو فہمیدہ نے امی کو زیادہ ہی بے کل دیکھا تو مجھ سے کہا "انہیں گھر لے جاؤ۔۔۔۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔"

قمو کی ساس نے بھی کہا "ہم یہاں ہیں۔ بہتر ہے آپ گھر چلی جائیں۔"

امی نے سختی سے سر نفی میں ہلایا۔۔۔۔

امی سب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ یہاں بیٹھ کر کیا کریں گی۔ چلیں میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔۔۔۔"

امی نے دوپٹہ دانتوں میں دبا لیا۔۔۔۔ شاید سینے میں مچلنے والی چیخ کو روکا۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولیں "تو اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ایک طرف بیٹھی رہوں گی۔۔۔۔ آواز تک نہیں نکالوں گی۔۔۔۔"

امی دیوار سے ٹیک لگا کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئیں۔۔۔۔ انہوں نے دوپٹہ دانتوں تلے دبا لیا تھا۔۔۔۔ اور بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔

میرا دل انہیں دیکھ دیکھ کر کٹنے لگا۔ لیکن میں بھی کیا کر سکتا تھا۔ سب عورتیں امی کے گرد بیٹھ گئیں۔ سردی کی کسی کو پروا تھی نہ ننگے فرش کی۔۔۔۔ اتنی افراتفری پڑی ہوئی تھی۔ کہ گھر سے دری یا قالین کا ٹکڑا لانے کی بھی فرصت و ہوش نہ رہی تھی۔

رات تھم تھم کر رک رک کر گزر رہی تھی۔۔۔۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے گزر ہی نہیں

رہی۔۔۔۔ منجمد کر دینے والا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔ قمقموں کی روشنی بھی اس اندھیرے کو نہیں چاٹ رہی تھی۔

میں، جعفر ماموں اور قمو کا میاں عمیر کبھی اکٹھے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی سنگین ستونوں کا سہارا لے کر الگ الگ ہو جاتے۔ سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ ذہن متفکر تھے۔ اور کسی آنے والے خوفناک لمحے کے قدموں کی چاپ سن کر متوحش تھے۔

مجھے بار بار ہسپتال کی وہ راتیں یاد آ رہی تھیں۔ جو اباجی کی آخری راتیں تھیں۔ اباجی اسی ہسپتال میں فوت ہوئے تھے۔ اور میرا دل ہول کھا رہا تھا۔۔۔۔ یوں لگ رہا تھا صبح ہم یہاں سے قمو کی میت ہی لے کر جائیں گے۔۔۔۔

زندگی میں شاید پہلی بار میں نے صبح کاذب دیکھی۔ آسمان کا ایک گوشہ سرخی مائل نیلا ہوا۔۔۔۔ اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ اس ملگجے اندھیرے نے صبح صادق کو جنم دیا۔۔۔۔

رات آنکھوں میں بیت گئی۔۔۔۔ سب کے چہرے تھکن اور غم سے مرجھائے ہوئے تھے۔۔۔۔ امی تو جیسے زندہ لاش تھیں۔ اور اب تو ان کو تسلی دینے کے لیے ہمارے پاس الفاظ بھی نہیں تھے۔

ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ کہ آپریشن تھیٹر سے ڈاکٹر قاسم علی باہر آئے۔۔۔۔ ان کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ ہم سب ان کی طرف لپکے۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔۔۔۔ اور بوجھل لہجے میں بولے "بچہ ضائع ہو گیا ہے۔ ماں کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں۔۔۔۔ دعا کیجیے۔"

وہ چلے گئے۔ پھر ایک معمر نرس باہر آئی۔۔۔۔

اس نے قدرے تسلی دی۔۔۔۔ "لڑکی کو ہوش آ جائے۔ اس کے بعد سخت احتیاط کی ضرورت ہو گی۔ خون بہت ضائع ہو گیا ہے۔"

"خون دینا ہے" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"دیا گیا ہے۔۔۔۔ اور ابھی دینے کی ضرورت ہو گی۔۔۔۔ دو گھنٹے تک ہوش میں آنے کی توقع ہے۔۔۔۔"

دو گھنٹے اور

ہم سب جیسے سولی پر ٹنگے تھے۔ دل ڈول رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے۔

کوئی تین گھنٹے بعد ڈاکٹر امداد حسین اور ڈاکٹر فوزیہ رحیم نے قمو کے ہوش میں آنے کی خبر دی۔۔۔۔ اب دونوں اس کی زندگی سے پر امید تھے۔

امی تو وہیں فرش پر سجدے میں گر گئیں ---- باقی سب نے بھی خدا کا شکر ادا کیا ----

قمو کو آپریشن تھیٹر سے الگ کمرے میں منتقل کیا گیا ---- سب کو باہر ہی سے اسے ایک نظر دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے میاں کو چند لمحوں کے لیے کمرے میں جانے دیا گیا۔ میں بھی لمحہ بھر کو اس کے بیڈ کے قریب گیا ---- امی کو ہم نے ادھر جانے ہی نہ دیا ---- کہ ان کا دل تھوڑا تھا ---- رونے دھونے کی صورت میں قمو کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔

میں کمرے سے باہر آیا۔ تو ڈاکٹر امداد اور سسٹر اندر جا رہے تھے مجھے دیکھا تو رک گئے۔

"آپ لوگوں نے انہیں دیکھ لیا" وہ بولے۔

"جی" میں نے کہا۔

"بہتر ہو گا کہ آپ سب لوگ گھر چلے جائیں۔ صرف ایک آدمی ان کے پاس ٹھہرے۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

"زیادہ لوگوں سے گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ اور پیشنٹ کے لیے نقصان دہ بھی ہے ---- مریضہ کو بے حد آرام کی ضرورت ہے ---- ان سے باتیں بھی نہ کی جائیں ---- علاج کے ساتھ مکمل ریسٹ کی ضرورت ہے۔"

"بہت اچھا۔"

"شکریہ۔"

ڈاکٹر اندر چلا گیا ---- میں نے آکر سب کو گھر چلنے کے لیے کہا۔

"قمو کے پاس کون رہے گا" پھپھو بولیں۔

"صرف ایک آدمی ٹھہرے گا۔"

"عمیر۔"

"فی الحال وہ رہیں گے ---- اس کے بعد ڈیوٹی بدل بدل کر ہم سب ----"

"یہ اچھا رہے گا۔"

سب واپس گھر چلنے کو تیار ہو گئے۔ ایک امی تھیں۔ جو وہیں رہنے پر بضد تھیں۔

"تم سب جاؤ۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"امی چل کر تھوڑی دیر آرام کریں۔ میں پھر آپ کو لے آؤں گا۔"

"نہیں ---- میں یہیں آرام کر لوں گی۔"

"کیسے آرام کر لیں گی ---- گھر چلئے ---- نہا دھو کر کپڑے بدل لیجئے پھر کچھ کھا پی بھی لیں ----"

ہم سب نے بہتیرا سمجھایا ---- لیکن امی واپس جانے پر رضامند نہ ہوئیں۔

"میرے لیے کپڑے یہیں لے آؤ ----" امی نے کہا۔

"ناشتہ۔"

"عمیر کے لیے تو لاؤ گے نا ----"

"اچھا امی ---- جیسے آپ کی مرضی۔ لیکن ایک بات دھیان میں رکھیں ----"

وہ میری طرف دیکھنے لگیں۔

"رونا دھونا بالکل نہیں ---- نہ ہی قمو کے پاس جانا ہے ----"

"اچھا ---- اچھا۔"

"خدا خیر کرے گا" پھپھو فہمیدہ نے کہا۔

"انشاء اللہ" قمو کی ساس بولیں۔

ابھی ہم کھڑے باتیں ہی کر رہے تھے۔ کہ پھپھو جمیلہ اور رحیلہ آگئیں ---- وہ ہراساں سی تھیں۔ آتے ہی گلہ شروع کر دیا "ہمیں بتایا ہی نہیں ---- بچی کی جان پر بنی تھی اور ہم آرام سے بیٹھے تھے ----"

کچھ اور عزیز بھی آپہنچے ---- ان سب کو سمجھانا بڑا مشکل کام تھا۔ میں پھپھو فہمیدہ اور ناجو کو لے کر گھر آ گیا ---- ماموں اور خالہ سکوٹر پر چلے گئے ---- مجھے ضرورت کی کئی چیزیں ہوسپٹل پہنچانا تھیں۔

دوپہر تک میں ہسپتال بازار اور گھر کے چکر لگاتا رہا ---- بستر کپڑے اور چند برتن امی کو ہسپتال پہنچائے۔ قمو کے لیے دوائیاں خریدیں' پھل لیا ----

ساری چیزیں دے کر میں گھر واپس آگیا۔ شام کو رانی کو لینے جانا تھا۔ امی نے تاکید کی تھی۔ کہ اسے جا کر لے آؤں ----

میں نے شیو بھی نہیں کی اور نہایا بھی نہیں ---- زوبی کو کھانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

ناجو ادھر ہی تھا ---- میں نے اس سے کہا "میں تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں ---- بہت ضروری ہوا ---- تو جگا دینا ---- ورنہ سونے دینا۔"

"اچھا بھائی جان ----"

"ابو آئے تو کہنا میرے جاگنے تک ہوسپٹل ہی میں رہے۔ ویسے جعفر ماموں بھی وہاں آجائیں گے ---- ہاں سن لیا نا ---- اشد ضرورت ہوئی تو مجھے جگا دینا ----"

"اچھا بھائی جان ---- اچھا ----"

میں کمرے میں آیا ---- پہلے سوچا شیو کر کے نہا دھو لوں۔ لیکن رات بھر کی پریشانی اور

تکان نے چکنا چور کر دیا تھا ---- میں بیڈ پر لیٹ گیا ----

جانے کیوں اب بھی دل بیٹھا جا رہا تھا۔ عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا ---- میں ٹوٹ رہا ہوں ---- کسی انتہائی عزیز ہستی سے بچھڑ رہا ہوں۔

میں سونا چاہ رہا تھا ----

لیکن ----

نیند نہ آ رہی تھی۔

زوبی کھانے کی ٹرے اوپر ہی لے آئی ---- میری تاکید پر تاجے نے اسے ڈانٹا ---- لیکن وہ کھانا اندر لے ہی آئی ----

میں نے چند لقمے زہر مار کیے ---- بھوک بالکل ہی مٹ گئی تھی۔ حالانکہ میں نے بالکل معمولی سا ناشتہ کیا تھا ----

بے کلی اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ زوبی کھانے کے برتن لے گئی۔ تو میں نے دراز سے ویلیم نکالی اور دو گولیاں کھا کر بیڈ میں پڑ گیا ----

قمو کی طرف سے تو اب اطمینان تھا ----

پھر

یہ بے چینی اور بے کلی کیوں تھی ----

میں سمجھ نہ پایا

اور

سمجھنے کی کوشش ہی میں خواب آور گولیوں کا اثر تھا ---- اور میں سو گیا ---- شام تک پڑا بے خبر سوتا رہا۔

○ ☆ ○

ملازمہ نے ناشتہ میز پر لگا دیا تھا۔ رانی گڈو تاجا اور زوبی میرے انتظار میں ٹیبل پر بیٹھے تھے ----

رانی کی ننھی منی پیاری پگلی زوبی کی گود میں تھی ---- خاصی موٹی تازی اور بے حد پیاری تھی ----

میں پہنچ گیا ---- ہلکا نیلا ٹراپیکل سوٹ پہنا ہوا تھا۔ یہ سوٹ مجھے شکیل نے بھیجا تھا۔ کبھی کبھی وہ میری یاد اسے آتی تو آنے جانے والوں کے ہاتھ تحفتاً کوئی نہ کوئی شے بھیج دیا کرتا ----

دالا میں بھی ایسا ہی کرتا ---- اس کے غیر ملکی دوستوں کے لیے یہاں کی علاقائی چیزیں اکٹھی کرتا رہتا ---- سوٹ جسم پر بالکل فٹ بیٹھا تھا ----

شاید یہ سوٹ مجھ پر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا ---- ناشتے کی میز پر آیا ---- تو رانی نے میری بلائیں لے لیں ----

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ" اس نے پیار سے مجھے دیکھا۔

میں صرف مسکرایا ---- جانے کیوں اب بھی دل پژمردہ تھا۔ اندر ہی اندر کچھ بکھر رہا تھا ---- بے حد ڈیپریشن تھی ----

حالانکہ ہونا نہیں چاہیے تھی ---- قمو کو ایڈمٹ ہوئے آج چوتھا دن تھا۔ اور اب وہ بالکل ٹھیک تھی ---- اس کے بچ جانے کا معجزہ خوش کن تھا ----

رانی نے ناشتے کی چیزیں میرے آگے کر دیں۔ میں نے اس کی بچی کو پیار کیا۔

"ہوسپٹل جا رہے ہو۔"

"آج دفتر جانا ہے" پہلے ہوسپٹل جاؤں گا۔ پھر وہیں سے فیکٹری۔"

"دفتر گئے تین دن ہو گئے۔"

"ہاں ---- ویسے کوئی بات نہیں ---- دفتر سے تو میں نے تین دن غیر حاضر ہی رہنا تھا۔"

"کیوں۔"

"آج شام قمو بیمار ہو گئی ہے۔ مجھے فیصل آباد' منڈی بہاؤ الدین' سرگودھا اور پھر کراچی اور جہلم جانا تھا۔"

"ہائے اللہ ---- بہت ضروری دورہ تھا۔"

"تھا تو ضروری ---- لیکن قمو کی بیماری ----"

"اللہ تمہیں زندگی دے راجو ---- تم نے تو واقعی ابا جی کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں----"

میں پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولا "بڑی کٹھن ذمہ داریاں ہیں۔"

"واقعی۔"

"قمو نے تو ادھ موا کر دیا----"

"شکر ہے خدا نے زندگی دے دی۔"

"دوبارہ زندگی ملی ہے اسے۔"

"بے چاری کا بچہ راہی ملک عدم ہو گیا۔ دنیا میں آنے سے پہلے۔"

"افسوس تو بہت ہے ----"

"دیکھو نا اپنی اس گُڑیا کو ---- کتنی پیاری ہے۔"

میں نے زوبی کی گود سے بچی کو لے لیا ---- رانی باغ باغ ہو گئی۔

"لائیے اسے مجھے دے دیں بھائی جان" ناجا بولا "آپ ناشتہ کر لیں۔"

میں نے بچی اسے دیتے ہوئے کہا "یار جی بالکل نہیں کر رہا ناشتہ کرنے کو۔"

"آپ نے رات بھی کھانا نہیں کھایا بھائی جان" مجو بولا۔

"ہاں" زوبی نے کہا۔

"کیوں راجے" رانی پیار سے بولی "اب تو قمو ٹھیک ہے۔ زیادہ فکر نہ کرو۔"

"پتہ نہیں کیوں ---- طبیعت اکھڑی اکھڑی ہے۔ میں اندر سے خوفزدہ سا رہنے لگا ہوں۔"

رانی مسکرائی بڑے پیار سے میرے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے بولی "قمو کو موت و حیات کے درمیان دیکھا ہے نا ---- اس لیے ----"

"شاید ---- وہی خوف میرے اندر ہے ابھی تک۔"

"تو کھاؤ ----" اس نے ٹوسٹ میری پلیٹ میں رکھ کر فرائی انڈہ بھی پلیٹ میں ڈال دیا ---- اور میرے لیے چائے بنانے لگی۔

مجو ناجا اور زوبی بھی ناشتہ کرنے لگے۔

میں نے دانتوں سے ٹوسٹ کا ٹکڑا کاٹا ---- لیکن چھوٹا سا ٹکڑا بھی نگل نہ سکا ---- مجھے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کھانے کی نالی سکڑ کر بند ہو گئی ہے۔

چائے کے گھونٹ سے میں نے بمشکل وہ ٹکڑا نگلا ---- باقی ٹوسٹ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"راجے ---- کھاؤ نا" رانی ممتا بھرے پیار سے بولی۔

"رانی بالکل جی نہیں چاہ رہا----"

"رات سے بھوکے ہو۔"

"کہا ہے نا طبیعت اکھڑی اکھڑی سی ہے۔"

رانی نے متفکر نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں میز سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چائے بھی نہیں پی بھائی جان" زوبی فکر مند نظر آئی۔

"بس ----" میں نے گھبراہٹ محسوس کی ---- "دفتر میں پی لوں گا۔ ہاں امی اور قمو کا ناشتہ تیار ہے۔"

"گاڑی میں رکھ دیا ہے" ناجا بولا ----

"کریمے کو گاڑی صاف کرنے کا کہا تھا۔"

"جی کر دی ہے اس نے۔"

آج کل گھر میں ملازمہ کے ساتھ ایک لڑکا بھی ملازم رکھ لیا تھا۔ میرے جوتے وغیرہ وہی صاف کرتا تھا۔ اور گاڑی کی صفائی بھی اب ناجے اور مجو کی بجائے اس کے ذمہ تھی ---- سودا سلف بھی لاتا تھا ---- امی یا ناجے مجو کو ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر سبزی گوشت لانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی ----

کریما آگیا تھا ---- اس کو بریف کیس دیا ----

"کچھ کہنا تو نہیں امی سے" میں نے رانی سے پوچھا

"نہیں ---- میں ایک گھنٹے تک ہوسپٹل جاؤں گی ---- پھر انہیں گھر بھیج دوں گی۔"

"امی تو قمو کے پاس سے ہل نہیں سکتیں۔"

"ماں ہیں نا ---- بچوں کے لیے جان کی پرواہ بھی نہیں ----"

"زیادتی ہے۔"

رانی ہنس کر بولی "تم بھائی ہو کر اتنے فکر مند ہو۔ وہ تو ماں ہیں راجو ----"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں بھی یہ گُڑیا اتنی ہی پیاری ہے۔"

"ہائے" رانی نے بچی کو ناجے سے لے کر اپنے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا کر کہا "اتنی اتنی پیاری ہے۔ [illegible] ----"

میں [illegible] یہ مسکراہٹ مجھے پھیکی اور بے مزہ لگ رہی تھی ----

میں ناشتے [illegible] سے صحن میں آیا۔ رانی بچی کو اٹھائے میرے ساتھ ہی باہر نکل [illegible] میں

باہر جانے ہی لگا تھا۔ کہ زیبی آ گئی ----

صحن میں اس کے آتے ہی یوں لگا جیسے صبح کچھ زیادہ ہی چمکدار اور نورانی ہو گئی ہے ---- وہ ان دنوں بے حد نکھری نکھری لگتی تھی ----

رات بھی وہ آئی تھی۔ تو اس کا نکھار میں نے محسوس کیا تھا ---- رات وہ میری پریشانیاں بٹانے آئی تھی ---- بڑی دیر میرے پاس بیٹھی رہی تھی۔ اور مجھے تسلیاں دیتی رہی تھی ----

اب بھی شاید وہ مجھے ہی دیکھنے آئی تھی۔ میری وجہ سے وہ متفکر تھی۔ میں نے اپنی انجانی سی پریشانیوں اور مایوسیوں کا اس سے بھی ذکر کیا تھا ----

رانی نے اسے پیار کر لیا ---- میرا جی چاہا میں بھی اسے بازوؤں میں بھر لوں ---- رانی اور زیبی باتیں کرنے لگیں۔

زیبی نے رانی سے پنکی کو لے لیا ---- اور اس کے سیب ایسے سرخ رخساروں پر پیار کرتے ہوئے بولی "رانی باجی آج آپ ہوسپٹل جائیں گی۔"

"ہاں۔"

"پنکی کو میں رکھوں گی۔"

"ضرور ----"

اس نے پنکی کو پھر پیار کر لیا ---- رانی جو کے بلانے پر کمرے میں چلی گئی۔

"بڑی خوش نصیب ہے پنکی" میں نے شوخ ہونے کی کوشش کی۔

"کیوں" زیبی نے میری طرف دیکھا۔

"اس طرح ٹوٹ کر اسے پیار جو کر رہی ہو۔"

"یہ ہے ہی اتنی پیاری۔"

"ہم پیارے نہیں۔"

زیبی کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گئی لیکن اس نے ایک پیار بھری نگاہ مجھ پر ڈالی ---- یہ نگاہ کہہ رہی تھی "ہو ---- بہت زیادہ ہو ----"

میں اس نگاہ سے حقیقی لطف نہ اٹھا سکا ---- یوں جیسے میرے اندر اس کی گنجائش نہ تھی ---- میں اپنی اس کور ذوقی پر جھنجھلا سا گیا۔

زیبی چند لمحوں بعد بولی "بہت تیز ہو رہے ہو۔ لگتا ہے طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے۔"

"نہیں زیبی" میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا "طبیعت ٹھیک نہیں اور بالکل ٹھیک نہیں۔"

زیبی کے چہرے پر پریشانی کے سائے لہرا گئے ---- "کیوں۔"

"پتہ نہیں کیوں۔"

"امی ڈاکٹر کو دکھاؤ نا۔"

"میرا خیال بھی یہی ہے۔ آج دفتر سے آ کر کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔"

"دفتر جا رہے ہو۔"

"ہوسپٹل جاؤں گا ---- پھر دفتر ----"

"قمو کا تم نے بہت ہی اثر لیا ہے۔"

"قمو تو اب ٹھیک ہے۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔"

زیبی میری بات سے اور بھی گھبرا گئی۔ جلدی سے بولی "دفتر نہ جاؤ نا۔"

"جانا ضروری ہے ---- طبیعت خراب رہی تو جلدی واپس آ جاؤں گا ----"

زیبی پریشان نگاہوں سے مجھے تکتے ہوئے بولی "مجھے ساری رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔"

"کیوں۔"

"تمہاری فکر لگی رہی۔"

میں پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولا ---- "کہ مجھے فکر کرنے سے کیا فائدہ۔"

"تو اور کیا کرتی۔"

"چلی آتیں میرے پاس۔"

"بس چلی ہی آئے گی ---- تھوڑے دنوں کی بات ہے ---- " رانی ہنستے ہوئے ہمارے قریب آ گئی ---- اس نے شاید میری بات سن لی تھی ---- زیبی شرما گئی ----

ہم تھوڑی دیر ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ زیبی پنکی کو اچھال کر چٹاتی اور پیار کرتی رہی ----

پھر

میں دونوں کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلا آیا۔

میں اب ہوسپٹل جا رہا تھا ---- یوں لگ رہا تھا اپنے آپ سے ہی چھوٹ رہا ہوں۔ مخالف سمت جا رہا ہوں ----

امی کو ناشتہ دیا۔ قمو کی احوال پرسی کی۔ اس کے میاں سے دو چار منٹ باتیں کیں۔ طبیعت بدستور الجھی الجھی اور پریشان تھی ---- ماں کی نگاہیں شاید کریدتی ہیں۔

امی نے مجھ سے پوچھا "طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔"

میں نے حیرانی اور پھر عقیدت سے امی کو دیکھا۔ جھوٹ بولا۔

"بالکل بالکل امی..."

امی نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا "تمہارا چہرہ اداس ہے۔ رنگ پھیکا پڑا ہوا ہے..... تمہاری آنکھوں سے پریشانی ٹپک رہی ہے۔"

میں کھوکھلی سی ہنسی ہنستے ہوئے قمو کی طرف دیکھ کر بولا "آپ کی اس لاڈلی کا کیا دھرا ہے یہ سب کچھ۔"

امی خوش ہو گئیں ---- مجھے پیار کیا اور دعائیں دیتے ہوئے بوجھل آواز میں بولیں "خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے میرے بچے ---- اب فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ کل ہم قمو کو گھر لے جا سکیں گے۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے"

"کل کس وقت۔"

"کل شام" وسیم بولا "ڈاکٹر امداد نے کہا ہے۔ کہ کل شام انہیں ڈسچارج کر دیں گے۔"

"شکر ہے خدا کا....."

میں کلیم سے باتیں کرتا باہر آگیا۔ امی بھی میرے پیچھے آئیں۔

"کہاں جا رہے ہو" انہوں نے پوچھا۔

"فیکٹری امی ----"

"اچھا ---- میں سمجھی بازار جا رہے ہو۔"

"کچھ منگوانا ہے۔"

"نہیں ---- عمیر کے پاس سکوٹر ہے۔ ضرورت پڑی کسی چیز کی تو لے آئے گا۔"

"بالکل ---- میں یہیں ہوں ....."

میں نے دونوں کو پھر خدا حافظ کہا۔

اور ہوسپٹل کے کمپاؤنڈ کو عبور کرتا گاڑی کی طرف آگیا۔

اب میں فیکٹری جا رہا تھا۔ اور فیکٹری کے حوالے سے مجھے ساجدہ کا خیال آ رہا تھا.....

تین دن تو اس طرح مصروفیت اور تذبذب میں گذرے تھے۔ کہ میں ساجدہ کو یا فیکٹری فون تک نہ کر سکا تھا ---- فیکٹری کی طرف سے تو فکر مند نہ تھا۔ کہ پہلے سے تین دن کی چھٹی پر تھا۔ اور کام کاج متعلقہ لوگوں کو سمجھا آیا تھا۔

ہاں ساجدہ ... نہ ... ملنے کا مجھے اب ملال ہو رہا تھا....

لیکن

میں کیا کرتا ---- افتاد ہی ایسی آن پڑی تھی ---- کل رات میں نے ارادہ بھی کیا تھا ساجدہ کے ہاں جانے کا ---- لیکن زیبی آ گئی تھی....

اور

زیبی کی قربت میں ---- اس سے باتیں کرتے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا تھا....

اب گاڑی چلاتے چلاتے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ اپنے من کو ٹٹول رہا تھا۔ اپنی پریشانی اور مایوسی کا سراغ لگا رہا تھا ---- اپنی ڈیپریشن کا سرا ڈھونڈ رہا تھا...

مجھے اچانک ہی احساس ہوا۔ حقیقت منکشف ہوئی۔ اور میں سوچنے لگا۔ شاید یہ سب کچھ اسی لیے ہو رہا ہے کہ تین دنوں سے میں نے ساجدہ کی خبر تک نہیں لی ---- اور ... ہاں نہیں گیا ....

اور

اسے فون تک نہیں کیا۔

میں نے فیکٹری جاتے ہی فون کرنے اور پھر اس کے ہاں جانے کا ارادہ کر لیا....

اور

مجھے واقعی

یوں لگا جیسے میرے سینے پر اسی بات کا بار تھا۔ ذہن پر یہی بوجھ تھا ---- ضمیر پر یہی دباؤ تھا....

میں نے قدرے سکون سا محسوس کیا....

○ ☆ ○

فیکٹری میں داخل ہوئی۔ تو حسب معمول چوکیدار نے کرسی سے کھڑے ہو کر مجھے سیلوٹ نہیں کیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پہ نہیں تھا۔۔۔۔ فیکٹری کے کمپاؤنڈ میں مزدور اور دوسرے لوگ ٹولیوں کی صورت بنے کھڑے نظر آئے۔

میرا دل ایک دم دھڑکا۔۔۔۔ فیکٹری میں کوئی خلاف توقع بات ہو گئی تھی۔ کئی اندیشے میرے ذہن میں رینگ گئے۔ اور مجھے فیکٹری سے تین دن لاتعلق رہنے کا افسوس نما پچھتاوا ہوا۔

میں گاڑی پارکنگ لاٹ کی طرف لا رہا تھا۔ کہ اسد اور کلیم کی نظر مجھ پر پڑی۔ رحمت دین بھی مجھے دیکھتے ہوئے گاڑی کی طرف لپکا۔

"سر" اس نے دور ہی سے آواز دی۔

میں نے گاڑی وہیں روک لی۔۔۔۔

سب گاڑی کی طرف تیز قدموں سے لپکے۔۔۔۔

میں نے فیکٹری میں ہونے والے کسی ناخوشگوار واقعے کا اندازہ کرتے ہوئے سب کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ کچھ سمجھ نہ پایا۔ ان کے چہرے اداس و پریشان تھے۔

"سر" میں گاڑی سے نکلا تو رحمت دین نے پھر کہا۔

سب میرے گرد آ کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے سلام کیا' کسی نے "سر" کہا۔ کسی نے یہی کہا "آپ آگئے سر۔۔۔۔"

"کیا بات ہے۔ تم لوگ کام کیوں نہیں کر رہے" میں نے سب پر پھر نگاہ ڈالی۔

"سر۔۔۔۔" اسد میرے قریب آیا۔ "آپ کب دورے سے واپس آئے۔"

"آج ہی آئے ہوں گے" کلیم بولا۔

"میں دورے پہ گیا ہی نہیں تھا۔"

"کیا" کئی متعجب آوازیں آئیں۔ "آپ یہیں تھے۔ گھر پہ۔۔۔۔"

"ہاں۔"

"او خداوندا" رحمت دین نے سر پہ ہاتھ مارا۔۔۔۔

"ہم نے آپ کو کنٹیکٹ کرنے کی کہاں کہاں کوشش نہیں کی سر۔۔۔۔ فیصل آباد' سرگودھا' کراچی' سکھر۔۔۔۔"

"بات کیا ہے" میں ان کی باتوں سے الجھ کر بولا۔۔۔۔

"مس ڈوگر سر۔۔۔۔" کلیم نے صرف اسی قدر کہا۔

میں بے طرح گھبرا کر بولا "کیا ہوا مس ڈوگر کو۔"

"ہارٹ اٹیک۔۔۔۔" اسد نے کہا "دو دن تو گھر پہ رہیں۔ کل انہیں ہوسپٹل ایڈمٹ کروایا ہے۔"

میں بید مجنوں کی طرح کانپ گیا۔۔۔۔ گاڑی کے کھلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔ میرا رنگ یقیناً فق ہو گیا تھا۔۔۔۔ غالباً ہونٹ بھی سپید پڑ گئے تھے۔۔۔۔

"سر۔۔۔۔ ہمیں کیا پتہ تھا آپ یہیں ہیں۔۔۔۔" اسد بولا۔۔۔۔ "ہم آپ کو اطلاع دے دیتے۔۔"

"اسد صاحب" کلیم نے کہا "سر پریشان ہو گئے ہیں۔۔"

"بیٹھ جائیے سر" فیروز نے کہا۔

"بات پریشانی ہی کی تھی" نصیر نے کہا۔ "رات انہیں دوسرا اٹیک ہوا۔ ان کی حالت اچھی نہیں۔"

میں بالکل بت بن گیا۔ میرے منہ سے بات نہ نکل سکی۔

اسد نے کندھے سے پکڑ کر مجھے سیٹ پر بٹھا دیا۔۔۔۔ میں گھبراہٹ میں پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ کب سے۔۔۔۔" میں پورا جملہ نہ کہہ پایا۔

"سر جس دن آپ گئے ہیں نا۔ اسی شام انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔۔۔۔"

مجھے یوں لگا جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے قاصر ہو گیا ہوں۔۔۔

مجھے اس دن مسعود میرے کی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ یقیناً اس دن ساجدہ ہی ریٹائرنگ روم میں تھی۔ اس نے میری باتیں سن لیں۔۔۔

میں

چلا آیا۔۔۔ مجھ سے [illegible]

سیٹ پر [illegible]

"پانی لاؤ۔۔۔ پانی لاؤ" کی آوازیں آئیں۔۔۔۔ سب شاید یہی سمجھ رہے تھے۔۔۔۔ کہ میں

اپنی محبوبہ اور ہونے والی بیوی کی اچانک بیماری سے متاثر ہوا ہوں۔

کون جانتا تھا کہ میں کیوں اتنا پریشان ہو گیا ہوں۔ اور میرے ضمیر نے تیز دھار کی تلوار بن کر کہاں کہاں کاٹ ڈال دی ہے۔ ---- میرے زخموں سے کس طرح خون ابل رہا ہے ---- اور اذیت کے کن لمحوں سے دو چار ہوں۔

میں پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا۔ کہ پانی لانے کے لیے بھاگتے ہوئے گیا۔ فیروز بھاگتا آیا۔

"سر، سر----"

سب اس کی طرف دیکھنے لگے ---- اس کی رنگت اڑی تھی۔ اور بات منہ سے نہ نکل رہی تھی۔

"سر ---- جلدی ہوسپٹل پہنچئے ---- مس ڈوگر کو تیسرا اٹیک ہوا ہے ---- ان کی حالت ---- بہت خراب ہے ----"

"یا خدا ----" میں دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ اٹھا ----

اسد اور دوسرے لوگ فیروز کے گرد ہو گئے۔

"تمہیں کس نے کہا" سب نے پوچھا۔

"فون آیا ہے" وہ بولا۔

"کون تھا فون پر" اسد نے پوچھا۔

"سیفو ---- مس ڈوگر کا خاندانی ملازم ---- اف بیچاری لڑکی کوئی اپنا پاس ہی نہیں ---- نوکر ہی ہوسپٹل میں ہیں ---- وہی ---- سر پلیز آپ جلدی پہنچئے ---- سیفو آپ کی راہ تک رہا ہے ---- وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔"

"کہاں ایڈمٹ ہیں" میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب کو دیکھا۔ "یو سی ایچ" کلیم نے کہا۔ اور کمرہ نمبر بتایا۔

میں گاڑی میں بیٹھ گیا ---- سٹارٹ کرنے کو تھا۔ کہ اسد دروازے کی طرف بڑھا۔

"سر میں چلاتا ہوں گاڑی۔ آپ ڈرائیو نہ کر سکیں گے ----"

اسد نے زبردستی مجھ سے سٹیرنگ لے لیا۔ اور مجھے آہستگی سے پرے کر دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں پر سر کو گرا لیا ----

اسد گاڑی کمپاؤنڈ سے نکال کر سڑک پر لے آیا ----

گاڑی رکتے ہی میں طوفانی رفتار سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اسد کا انتظار کئے بغیر اندر دوڑا ----

میں نہیں جانتا میں نے سیڑھیاں کیسے پھلانگیں اور کیسے گھماؤ والے برآمدے میں پہنچا ----

میں پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا ---- ہر کمرے کا نمبر دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ کے کمرے کا نمبر دیکھنا نہیں پڑا ---- سیفو اور دوسرے گھریلو نوکر دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی سیفو چیخا "صاحب جی ---- کہاں تھے آپ بہت دیر کر دی ----"

میں حواس باختہ سا تھا۔ دروازہ تڑاخ سے کھولا ---- میں ایک لمحہ کو پتھرا گیا۔ میرے قدم دہلیز میں گڑ گئے۔

تین چار نرسیں اور دو تین ڈاکٹر کمرے میں سے واپس ہو رہے تھے ---- ایک نرس سفید چادر سے ساجدہ کو ڈھانپ رہی تھی۔

اور

سیفو کی بیوی منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر چیخیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے دیکھا ----

میں نے انہیں ----

گھبراہٹ میں صرف اسی قدر کہہ سکا "کیا حال ہے ساجدہ کا ---- ڈاکٹر۔"

"سوری" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا ---- اور سر جھکا کر باہر جانے لگا۔ دوسرے ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

"ڈاکٹر ----" میں نے ڈاکٹر کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔

"سوری مسٹر ----" ڈاکٹر نے کہا۔ "وہ ختم ہو چکی ہیں ----"

"نہیں ----" میں اتنے زور سے چیخا۔ کہ کمرے کے در و دیوار لرز گئے ----

میں ساجدہ کے بیڈ پر ٹوٹ پڑا۔ چادر نوچ کر پرے پھینک دی۔

ساجدہ ----" میں چیخا ---- اتنے زور سے چیخا کہ فضا کانپ گئی۔

سیفو کی بیوی زور زور سے رونے لگی۔ اور باہر کھڑے لوگ اندر آ گئے۔ اور گرد کے کمروں سے بھی لوگ آ گئے ----

ساجدہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی اذیت اور کرب کے آثار تھے ---- میرا دل پھٹنے لگا۔ میں اس پر جھک گیا۔ بیڈ کے قریب دو زانو ہوتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر دیوانوں کی طرح 'ساجدہ' 'ساجدہ' چیخنے لگا ---- مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میری متاع حیات لٹ گئی ہے۔ میری عزیز ترین ہستی مجھ سے بچھڑ گئی ہے ---- مجھے آج پتہ چلا کہ میں ساجدہ کو شدت سے چاہتا ہوں۔ ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں ---- اتنی محبت کرتا ہوں کہ وہ اظہار کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔

میں پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔
ساجدہ کو پکار رہا تھا۔
جھنجھوڑ رہا تھا۔
بلا رہا تھا۔
لیکن
وہ چپ تھی۔
میری کسی بات کا جواب نہ دے رہی تھی۔
مجھے
چپ کی مار مار رہی تھی۔۔۔۔
میں نہیں جانتا۔
کب اور کیسے ساجدہ کی میت ہوسپٹل کے کمرے سے نیچے لائی گئی۔ کب ایمبولینس میں رکھی گئی۔۔۔۔ مجھے کون پکڑ کر نیچے لایا۔۔۔۔ اور کس نے میت کے سرہانے ایمبولینس میں بٹھا دیا۔۔۔۔
میت گھر آنے تک
میرے وجود
میری ہستی
اور
میری شخصیت پر سکتے کی کیفیت طاری تھی۔۔۔۔ میں بول رہا تھا نہ چیخ رہا تھا۔۔۔۔ میرے حواس جواب دے رہے تھے۔ اور مجھے کسی نے جہاں لا کر بٹھا دیا تھا۔۔۔۔ میں بیٹھا تھا۔۔۔۔
کفن دفن کا انتظام اسد کلیم اور فیکٹری کے دوسرے لوگ کر رہے تھے۔ ارد گرد کی کوٹھیوں سے بھی لوگ آ گئے تھے۔ کچھ عورتیں بھی آئی تھیں۔۔۔۔ جو ساجدہ کی میت کے گرد بیٹھ گئی تھیں۔ دونوں فیکٹریاں بند کر دی گئی تھیں۔ سارا اسٹاف اور پوری لیبر آن پہنچی تھی۔۔۔۔ دور پار کے کچھ عزیزوں کا سیفو کو پتہ تھا اس نے ان کو اطلاع دی تھی۔۔۔۔ اور ملنے جلنے والوں کو بھی فون پر مطلع کر دیا تھا۔۔۔۔
چار بجے کے قریب جنازہ اٹھا۔۔۔۔
اور
اک دھوم سے اٹھا۔۔۔۔
جس کا کوئی نہیں تھا۔۔۔۔
اس کے لیے سینکڑوں آنکھیں پرنم تھیں۔۔۔

بے بس۔ اور تنہا لڑکی لوگوں کے جم غفیر میں اپنی آخری آرام گاہ کی طرف جا رہی تھی
۔۔۔۔۔
دفنانے سے پہلے میں نے کفن سرکا کر اس کا چہرہ آخری بار دیکھا۔
اف
اس کے چہرے پر اتنی محرومی اور اتنی بے بسی تھی۔
کہ
میرا دل پھٹنے لگا۔۔۔۔۔
یوں لگ رہا تھا۔۔۔۔ جیسے وہ کرب و اذیت کی منزلوں سے گزرتے ہوئے کہہ رہی ہے' راج تمہاری چاہت اور پیار ہی میری زندگی تھی' یہ نہ رہے تو میں بھی نہ رہی۔۔۔۔"
شام اترنے سے پہلے ساجدہ سارے بندھن سارے ناطے توڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئی۔۔۔۔
مجھے جدائی کا دائمی دکھ دے کر۔
بچھڑنے کا خونچکاں زخم لگا کر۔
قبرستان سے واپس آ کر میں ساجدہ کے کمرے میں چلا گیا۔
اس کا کمرہ بے ترتیب سا ہو رہا تھا۔ ویرانی اور سناٹا چھایا تھا۔۔۔۔ پلنگ کی چادر بے ترتیب تھی۔ پرسوں جب اسے ہوسپٹل لے جایا گیا۔۔۔۔ تو شاید اس کمرے میں کوئی نہ آیا تھا۔۔۔۔
میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔۔۔۔ ضمیر نوک دھار کی تلوار بنا ہوا تھا۔ برابر مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ اور میں جھوٹے مجرم کی طرح اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے دل ہی دل میں اس بات کی نفی کر رہا تھا۔ کہ ساجدہ کمزور تھی۔ اسے ایک بار پہلے بھی اپنے باپ کے مرنے پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔۔۔۔ اس کی موت طبعی ہے۔۔۔۔ اس نے میری باتیں نہیں سنیں۔۔۔۔ میری وجہ سے اس کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔۔۔۔ میں اپنے آپ سے اپنے ضمیر سے اور اپنے اندر سے اٹھنے والی لاتعداد آوازوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔
میں بے دم ہو کر ساجدہ کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اور اس کا تکیہ اٹھا کر گود میں رکھنے لگا۔
لیکن
میں نے تکیہ جلدی سے پھینک کر وہ کاغذ اٹھا لیا۔ جو ساجدہ کے تکیے کے نیچے پڑا تھا۔۔۔۔
بڑی بے صبری بے تابی سے میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ کھولا۔۔۔۔
اور
اس سے کہیں زیادہ بے صبری اور بے تابی سے پڑھنے لگا۔۔۔۔ کہ کاغذ پر میرا ہی نام لکھا تھا

میں نے پڑھا-----

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے کمرے کی چھت میرے سر پر آن گری ہے۔ اور بیڈ جس پر میں بیٹھا ہوں لٹو کی طرح گھومتے ہوئے زمین کے اندر دھنستا جا رہا ہے-----

اف میرے خدا-----

میں بلبلا اٹھا-----

کاغذ پر لکھا تھا۔

"راج۔ ترقی کے جس مقام پر تم پہنچنا چاہتے تھے' پہنچ گئے۔ اب زینہ رہے یا نہ رہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا----- کہ میں نے تمہارے اس مقام کو قانونی شکل دے دی ہے۔ اب میری جائیداد' کاروبار' اور بنکوں کے اثاثے کے تم بلا شرکت غیرے مالک ہو۔ میرے وکیل ارشد صاحب' تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔"

ساجدہ

میں کانپنے لگا----- رقعہ میرے ہاتھوں سے گر گیا-----

اور

میں ایکا ایکی زور سے چیخا۔

"نہیں----- نہیں----- نہیں----- ساجدہ نہیں-----

چیخیں میرے اندر سے ابل رہی تھیں۔ میں نے اپنی انگلیاں دانتوں تلے دبا لیں----- میں نے دکھ کی ساری آگ اندر دبالی----- اور ساجدہ کے کمرے سے نکل آیا-----

کئی دن میں گم صم رہا----- میرے اندر ضمیر کی عدالت لگی رہی----- اور میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے مجرم کی طرح فیصلہ سننے کے انتظار میں پھڑبتا رہا۔

لیکن

یہ کیفیت زیادہ دن نہ رہی----- ضمیر کا فیصلہ ایسا نہ تھا۔ جسے میں خاموشی سے برداشت کر لیتا----- میں تڑپ اٹھا----- بلبلا اٹھا----- چیخ اٹھا-----

میرے حواس منتشر ہو گئے----- اور ذہنی توازن گڑ بڑ ہو گیا----- کئی ماہ میری یہی حالت رہی-----

جب

کچھ سنبھلا-----

تو

یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے۔

میرے اندر آگ بہہ رہی ہے----- باہر آگ برس رہی ہے-----

اور

جب سے

اب تک

میں آگ کے اس جہنم زار میں جل رہا ہوں----- کوئی روزن کوئی سوراخ کوئی دروازہ کوئی کھڑکی نہیں۔ جس سے کود کر اس جہنم زار سے فرار پا لوں-----

میں جل کر راکھ کا ڈھیر بھی تو نہیں ہوتا۔ میری زندگی۔ میرا وجود اس پتھر کی طرح لگ رہا ہے۔ جو تپ جاتا ہے کبھی کبھی سرخ انگارہ بھی ہو جاتا ہے-----

لیکن

راکھ نہیں بنتا۔

کئی سال بیت چکے ہیں۔

یہ الاؤ مخصوص انداز سے جل رہا ہے----- میں جلن کی اذیت سہہ رہا ہوں۔ کبھی گھبرا کر تڑپنے لگتا ہوں۔ کبھی صبر و ضبط کے سانچوں میں ڈھل جانے کی کوشش کرتا ہوں----- ایسے میں میں اپنے خشک ویران اور بے رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ کا ملمع چڑھانے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ اور زندگی کے جلو میں زندہ لوگوں کی طرح چلنا چاہتا ہوں۔

لیکن

میری اس کوشش کو

اس

جہد مسلسل کو

کوئی سانحہ۔ کوئی واقعہ یا معمولی سی تحریک بھی غارت کر دیتی ہے-----

اور

میں نئے سرے سے آگ میں جلنے اور اس سے بچنے کی سر توڑ کوشش شروع کر دیتا ہوں۔

اذیت کا نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔

کرب کی محرابیں تن جاتی ہیں-----

اور

میں...

بے بس ہو جاتا ہوں -----

آج بھی

کرب و اذیت کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ میں بیڈ پر لیٹا ہوں۔ آنکھوں کو بازو سے ڈھ
رکھا ہے -----

اور

زیبی ہاتھ میں شکیل کا پرانا خط جو اسے میرے کسی کوٹ کی جیب سے ملا ہے ----- لے
بار پوچھ رہی ہے ----- میرے دل کی کال کوٹھڑی کے بند دروازوں کو توڑنے کی کوشش کر
ہے۔

وہ کبھی

انتہائی پیار سے پوچھتی ہے -----

اور

کبھی غصے سے شعلہ فشاں ہو کر۔

میں

تذبذب میں ہوں۔ انتشار کا شکار ہوں۔ کشمکش میں مبتلا ہوں۔

سوچ رہا ہوں۔ کیا زیبی کو سب کچھ بتا دوں؟ اس پر اپنی ساری ذلالت ساری خباثت عی
کر دوں ----- اسے بتا دوں ----- کہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر :
نے اسے قتل کر دیا ہے ----- اسے دھوکہ اور فریب دیا ہے -----

شاید زیبی محبت اور شفقت سے میرے عریاں اور گنہگار وجود کو سمیٹ لے ----- اور آگ
کو اپنے پیار کے سہاروں سے ٹھنڈا کر دے۔

مجھے بچا لے۔

مجھے سمیٹ لے۔

مجھے پناہ دے دے۔

لیکن

ڈرتا ہوں ----- ایسا نہ ہوا -----

تو

اگر زیبی میرا حقیقی چہرہ دیکھ کر مجھ سے متنفر ہو گئی۔ تو ----- کیا ہو گا۔ پچھتاوؤں کا اک اور
جہنم کھل جائے گا۔

میں تو اک جہنم ہی سے چھٹکارا نہیں پا رہا ----- دوسرے کا منہ بھی کھل گیا۔ تو کیا کروں گا۔

میں یہی سوچ رہا ہوں۔

بیڈ میں پڑا۔ آنکھوا

کہ

زیبی کو۔

بتا دوں۔

یا نہ بتاؤں